تفسیر نمونہ
(جلد دہم)

یہ کتاب برقی شکل میں نشرہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

تفسیر نمونہ جلد دہم

تفسیر نمونہ، آیہ اللہ العظمی مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی ۱۵ سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہوچکا ہے۔

تعداد جلد: ۱۵ جلد

زبان: اردو

مترجم: مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۱۷ ھجری

سورہ یوسف

آیات ۵۴،۵۵،۵۶،۵۷

۵۴۔ ﴿وَقَالَ الْمَلِکُ ائْتُونِی بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِی فَلَمَّا کَلَّمَهُ قَالَ إِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِینٌ أَمِینٌ﴾۔

۵۵۔ ﴿قَالَ اجْعَلْنِی عَلَی خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّی حَفِیظٌ عَلِیمٌ﴾۔

۵۶۔ ﴿وَکَذَلِکَ مَکَّنَّا لِیُوسُفَ فِی الْأَرْضِ یَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَاءُ نُصِیبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلاَنُضِیعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِینَ﴾۔

۵۷۔ ﴿وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَیْرٌ لِلَّذِینَ آمَنُوا وَکَانُوا یَتَّقُونَ﴾۔

ترجمہ

۵۴۔(مصر کے) بادشاہ نے کہا: اس (یوسف) کو میرے پاس لے آوٴ تاکہ میں اسے اپنے ساتھ مخصوص کر لوں۔ جب(یوسف اس کے پاس آئے اور)اس سے گفتگو کی (تو بادشاہ کو ان کی عقل و فہم کا اندازہ ہوا) تو اس نے کہا: آج تو ہمارے ہاں اعلیٰ قدر و منزلت رکھتا ہے تو قابل اعتماد ہے۔

۵۵۔ (یوسف نے)کہا: مجھے (مصر کی) زمین کے خزانوں کا سرپرست بنادے کیونکہ میں حفاظت کرنے والا اور آگاہ ہوں۔

۵۶۔ اس طرح ہم یوسف کو (مصر کی) زمین میں قدرت دی کہ اب جہاں چاہتا اس میں رہتا (اور اس میں تصرف کرتا) ہم جسے چاہتے ہیں (اور لائق سمجھے ہیں) اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور ہم نیک لوگوں کا اجر ضائع کرتے۔

۵۷۔ اور جو ایمان لائے ہیں اور پرہیزگار ہیں آخرت کا اجر ان کے لئے بہتر ہے۔

یوسف علیہ السلام مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی کی عجیب زندگی کی تفصیل میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ آخر ان کی پاکدامنی سب پر ثابت ہو گئی یہاں تک کہ ان کے دشمنوں نے ان کی پاکیزگی کی گواہی دی اور یہ ثابت ہو گیا کہ جس گناہ کی وجہ سے وہ زندان میں ڈالے گئے تھے وہ پاکدامنی تقویٰ اور پرہیزگاری کے سوا کچھ نہ تھا۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ بے گناہ قیدی علم ، آگہی، دانشمندی ، انتظامی صلاحیت اور فہم و فراست کی بہت اعلیٰ سطح کا مرکز ہے کیونکہ اس نے ”ملک“ (بادشاہ مصر) کے خوان کی تعبیر بتاتے ہوئے آئندہ کی پیچیدہ اقتصادی مشکلات بیان کرتے ہوئے ساتھ ہی ان سے نجات کے راستے کی نشاندہی بھی کردی تھی ۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے؛ ”بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنا مشیر اور نمائندہ خاص بناؤ“ اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لئے اس کے علم و دانش اور انتظامی صلاحیت سے مدد لوں ﴿وَقَالَ الْمَلِکُ ائْتُونِی بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِی﴾ ۔

پادشاہ کا پر جوش پیام لیکر اس کا خاص نمائندہ قید خانے میں یوسف کے پاس پہنچا۔ اس نے بادشاہ کی طرف سلام و دعا پہنچایا اور بتایا کہ اسے آپ سے شدید لگاؤ ہوگیا ہے ۔ اس نے مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق سے متعلق آپ کی درخواست کی عملی جامہ پہنایا اور سب نے کھل کر آپ کی پاکدامنی اور بے گناہی کی گواہی دی ہے ۔ لہٰذا اب تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں رہی اٹھیئے تاکہ ہم اس کے پاس چلیں ۔

حضرت یوسف علیہ السلام پادشاہ کے پاس تشریف لائے ۔ ان کی آپس میں بات چیت ہوئی ۔ بادشاہ نے ان کی گفتگو سنی اور آپ کی پر مغز اور نہایت اعلیٰ باتیں سنیں ۔ اس نے دیکھا کہ آپ کی باتیں انتہائی علم و دانش اور دانائی سے معمور ہیں تو پہلے سے بھی زیادہ آپ کا شیفتہ ہوگیا۔

کہنے لگا: آپ آج سے ہمارے ہاں اعلیٰ قدرت و منزل اور وسیع اختیارات کے حامل ہیں اور ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد رہیں گے ﴿فَلَمَّا کَلَّمَهُ قَالَ إِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِینٌ أَمِینٌ﴾۔

آج سے اس ملک کے اہم کام آپ کے سپرد ہیں اور آپ کو امور کی اصلاح کے لئے کمر ہمت باندھ لینا چاہیئے کیونکہ میرے خواب کی جو تعبیر آپ نے بیان کی ہے اس کے مطابق اس ملک کو شدید اقتصادی بحران درپیش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بحران پر صرف آپ ہی قابو پا سکتے ہیں ۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے تجویز پیش کہ مجھے اس علاقہ ک ے خزانوں کی ذمہ داری سونپ دی جائے کیونکہ میں اچھا محافظ ہوں اور اس کام کے اسرار سے بھی واقف ہوں ﴿قَالَ اجْعَلْنِی عَلَی خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّی حَفِیظٌ عَلِیمٌ﴾ ۔

حضرت یوسف علیہ السلام اچھی طرح جانتے تھے کہ ظلم سے بھرے اس معاشرے کی پریشانیوں کی ایک اہم بنیاد اس کے اقتصادی مسائل میں ہیں ۔ لہٰذا انھوں نے سوچا کہ جب کہ انہیں مجبوراً آپ کی طرف آنا پڑا تو کیا ہی اچھا ہے کہ مصر کی

اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور محروم و مستضعف عوام کی مدد کے لئے آگے بڑھیں اور جتنا ہو سکے طبقاتی تفاقت اور اونچ نیچ کو کم کریں، مظلوموں کا حق ظالموں سے لیں اور اس وسیع ملک کی بد حالی کو دور کریں ۔ آپ کی نظر میں تھا کہ خاص طور پر زرعی مسائل اس ملک میں زیادہ اہم ہیں اس بات پر بھی توجہ رکھنا ہو گی چندسال فراوانی کے ہوں گے اور پھر خشکی کے سال درپش ہوں گے لہٰذا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ غلّے پیدا کرنے اور پھر انہیں احتیاط سے محفوظ رکھنے اور نہایت کم خرچ کرنے پر آمادہ کرنا ہو گا تاکہ قحط کے سالوں کے لئے غلہ ذخیرہ کیا جا سکے ۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے آپ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ آپ مصر کے خزانوں کو اپنی سرپرستی میں لینے کی تجویز پیش کریں ۔

بعض نے لکھا ہے کہ اس سال بادشاہ سخت مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور کسی طرح ان سے نجات چاہتا تھا لہٰذا اس نے تمام امور کی باگ ڈور حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دی اور خود کنارہ کشی اختیار کرلی ۔

بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ اس نے عزیز مصر کی جگہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے ظاہری مفہوم کے مطابق وہ صرف مصر کے وزیر خزانہ بنے ہوں لیکن اسی سورہ کی آیت ۱۰۰ ۔ اور۔ ۱۰۱ / کہ جن کی تفسیر انشاء اللہ آئے گی اس امر کی دلیل ہیں کہ آخر کار آپ بادشاہ ہو گئے اور تمام امور مملکت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آگئی ۔ اگرچہ آیت ۸۸/ میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان سے کہا: " ی﴿ا ایھا العزیز﴾" ۔

یہ امر کی دلیل ہے کہ آپ نے عزیز مصر کا منصب سنبھالا مگر اس میں کوئی مانع نہیں کہ آپ نے یہ مناسب تدریجاً حاصل کئے ہوں ۔ پہلے وزیر خزانہ ہوئے ہوں پھر وزیر اعظم اور پھر بادشاہ ۔

بہر حال اس مقام پر خدا کہتا ہے: اور اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام سرزمین مصر پر قدرت عطا کی کہ وہ جیسے چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا تھا﴿وَکَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوسُفَ فِی الْأَرْضِ یَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَاءُ﴾۔

جی ہاں! ہم اپنی رحمت اور مادی و روحانی نعمتیں جسے چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں عطا کرتے ہیں (نُصِیبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ) ۔

اور ہم نیکو کاروں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کریں گے "۔ اگرچہ اس میں تاخیر ہو جائے تاہم آخر کار جو کچھ ان کے لائق ہوا انہیں دیں گے کیونکہ ہم کسی نیک کو فراموش نہیں کرتے﴿وَلاَنُضِیعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِینَ﴾۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم صرف دنیاوی اجر ہی نہیں دیں بلکہ "جو اجر انہیں آخرت میں ملے گا وہ اہل ایمان اور صاحبانِ تقویٰ کے لئے زیادہ اچھا ہے"﴿وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے طاغوت وقت کی دعوت کیونکر قبول کی؟

زیر بحث آیات کی طرف توجہ ہوتے ہیں پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی طاغوت زمانہ سے وزارتِ خزانہ یا وزارت عظمیٰ کا منصب قبول کرنے اور اس کے ساتھ ملکر کام کرنے پر کیسے تیار ہو گئے؟

اس سوال کا جواب خود مندرجہ بالا آیات ہی میں پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے یہ منصب ایک 'حفیظ و علیم" شخصیت کی حیثیت سے قبول کیا تاکہ عوام کے مفاد میں بیت المال کی حفاظت کریں اور اسے انہی کے مفاد میں خرچ کریں خصوصاً مستضعف اور محروم کے حقوق کو جو اکثر معاشروں میں پامال ہوتے ہیں ان تک پہنچائیں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے وہ علم و تعبیر کے ذریعے جانتے تھے کہ مصری قوم کو ایک شدید اقتصادی بحران پیش آنے والا ہے لہٰذا اس کے مقابلے کے لئے دقیق پروگرام اور قریب سے اس کی نگرانی کے بغیر ممکن تھا کہ بہت سے لوگ تباہ و برباد ہو جاتے، لہٰذا اس مصیبت سے عوال کی نجات اور بے گناہ انسانوں کی جان کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو موقع مل رہا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے اور تمام لوگوں خصوصاً مجروم عوام کے لئے اس سے استفادہ کرتے کیونکہ اقتصادی بحران اور قحط سالی میں سب سے زیادہ خطرہ انہیں لوگوں کی جان کو تھا اور بحرانوں کی پہلی قربانی یہی لوگ ہوتے ہیں۔

فقہ میں ظالم کی حکومت قبول کرنے کی بحث میں بھی یہ بات تفصیل سے آئی ہے کہ ظالم کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا ہمیشہ حرام نہیں ہوتا بلکہ کبھی مستحب بھی ہوتا ہے اور ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب اس منصب کو قبول کرنے کے فوائد اور دینی تقاضے اس کی حکومت کی تقویت پہنچنے کے نقصانات سے زیادہ ہوں۔

متعدد روایات میں آیا ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام بھی اپنے قریبی ساتھیوں کو اس قسم کی اجازت دے دیتے تھے مثلاً علی بن یقطین امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے فرعون ہارون رشید کی وزارت امام علیہ السلام کی اجازت سے قبول کی۔

بہرصورت اس قسم کے مناصب قبول کرنے یا رد کرنے کا انحصار ' قانونِ اہم و فہم " پر ہے ۔ اس کے نفع و نقصان کو دینی اور اجتماعی لحاظ سے پرکھا جانا چاہیئے ۔ بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ایسا عہدہ قبول کرنا ظالم کی معزولی پر منتج ہوتا ہے ۔ جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی اتفاق ہوا اور کبھی ایسا عمل بعد ازآں انقلاب و قیام کا سرچشمہ بن جاتا ہے کیونکہ منصب قبول کرنے والا شخص حکومت کے اندر سے انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے ۔ شاید مومن آلِ فرعون اسی قسم کی ایک مثال تھے ۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے افراد مظلوموں اور محروموں کے لئے پناہ گاہ بن جاتے ہیں اور ان کے لئے حکومتی ظلم میں کمی کا باعث بن جاتے ہیں ان مقاصد میں سے کوئی ایک بھی حاصل ہورہا ہو تو ایسے عہدے قبول کرنے کا جواز بن جاتا ہے ۔

ایک مشہور روایت میں امام صادق علیہ السلام ایسے ہی افرد کے بارے میں فرماتے ہیں :

كفارة عمل السلطان قضاء حوائج الاخوان

ظالم حکومت کا ساتھ دینے کا کفارہ یہ ہے کہ بھائیوں کی ضروریات پوری کی جائیں ۔[1]

لیکن یہ مسئلہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن میں حلال و حرام کی سرحد ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوتی ہے ۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ انسان تھوڑی سی سہل انگاری کی وجہ سے غلط طور پر ظالم کا ساتھ دینے لگتا ہے اور کسی بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے جب کہ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں عبادت اور خدمت خلق میں مشغول ہوں ۔

بعض اوقات سوء استفادہ کرنے والے افراد حضرت یوسف علیہ السلام یا علی بن یقطین کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں اور اسے بہانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان کے کام کو حضرت یوسف علیہ السلام اور علی بن یقطین سے کوئی نسبت نہیں ہوتی ۔[2]

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے ، وہ یہ کہ مصر کا ظالم بادشاہ اس کے لئے کیسے تیار ہو گیا جب کہ وہ جانتا تھا کہ حضرت یوسف ظلم و ستم استعماری ہتھکنڈوں اور استثمار کے لئے ہر گز تیار نہ ہوں گے بلکہ اس کے برعکس اس کے مظالم میں رکاوٹ بنیں گے ۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں رہتا ، وہ یہ کہ بعض اوقات معاشرتی اور اقتصادی بحران اس طرح کے ہوتے ہیں کہ خودسروں کی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں اسی طرح سے کہ انہیں

اپنی ہر چیز خطرے میں نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع پر ہلاکت سے بچنے کے لئے وہ یہاں ک تیار ہو جاتے ہیں کہ ایک عادلانہ عوامی حکومت کو قبول کرلیں تاکہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

۲۔ اقتصادی مسائل اور انتظامی صلاحیت کی اہمیت:

بعض مکاتب بالکل یک جہتی ہیں اور ہر چیز کو اقتصادی پہلو میں منحصر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انسان اور اس کے وجود کی مختلف جہات کو نہیں پہنچانا۔ ہم اگرچہ ان مکاتب سے اتفاق نہیں کرتے تاہم معاشروں کی زندگی میں خصوصیت سے اتصادی مسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مندرجہ بالا آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کیونکہ تمام مناصب میں سے حضرت یوسف علیہ السلام نے وزارت خزانہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے ٹھیک کرلیا تو مصر کی زیادہ تر پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور عدالتِ اقتصادی کے ذریعے وہ دوسری مشکلات پر بھی قابو پا سکیں گے۔

اسلامی روایات میں بھی اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے جس میں لوگوں کی روحانی اور رمادی زندگی (قوام الدین و الدنیا) کی حقیقی دو بنیادوں میں سے ایک اقتصادی مسائل بیان کی گئی جب کہ دوسری آگہی اور علم و دانش کو شمار کیا گیا ہے۔ گرچہ مسلمانوں نے ابھی تک اس اہمیت کی طرف توجہ نہیں کی کہ جو اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اس حصے کو دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان زندگی کے اس حصے میں اپنے دشمنوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور پس ماندہ ہیں۔

لیکن مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں روز بروز بیداری اور آگاہی میں اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں مسلمان اقتصادی میدان میں کاوشوں کو ایک بہت بڑی اسلامی عبادت سمجھتے ہوئے انجام دینے لگیں گے اور اس لحاظ سے اسلام کے بے رحم دشمنوں کی نسبت جو پس ماندگی ہے اسے دور کریں گے۔

ضمناً حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جو کہا ہے کہ: "﴿انی حفیظ علیم﴾"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے کسی حساس منصب کو قبول کرنے کے لئے صرف امانت داری ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت بھی ضروری ہے اور اس کے علاوہ علم و آگاہی اور مہارت بھی ضروری ہے کیونکہ آپ نے "حفیظ" کے ساتھ ساتھ "علیم" بھی کہا ہے۔

ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے خبری، عدم مہارت اور انتظامی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ خیانت سے پیدا ہونے والے خطرات سے کم نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اس سے بدتر اور زیادہ ہوتے ہیں۔

ان واضح اسلامی تعلیمات کے باوجود معلوم نہیں بعض مسلمان انتظامی صلاحیت اور علم و آگہی کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور عہدے سپرد کرنے کے لئے وہ صرف امانت و دیانت کو شرائط سمجھتے ہیں حالانکہ پیغمبر اسلام اور حضرت علی علیہ السلام کی دور حکومت میں ان کی سیرت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بزرگوار آگاہی اور انتظامی صلاحیت کو امانت و دیانت کی طرح اہمیت دیتے تھے۔

۳۔ مصارف کی نگرانی:

اقتصادی مسائل میں صرف زیادہ سے زیادہ اجناس پیدا کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بعض اوقات مصارت اور مخارج پر کنٹرول کرنا اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دورِ حکومت میں فراوانی نعمت کے سات سالوں میں مصارف پر سختی سے کنٹرول کیا تاکہ اجناس کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ سختی کے سالوں کے لئے بچا کر رکھ سکیں۔

در حقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ زیادہ پیداوار اس وقت مفید ہوتی ہے جب اسے زیادہ صحیح طور پر کنٹرول کر کے استعمال کیا جا سکے اور مصارف پر کنٹرول اس وقت زیادہ مفید ہے جب اس کے ساتھ پیداوار بھی زیادہ سے زیادہ ہو۔

مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی اقتصادی سیاست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ترقی پذیر اقتصادی نظام صرف زمانہ حال پر نظر نہیں رکھتا بلکہ آئندہ پر بھی نظر رکھتا ہے بلکہ آئندہ نسلوں پر بھی نظر ہوتی ہے اور یہ انتہائی خود غرضی ہے کہ ہم صرف اپنے آگے منافع کی فکر میں رہیں مثلاً زمین میں موجود تمام ذخائر کو لوٹ لیں اور آئندہ آنے والوں کی کوئی فکر نہ کریں اور یہ نہ سوچین کہ وہ کن حالات میں زندگی بسر کریں گے کیا ہمارے بھائی صرف وہی ہیں جو آج ہمارے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور بعد میں آنے والے ہمارے کچھ نہیں لگتے؟

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض اوقات روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے لوگوں میں طبقاتی فاوت اور رلوٹ کسوٹ کو ختم کرنے کے لئے قحط کے سالوں سے استفادہ کیا۔ آپ نے زیادہ پیداوار کر کے عرصے میں لوگوں سے غذائی مواد خرید لیا اور اس کے لئے تیار کئے گئے بڑے بڑے گوداموں میں اسے ذخیرہ کیا۔ جب یہ سال گذر

گئے اور قحط کے سال شروع ہوئے تو پہلے سال اجناس کو درہم و دینار کے بدلے بیچا۔ اس طرح کرنسی کا ایک بڑا حصہ جمع کرلیا۔ دوسرے سال اسباب زینت اور جواہرات کے بدلے اجناس کو بیچا۔

البتہ جن کے پاس یہ چیزیں نہ تھیں انہیں مستثنیٰ رکھا۔ تیسرے برس چوپایوں کے بدلے، چوتھے برس غلاموں اور کنیزوں کے عوض، پانچویں برس عمارات کے بدلے، چھٹے برس زرعی زمینوں اور پانی کے عوض اور ساتویں خود مصر کے لوگوں کے بدلے اجناس دیں۔ پھر یہ سب چیزیں انہیں (عادلانہ طور پر) واپس کردیں اور کہا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بلاؤ مصیبت اور بے سروسامانی سے نجات دلواں۔ (۳)

۴۔ اپنی تعریف یا اپنا تعارف:

اس میں اس میں شک نہیں کہ اپنی تعریف کرنا ایک ناپسندیدہ کام ہے لیکن اس کے باوجود یہ کلی قانون نہیں بعض اوقات حالات کا تقاضا ہوتا ہے اورضروری ہوتا ہے کہ انسان معاشرے کو اپنا تعارف کروائے تاکہ لوگ اسے پہچانیں اور اس کی مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور وہ ایک پوشیدہ اور متروک خزانے کی طرح نہ رہ جائے۔

مندرجہ بالاآیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی وزارتِ خزانہ کئے منصب کے لئے آپ کو تجویز کرتے ہوئے "حفیظ علیم" کے الفاظ سے اپنی تعریف کی کیونکہ ضروری تھا کہ بادشاہِ مصر اور دوسرے لوگ جان لیں کہ آپ ایسی صفات کے حامل ہیں جو اسے شعبے کی سرپرستی کے لئے بہت ہی ضروری ہیں۔

اسی لئے تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا جائز ہے کہ انسان آپ اپنی تعریف کرے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا: نعم، اذا اضطر الیه اما سمعت قول یوسف اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وقول العبد الصالح و انا لکم ناصح امین۔

جی ہاں! جب اس کے سوا چارہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیا تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول نہیں سنا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کردو کیونکہ میں امین او رآگاہ ہوں۔ اسی طرح خدا کے عبد صالح ہود علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہارے لئے خیراخواہ اور امین ہوں۔ (۴)

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خطبہ شقشقیہ اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں حضرت علی علیہ السلام نے جو اپنی تعریف کی ہے اور اپنے آپ کو محورِ خلافت کا قب قرار دیا ہے کہ جس کی اوج فکر اور مقامِ والا تک فکر انسانی کا پرندہ پر نہیں

مارسکتا اور علوم کی آبشار ان کے کوہسار وجود سے گرتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر تعریفیں سب اس لئے ہیں کہ نا آگاہ اور بے خبر لوگ آپ کے مقام کو سمجھیں اور آپ کے گنجینہ وجود سے معاشرے کی بہبود کے لئے استفادہ کریں۔

۵۔ روحانی اجر بہتر ہے:

اگر چہ بہت سے نیک لوگوں کو اس جہان میں مادی اجر مل جاتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی پاکدامنی، صبر، پارسائی اور تقویٰ کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیا اور اگر وہ پاکدامن نہ ہوتے تو ہرگز اس مقام تک نہ پہنچتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگوں کو اس قسم کی توقع رکھنا چاہئیے اور اگر انہیں مادی اجر نہ ملے تو وہ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ ان پر ظلم ہوا ہے کیونکہ اصلی اجر تو وہ ہے جو آئندہ زندگی میں انسان کے انتظار میں ہے۔

شاید اسی اشتباہ رفع کرنے اور اس توہم کو دور کرنے کے لئے قرآن زیر بحث آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دنیا وی اجر کا ذکر کرکے بعد مزید فرماتا ہے:﴿ولاجر الاٰخرة خير للذين اٰمنوا وكانوا يتقون﴾

اہل ایمان اور صاحبان تقویٰ کے لئے اجر آخرت برتر و بہتر ہے۔

۶۔قیدیوں کے حقوق کی حمایت:

قید خانوں میں ہمیشہ نیک لوگ ہی نہیں رہے۔ ان میں کبھی بے گناہ رہے ہیں اور کبھی مجرم لیکن ہر صورت میں اصول انسانی کا تقاضا ہے کہ انسانی حقوق کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہئیے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کی دنیا یہ سمجھے کہ قیدیوں کے حقوق کی آواز اسی دور میں بلند ہوئی ہے لیکن اسلام کی پر افتخار تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اکرم نے اپنی حکومت کی ابتداہی میں قیدیوں کے بارے میں نصیحتیں فرمائیں نیز حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ظالم قاتل عبد الرحمن بن ملجم مرادی کے بارے میں جو وصیت فرمائی وہ تو ہم سب نے سنی ہے کہ آپ علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے یہاں تک کہ آپ علیہ السلام نے اپنے لئے آنے والا دودھ اس کے لئے بھیجا اور اسے قتل کرنے کے بارے میں فرمایا: اسے ایک سے زیادہ ضرب نہ لگائی جائے کیونکہ اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بھی جب قید خانہ میں تھے تو آپ قیدیوں کے لئے مہربان رفیق، دلسوز ساتھی اور خیر خواہ مشیر تھے اور جب آپ قید خانہ سے جانے لگے تو سب سے پہلے آپ نے دنیا کی توجہ قیدیوں کے حالت کی طرف مبذول کرائی اور ان کے حقوق کی حمایت کی اور ان سے اظہار ہمدردی کیا۔ آپ نے حکم کہ قید خانہ کے دروازے پر عبارت لکھیں:

هذا قبور الاحياء، و بيت الاحزانو تجربة الاصدقاء و شماتة الاعداء

یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے، دوستوں کی آزمائش گاہ ہے اور دشمنوں کی سرزنش کی جگہ ہے ۔ ۵

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دعا کرتے ہوئے قیدیوں سے اپنے لگاؤ کا ظہار کیا:

اللھم اعطف علیھم بقلوب الاخیار ، ولا تعم علیھم الاخبار ۔

بارالہا! اپنے نیک بندوں کے دل ان کی طرف متوجہ کردے اور ان سے خبروں کو پوشیدہ نہ رکھ ۔ ٦

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فذٰلک یکون اصحاب السجن اعرف الناس بالاخبار فی کل بلدۃ

یہی وجہ ہے کہ ہر شہر میں قیدی اس شہر کی خبروں کے بارے میں دوسروں سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں ۔

اس بات کو خود ہم نے قید کے دوران آزمایا ہے ۔ استثنائی مواقع کے علاوہ قیدیوں تک ایسی ایسی خبریں عجیب مخفی طریقوں سے پہنچ جاتی تھیں کہ جن سے قید خانے کے مامور آگاہ نہیں ہوتے تھے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قید خانے میں آنے والے نئے قیدیوں کو قید خانے میں ایسی خبریں سننے کو ملتیں جن سے وہ باہر آگاہ نہ ہوتے تھے ۔

اب اگر ہم اس کی مثالوں میں پڑ گئے تو مقصد سے دور ہو جائیں گے ۔

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۲ ص ۱۳۹ (سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۵۲ پر اسی قسم کا مضمون امام کاظم علیہ السلام سے علی بن یقطین کے بارے میں منقول ہے) ۔

یہ روایت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

۲۔ کئی ایک روایات جو امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہیں، میں ہے کہ کچھ افراد جو اسلامی معیاروں سے ناآشنا تھے بعض اوقات آپ علیہ السلام پر اعتراض کرتے کہ آپ علیہ السلام نے اس زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے اعتنائی کے باوجود مامون کی ولی عہدی کو قبول کرلیا ہے ۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: کیا پیغمبر افضل ہے یا وصی پیغمبر؟ انہوں نے کہا نہیں پیغمبر ہی افضل ہے ۔ فرمایا: کون افضل ہے مسلمان یا مشرک؟ انہوں نے عرض کیا: مسلمان، فرمایا عزیز مصر مشرک تھا اور یوسف پیغمبر تھے اور مومن (ظاہراً) مسلمان ہے اور میں پیغمبر کا وصی ہوں اور یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے چاہا کہ انہیں مصر کے خزانوں پر مامون کریں اور کہا کہ میں حفیظ و علیم ہوں اور جب کہ میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور تھا ۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۱۴۶) ۔

۳۔ اس حدیث کو اختصار سے ذکر کیا گیا ہے اور صرف مفہوم پیش کیا گیا ہے ۔ یہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے ۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۴۴ ۔ کی طرف رجوع فرمائیں ۔

۴ تفسیر الثقلین جلد ۲ ص ۴۳۳ ۔

۵ ۔ نور الثقلین، جلد ۲ ص ۴۳۲ ۔

۶ ۔ نور الثقلین، جلد ۲ ص ۴۳۲ ۔

آیات ۵۸،۵۹،۶۰،۶۱،۶۲

۵۸۔ ﴿وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ﴾۔

۵۹۔ ﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِى بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ أَلاَتَرَوْنَ أَنِّى أُوفِى الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ﴾۔

۶۰۔ ﴿فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِى بِهِ فَلاَكَيْلَ لَكُمْ عِندِى وَلاَتَقْرَبُونِى﴾۔

۶۱۔ ﴿قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ﴾۔

۶۲۔ ﴿وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِى رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾۔

ترجمہ

۵۸۔ اور یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اسے نہ پہچان پائے۔

۵۹۔ جب (یوسف) ان کے بار تیار کر چکا تو کہا (آئندہ جب آؤ تو) تمہارا جو باپ کی طرف سے بھائی ہے اسے میرے پاس لانا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پیمانے کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں۔

۶۰۔ اور اگر تم اسے میرے ہاں نہ لاؤ تو پھر میرے پاس تمہارے نہ کوئی کیل (اور غلے کا پیمانہ) ہوگا اور نہ ہی (تم ہرگز) میرے پاس آنا۔

۶۱۔ انہوں نے کہا ہم اس کے باپ سے بات کریں گے (اور کوشش کریں گے کہ وہ مان جائے) اور ہم یہ کام کریں گے۔

۶۲۔ پھر اس نے اپنے کارندوں سے کہا: جو کچھ انہوں نے قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان میں رکھ دو شاید اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ کر وہ اسے پہچانیں اور شاید پلٹ آئیں۔

یوسف علیہ السلام کی بھائیوں کو نئی تجویز

آخر کار جیسا کہ پیش گوئی ہوئی تھی سات سات پے در پے بارش ہونے کے سبب اور دریائے نیل کے پانی میں اضافے کے باعث مصر کی زرعی پیداوار خوب تسلی بخش ہو گئی۔ مصر کا خزانہ اور اقتصادی امور حضرت یوسف علیہ السلام کے زیر نظر تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ غذائی اجناس کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے چھوٹے بڑے گودام بنائے جائیں۔ آپ نے عوام کو حکم دیا کہ پیداوار سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لیں اور باقی حکومت کے پاس بیچ دیں۔ اس طرح گودام غلّے سے بھر جائیں گئے۔

نعمت و برکت کی فراوانی کے یہ سات سال گزر گئے اور قحط سالی اور خشک سالی کا منحوس دور شروع ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے آسمان زمین کے لئے بخیل ہو گیا ہے۔ کھیتیاں اور نخلستان خشک ہو گئے۔ عوام کو غلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ جانتے تھے کہ حکومت نے غلے کے ذخائر جمع کر کھے ہیں لہٰذا وہ اپنی مشکلات حکومت ہی کے ذریعے دور کرتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی پوری منصوبہ بندی اور پروگرام کے تحت غلہ فروخت کرتے تھے اور عادلانہ طور پر ان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔

یہ خشک سالی صرف مصر ہی میں نہ تھی اطراف کے ملکوں کا بھی یہی حال تھا فلسطین اور کنعان مصر کے شمال مشرق میں تھے۔ وہاں کے لوگ بھی انہی مشکلات سے دوچار تھے۔ حضرت یعقوب کا خاندان بھی اسی علاقہ میں سکونت پذیر تھا۔ وہ بھی غلے کی کمی سے دوچار ہو گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان حالات میں مصمم ارادہ کیا کہ بنیامین کے علاوہ باقی بیٹیوں کو مصر کی طرف بھیجیں۔ یوسف کی جگہ اب بنیامین ہی ان کے پاس تھا۔ بہت حال وہ لوگ مصر کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ ہو لئے اور بعض مفسرین کے بقول اٹھارہ دن کی مسافت کے بعد مصر پہنچے۔

جیسا کہ تواریخ میں ہے، ضروری تھا کہ ملک سے باہر سے آنے والے افراد مصر میں داخل ہوتے وقت اپنی شناخت کروائیں تاکہ مامورین حضرت یوسف علیہ السلام کو مطلع کریں۔ جب مامورین نے فسلطین کے قافلہ کی خبر دی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ غلے کی درخواست کرنے والوں میں ان کے بھائیوں کے نام بھی ہیں۔ آپ انہیں پہچان گئے اور یہ ظاہر کئے بغیر کے وہ آپ کے بھائی ہیں، آپ نے حکم دیا کہ انہیں حاضر کیا جائے اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے اسے نہیں پہچانا ﴿وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ﴾۔

وہ یوسف علیہ السلام نہ پہچاننے میں حق بجانب تھے کیونکہ ایک طرف تو تیس یا چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا (اس دن سے لیکر جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا تھا ان کے مصر میں آنے تک) اور دوسری طرف وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا بھائی عزیز مصر ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اسے اپنے بھائی کے مشابہ بھی پاتے تو ایک اتفاق ہی سمجھتے۔ ان تمام امور سے قطع نظر حضرت یوسف علیہ السلام کے لباس کا اندازہ بھی بالکل بدل چکا تھا، انہیں

مصریوں کے نئے لباس میں پہچاننا کوئی آسان کام نہیں تھا بلکہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ ہو گزرا تھا اس کے بعد ان کی زندگی کا احتمال بھی ان کے لئے بہت بعید تھا۔

بہر حال انہوں نے اپنی ضرورت کا غلہ خریدا اور اس کی قیمت نقدی کی صورت میں اور یا موزے، جوتے یا کچھ اجناس کی صورت میں ادا کی کہ جو وہ کنعان سے مصر لائے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں نے بہت محبت کا برتاؤ کیا اور ان سے بات چیت کرنے لگے۔ بھائیوں نے کہا: ہم دس بھائی ہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں ہمارے والد خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم علیہ السلام خلیل کے پوتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے باپ کو پہچانتے ہوتے تو ہمارا بہت احترام کرتے۔ ہمارا بوڑھا باپ انبیاء الٰہی میں سے ہے لیکن ایک نہایت گہرے غم نے ان کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا:

یہ غم کس بنا پر ہے۔

انہوں نے کہا:

اس کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ عمر میں وہ ہم سے بہت چھوٹا تھا۔ ایک دن ہمارے ساتھ شکار اور تفریح کے لئے صحرا میں گیا۔ ہم اس سے غافل ہو گئے تو ایک بھیڑیا اسے چیر پھاڑ گیا۔ اس دن سے لے کر آج تک اس کے لئے گریاں اور غمگین ہے۔

بعض مفسرین نے اس طرح سے نقل کیا ہے:

حضرت یوسف علیہ السلام کی عادت تھی کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بارے سے زیادہ غلہ نہیں بیچتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی چونکہ دس تھے لہذا انہیں غلے کے دس بار دیئے گئے۔

انہوں نے کہا: ہمارا بوڑھا باپ ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے جو وطن میں رہ گیا ہے۔ باپ غم و اندوہ کی شدت کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتا اور چھوٹا بھائی خدمت کے لئے اور مانوسیت کی وجہ سے اس کے پاس رہ گیا۔ لہذا ان دونوں کا حصہ بھی ہمیں دیدیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ دو اونٹوں کے بار کا اضافہ کیا جائے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہوشمند اور مؤدب افراد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ تمہارے بھائی کو تمہارے سب سے

چھوٹے بھائی سے لگاؤ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی اور عام بچوں سے ہٹ کر ہے ۔ میری خواہش ہے کہ تمہارے آئندہ سفر میں میں اسے ضرور دیکھوں ۔ علاوہ ازیں یہاں کے لوگوں کو تمہارے بارے میں کئی بد گمانیاں ہیں کیونکہ تم ایک دوسرے ملک سے تعلق رکھتے ہو لہٰذا بد ظنی کی اس فضا کو دور کرنے کے لئے آئندہ سفر میں چھوٹے بھائی کو نشانی کے طور پر ساتھ لے آنا ۔

یہاں قرآن کہتا ہے :جب یوسف علیہ السلام نے ان کے بار تیار کئے تو ان سے کہا : تمہارا بھائی جو باپ کی طرف سے ہے اسے میرے پاس لے آؤ ﴿ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِی بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُم﴾ ۔

اس کے بعد مزید کہا : کیا تم دیکھتے ہیں ہو کہ میں پیمانہ کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں ﴿وَلاَتَرَوْنَ أَنِّی أُوفِی الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ﴾ ۔

اس تشویق اور اظہار محبت کے بعد انہیں یوں تہدید بھی کی : اگر اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں میرے پاس سے غلہ ملے گا اور نہ تم خود میرے پاس پھٹکنا ﴿فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِی بِهِ فَلاَكَيْلَ لَكُمْ عِندِی وَلاَتَقْرَبُونِی﴾ ۔

حضرت یوسف علیہ السلام چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو بنیامین کو اپنے پاس بلائیں ۔ اس کے لئے کبھی وہ لطف و محبت کا طریقہ اختیار کرتے اور کبھی تہدید کا ۔

ان تعبیرات سے ضمنی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ مصر میں غلات کی خرید و فروخت تول کر نہیں ہوتی تھی بلکہ پیمانے سے ہوتی تھی ۔

نیز یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں اور دوسرے مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے پذیرائی کرتے تھے اور ہر حوالے سے مہمان نواز تھے ۔

بھائیوں نے ان کے جواب میں کہا : ہم اس کے باپ سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ رضا مند ہو جائیں اور ہم یہ کام ضرور کریں گے ﴿قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ﴾ ۔

" انا لفاعلون " کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ انہیں یقین تھا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے باپ کو راضی کر لیں گے اور ان کی موافقت حاصل کر لیں گے ۔ اسی لئے وہ عزیز مصر ایسا کا واعدہ کر رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہئیے تھے کیونکہ جب وہ اپنے اصرار اور آہ و زاری سے یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے لے جا سکتے تھے تو بنیامین کو کیونکر ان سے جدا نہیں کر سکتے تھے ۔

اس موقع پر ان کی ہمدردی اور توجہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے حضرت یوسف ؑ نے" اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کی نظر بچا کر وہ اموال ان کے غلے میں رکھ دیں جو انہوں نے اس کے بدلے میں دیئے تھے تاکہ جب وہ واپس اپنے خاندان میں جا کر اپنا سامان کھولیں تو انہیں پہچان لیں اور دوبارہ مصر کی طرف لوٹ آئیں ﴿وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یوسف ؑ نے بھائیوں نے اپنا تعارف کیوں نہیں کروایا:

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے جو پہلا سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے بھائیوں نے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا کہ وہ جلد از آپ کو پہچان لیتے اور باپ کے پاس واپس جا کر انہیں آپ کی جدائی کے جانکاہ غم سے نکالتے؟

یہ سوال زیادہ وسیع حوالے سے بھی سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ جس وقت حضرت یوسف ؑ کے بھائی آپ کے پاس آئے اس وقت آپ کی زندان سے رہائی کو کوئی آٹھ سال گزر چکے تھے کیونکہ گزشتہ سات سال فراوان نعمتوں پر مشتمل گزر چکے تھے جن کے دوران آپ قحط سالی کے عرصے کے لئے اناج ذخیرہ کرنے میں مشغول تھے۔ آٹھویں سال قحط کا دور شروع ہوا۔ اس سال یا اس کے بعد آپ کے بھائی غلہ لینے کے لئے مصر آئے۔ کیا چاہئیے نہ تھا کہ ان آٹھ سالوں میں آپ کوئی قاصد کنعان کی طرف بھیجتے اور اپنے والد کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور انہیں شدید غم سے نجات دلاتے؟

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور اس سلسلے میں کئی جوابات پیش کئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی کیونکہ فراق یوسف ؑ دیگر پہلوؤں کے علاوہ حضرت یعقوب کے لئے ایک امتحان بھی تھا اور ضروری تھا کہ آزمائش کا یہ دور فرمان الٰہی سے ختم ہوا اور اس کے پہلے حضرت یوسف ؑ خبر دینے کے مجاز نہ تھے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف ﷤ فوراً ہی اپنے بھائیوں کو اپنا تعارر کروادیتے تو ممکن تھا کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا اور ہوسکتا تھا جہ وہ اس سے ایسے وحشت زدہ ہوتے کہ پھر لوٹ کر آپ کے پاس نہ آتے کیونکہ انہیں یہ خیال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یوسف ﷤ ان کے گزشتہ رویہ کا انتقال لیں۔

۲۔غلہ کی قیمت کیوں واپس کردی:

حضرت یوسف ﷤ نے یہ حکم کیوں دیا تھا کہ جو مال ان کے بھائیوں نے غلے کی قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان میں رکھ دیا جائے؟

اس سوال کے بھی کئی جواب دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے فخرالدین رازی نے اپنے تفسیر میں دس جوابات ذکر کئے ہیں۔ بعض تو ان میں سے غیر مناسب ہیں البتہ خود مذکورہ آیت نے اس سوال کا جواب دیا ہے:"﴿لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾"۔

یعنی حضرت یوسف ﷤ کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ وطن واپسی پر اپنا سامان دیکھیں گے تو انہیں عزیز مصر (حضرت یوسف ﷤) کی کرم نوازی کا پہلے سے زیادہ احساس ہو اور اسی بنیاد پر وہ دوبارہ آپ کے پاس آجائیں یہاں تک کہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی پورے اطمینانِ قلب سے اپنے ساتھ لے آئیں اور خود حضرت یعقوب ﷤ بھی یہ بات دیکھ کر بنیامین کو بڑے اعتماد سے مصر روانہ کردیں۔

۳۔حضرت یوسف ﷤ نے بیت المال کا مال کیوں بلا معاوضہ دے دیا؟:

ایک اور سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسف ﷤ نے اپنے بھائیوں کو بیت المال کا کچھ حصہ کیوں بلا معاضہ دے دیا۔

اس سوال کا جوانب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا یہ کہ مصر کے بیت المال میں مستضعفین کا حق تھا (اور ہمیشہ ہوتا ہے) اور مختلف ممالک میں موجود سرحدوں سے یہ حق ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت یوسف ﷤ اپنے بھائیوں کے لئے جو اس وقت مستضعف تھے اس حق سے استفادہ کیا جیسا کہ وہ دیگر مستضعفین کے لئے بھی کرتے تھے۔

دوسرا یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت ایک حساس منصب پر تھے جس کی بناء پر ذاتی طور پر بھی ان کے کچھ حقوق تھے ، ان کا کم از کم یہ حق تھا کہ وہ اپنے معاشی ضروریات کا ، اپنے ضرورت مند اہل و عیال کا اور اپنے باپ اور بھائیوں جیسے رشتہ داروں کی کم از معاشی زندگی کا خیال رکھیں اسی بناء پر آپ نے اس بخشش و عطا میں اپنے حق سے استفادہ کیا۔

آیات ٦٦،٦٥،٦٤،٦٣

۶۳۔﴿فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَى أَبِيهِمْ قَالُوا يَاأَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾۔

۶۴۔﴿قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلاَّ كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَى أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ فَاللهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾۔

۶۵۔﴿وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ قَالُوا يَاأَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ذَلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ﴾

۶۶۔﴿ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِی مَوْثِقًا مِنْ اللهِ لَتَأْتُونَنِي بِهِ إِلاَّ أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللهُ عَلَى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ﴾۔

ترجمہ

۶۳۔ جب وہ اپنے والد کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: ابا جان! ہم سے (غلے کا) پیمانہ روک دیا گیا ہے لہذا ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے گا تاکہ ہم (غلے کا) حصہ لے سکیں اور ہم اس کی حفاظت کریں گے۔

۶۴۔ اس نے کہا کہ کیا میں اس کے بارے میں تم پر بھروسہ کرلوں جیسا کہ اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تم پر بھروسہ کیا تھا اور (میں نے دیکھا کہ کیا ہوا اور بہر حال) خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔

۶۵۔ اور جس وقت انہوں نے اپنا مال و متاع کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا سرمایہ انہیں واپس کردیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: ابا جان! ہمیں اور کیا چاہئیے یہ (دیکھئے) ہمارا سرمایہ جو ہمیں واپس کردیا گیا ہے (لہذا کیا ہی اچھا ہے کہ بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے) اور ہم اپنے گھر والوں کے لئے اناج لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور زیادہ بڑا پیمانہ حاصل کریں گے، یہ تو چھوٹا پیمانہ ہے۔

۶۶۔ اس نے کہا میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک کہ مجھ سے پکا خدائی وعدہ نہ کرو کہ اسے حتماً میرے پاس لے آؤگے مگر یہ کہ (موت یا کسی اور سبب سے) تم سے قدرت سلب ہو جائے اور جس وقت انہوں نے اس سے قابل وثوق وعدہ کرلیا تو اس نے کہا: جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں خدا اس پر ناظر و حافظ ہے۔

آخر کار باپ راضی ہو گئے

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی مالا ہو کر خوشی خوشی کنعان واپس آئے لیکن آئندہ کی فکر تھی کہ اگر باپ چھوٹے بھائی (بنیامین) بھیجنے پر راضی نہ ہوئے تو عزیز ان کی پذیرائی نہیں کرے گا اور انہیں غلے کا حصہ بھی نہیں دے گا۔

اسی لئے قرآن کہتا ہے: جب وہ باپ کے پاس لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا ابا جان! حکم دیا گیا ہے کہ آئندہ ہمیں غلے کا حصہ نہ دیا جائے اور پیمانہ ہم سے روک دیا جائے ﴿فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَى أَبِيهِمْ قَالُوا يَاأَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ﴾۔ اب جب یہ صورت درپیش ہے ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم پیمانہ حاصل کر سکیں ﴿فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ﴾۔(۱)

اور آپ مطمن رہیں ہم اس کی حفاظت کریں گے ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾۔

باپ کہ جسے یوسف علیہ السلام ہرگز نہ بھولتا تھا یہ بات سن کر پریشان ہوگیا، ان کی طرف رخ کرکے اس نے کہا: کیا میں تم پر اس بھائی کے بارے میں بھروسہ کرلوں کہ اس کے بھائی یوسف (ع) کے بارے میں گزشتہ زمانے میں تم پر بھروسہ کیا تھا ﴿قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلاَّ كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَى أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ﴾۔

یعنی جب تمہارا ایسا برا ماضی ہے کہ جو بھولنے کے قابل نہیں تو تم کس طرح توقع رکھتے ہو کہ دوبارہ تمہاری فرمائش مان لوں اور اپنے فرزند دلبند کو تمہارے سپرد کروں اور وہ بھی ایک دور دراز سفر اور پرائے دیس کے لئے۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا: ہر حالت میں خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔

﴿فَاللهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾۔

ہوسکتا ہے یہ جملہ اس طرف اشارہ ہو کہ تم جیسے برے ماضی والے افراد کے ساتھ میرے لئے مشکل ہے کہ بنیامین کو بھیجوں اور بھیجوں گا، بھی تو خدا کی حفاظت میں اور اس کے ارحم الراحمین ہونے کے بھروسے پر نہ کہ تمہارے بھروسے پر۔

لہٰذا مندرجہ بالا جمہ ان کی فرمائش قبول کرنے کی طرف قطعی اشارہ نہیں ہے بلکہ ایک احتمالی بات ہے کیونکہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ابھی تک ان کی فرمائش قبول نہ کی تھی اور آپ نے پختہ عہد لینے اور پیش آمدہ دیگر واقعات کے بعد اسے قبول کیا۔

دوسرا یہ کہ ممکن ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس موقع پر انہیں یوسف علیہ السلام یاد آگئے اور وہ پہلے سے بھی جانتے تھے کہ وہ زندہ ہیں (اور بعد والی آیات میں بھی ہم پڑھ گئے ہیں کہ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے کا اطمینان تھا) لہٰذا آپ نے ان کے محفوظ و سلامت رہنے کی دعا کی کہ خدایا! وہ جہاں کہیں بھی ہیں انہیں سلامت رکھ۔

پھر ان بھائیوں نے جن اپنا سامان کھولاتو انہوں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر عزیز مصر کو دی تھیں سب انہیں لوٹا دی گئی ہیں اور وہ ان کے سامان میں موجود ہیں ﴿ وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ﴾۔

جب انھوں نے دیکھا کہ یہ تو ان کی گفتگو پر سند قاطع ہے تو باپ کے پاس آئے اور "کہنے لگے: ابا جان! ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئیے، دیکھئے انہوں نے ہمارا تمام مال و متاع ہمیں واپس کردیا ہے"۔﴿قَالُوا يَاأَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا﴾(۲)

کیا اس سے بڑھ کر کوئی عزت و احترام اور رمہربانی ہو سکتی ہے کہ ایک غیر ملک کا سربراہ ایسے قحط اور خشک سالی میں ہمیں اناج بھی دے اور اس کی قیمت بھی واپس کردے، وہ بھی ایسے کہ ہم سمجھ ہی نہ پائیں اور شرمندہ نہ ہوں؟ اس سے بڑھ کر ہم کیا تصور کرسکتے ہیں؟؟

ابا جان! اب کسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ساتھ بھیج دیں "ہم اپنے گھر والوں کے لئے اناج لے آئیں گے"۔﴿وَنَمِيرُ أَهْلَنَا﴾۔(۳)

اور اپنے بھائی کی حفاظت کی کوشش کریں گے"۔﴿وَنَحْفَظُ أَخَانَا﴾۔"نیز اس کی وجہ سے ایک اونٹ کا بار بھی زیادہ لائیں گے۔﴿وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ﴾۔اور عزیز مصر جیسے محترم، مہربان اور سخی شخص کے لئے کہ جسے ہم نے دیکھا ہے ایک آسان اور معمولی کام ہے﴿ذَلِکَ كَيْلٌ يَسِيرٌ﴾۔(۴)

ان تمام امور کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لئے راضی نہ تھے لیکن دوسری طرف ان کا اصرار تھا جو واضح منطق کی بنیاد پر تھا۔ یہ صورت ِحال انہیں آمادہ کرتی تھی کہ وہ ان کی تجویز قبول کرلیں۔ آخر کار انہوں نے دیکھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مشروط طور پر بیٹے کو بھیج دیا جائے۔ لہٰذا آپ نے انہیں اس طرح سے "کہا: میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا، جب تک کہ تم ایک خدائی پیمان نہ دو اور کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے مجھے اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم اسے واپس لے کر آؤ گے مگر یہ کہ موت یا موت یا اور عوامل کی وجہ سے یہ امر تمہارے بس میں نہ رہے﴿قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِي مَوْثِقًا مِنَ اللهِ لَتَأْتُونَنِي بِهِ إِلاَّ أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ﴾۔

"موثقاً من اللہ" سے مراد وہی قسم ہے جو خدا کے نام کے ساتھ ہے۔

"الا ان یحاط بکم "کا معنی اصل میں یہ ہے:

"مگر یہ کہ جو حوادث سے مغلوب ہو جاؤ"۔

یہ جملہ ہوسکتا ہے موت یا ایسے دوسرے حوادث کے لئے کنایہ ہو جو انسان کو بے بس کردیں۔ [۵]

﴿واحیط بثمرہ﴾ (کہف۔ ۴۲) لیکن واضح زیر بحث آیات میں مراد بالخصوص ہلاکت نہیں ہے بلکہ ایسا عذر ہے جس کے باعث انسان کا اختیار ختم ہو جائے۔

یہ استثناء حضرت یعقوب علیہ السلام کی عظیم دانائی کی علامت ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے بیٹھے بنیامین سے اس قدر محبت رکھتے تھے انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں کو ایسی مشکل میں نہیں ڈالا جو ان کے بس میں نہ ہو لہذا کہا کہ میں تم سے اپنا بیٹا چاہتا ہوں مگر یہ کہ ایسے حوادث پیش آجائیں جو تمہاری قدرت سے ماوراء ہوں اس صورت میں تمہارا کوئی گناہ نہ ہوگا۔واضح ہے کہ اگر ان میں سے بعض کسی حادثے میں گرفتار ہو جاتے اور ان سے قدرت چھن جاتی تو باقی رہ جانے والوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ باپ کی امانت اس تک پہنچا دیں، اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں: مگر یہ کہ تم سب حوادث سے مغلوب ہو جاؤ۔بہر حال یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے باپ کی شرط قبول کرلی اور جب انہوں نے اپنے والد سے عہدو پیمان باندھا تو یعقوب علیہ السلام نے کہا: شاہد، ناظر اور محافظ ہے، اس بات پر کہ جو ہم کہتے ہیں﴿فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللهُ عَلَى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کیسے راضی ہو گئے:

مندرجہ بالا آیات کے سلسلے میں جو پہلا سوال ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت عقوب علیہ السلام بنیامین کو ان کے سپرد کرنے پر کیسے آمادہ ہو گئے جب کہ ان کے بھائی یوسف علیہ السلام کے بارے میں اپنے سلوک کی وجہ سے پہلے برے کردار کے شمار ہوتے تھے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صرف یوسف علیہ السلام کے بارے میں اپنے دل میں کینہ و حسد نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ یہی احساسات اگرچہ نسبتاً خفیف ہی سہی بنیامین کے لئے بھی رکھتے تھے۔چنانچہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں ہے:

﴿اذقالوا لیوسف و اخوہ احب الیٰ ابینا منا و نحن عصبة﴾

انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہے جب کہ ہم زیادہ طاقتور ہیں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام والے حادثے کو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے جو ان بھائی بڑھاپے کو پہنچ گئے تھے اور فطرتاً ان

کے ذہن پہلے زمانے کی نسبت پختہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں گھر کے ماحول پر اور اپنے مضطرب وجدان پر اپنے برے ارادے کے اثرات وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے اور تجربے نے ان پر ثابت کر یا کہ یوسف علیہ السلام کے فقدان سے نہ صرف یہ کہ ان کے لئے باپ کی محبت میں اضافہ ہوا بلکہ مزید مہری اور بے التفاتی پیدا ہو گئی۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تو ایک زندگی کا مسئلہ ہے۔ قحط سالی میں ایک گھرانے کے لئے اناج مہیا کرنا ایک بہت بڑی چیز تھی اور یہ سیر و تفریح کا معاملہ نہ تھا جیسا کہ انہوں نے ماضی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمائش کی تھی۔

ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی بات مان لی لیکن شرط کے ساتھ کہ آپ سے عہد و پیمان باندھیں کہ وہ اپنے بھائی بنیامین کو صحیح و سالم آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔

۲۔ کیا صرف ایک قسم کافی تھی؟

دوسرا سوال یہاں یہ پید اہوتا ہے کہ کیا صرف قسم کھا لینا اور خدائی پیمان باندھ لینا کافی تھا کہ جس کی بنیاد پر بنیامین کو ان کے سپرد کردیا جاتا۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم ہے کہ عہدو پیمان اور قسم کھا لینا ہی کافی نہیں تھا لیکن قرائن و شواہد نشاندہی کرے تھے کہ اس دفعہ ایک حقیقت پیش نظر ہے نہ کہ سازش، مکروفریب اور جھوٹ۔ اس لئے وعدہ اور قسم زیادہ تاکید کے لئے تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی اشخاص سے مثلاً صدر مملکت اور اسمبلی کے ارکان سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے حلفِ وفا داری لیا جاتا ہے جب کہ ان کے انتخاب میں بھی کافی دیکھ بھال سے کام لیا جاتا ہے۔

۱۔ ”نکتل“ اصل میں ”کیل“ کے مادہ سے ”نکتال“ تھا یہ پیمانے سے کوئی چیز حاصل کرنے کے معنی میں ہے لیکن ”کال“ پیمانے سے کوئی دینے کے معنی میں ہے۔

۲۔ ہوسکتا ہے ”مانبغی“ استفہامیہ جملہ ہو اور اس کی تقدیر ”مانبغی وراء ذٰلک“ (ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہئیے) ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نافیہ ہو اور اس کی تقدیر اس طرح ہو: ”مانبغی بذٰلک الکذب۔ او۔ مانبغی منک دراھم“ (ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے یا یہ کہ ہم اور پیسے آپ سے نہیں چاہتے یہی مال کافی ہے۔

۳۔ ”نمیر“ میرہ“ مادہ سے کھانا اور غذائی مواد حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

۴۔ ”ذٰلک کیل یسیر“ میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ لے آئے ہیں یہ تو تھوڑا سا پیمانہ ہے اگر ہمارا چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ چلے تو ہم زیادہ غلہ حاصل کرسکتے ہیں۔

۵۔ یہ تفسیر قرآن مجید میں کئی مقامات پر صرف ہلاکت او رنابودی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً وظنوا انھم احیط بھم (یونس۔ ۲۲)

آیات ٦٧، ٦٨

٦٧۔ ﴿وَقَالَ يَابَنِيَّ لاَتَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنكُمْ مِنَ اللهِ مِنْ شَيْءٍ إِنْ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلْ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾۔

٦٨۔ ﴿وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللهِ مِنْ شَيْءٍ إِلاَّ حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَيَعْلَمُونَ﴾

ترجمہ

٦٧۔ (جب وہ جانے لگے تو یعقوب علیہ السلام نے) کہا: میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور (میں یہ حکم دے کر) خدا کی طرف سے حتمی حادثے کو نہیں ٹال سکتا۔ حکم اور فرمان صرف خدا کی طرف سے جاری ہوتا ہے۔ اس پر میں نے توکل کیا ہے اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہئیے۔

٦٨۔ اور جب اسی طریقے سے جیسا کہ انہیں باپ نے حکم دیا تھا وہ داخل ہوئے تو یہ کام ان سے کسی حتی خدائی حادثے کو دور نہیں کرسکتا تھا سوائے اس حاجت کے جو یعقوب علیہ السلام کے دل میں تھی، (جو اس طرح سے) انجام پائی (اور اس کے دل کو تسکین ہوئی) اور وہ اس تعلیم کی برکت سے جو ہم نے اسے دی بہت سا علم رکھتا تھا جب کہ اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر

آخر کار حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی باپ کی رضا مندی کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو ہمراہ لے کر دوسری مرتبہ مصر جانے کو تیار ہوئے تو اس موقع پر باپ نے انہیں نصیحت کی۔ "اس نے کہا: میرے بیٹو! تم ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا"

﴿وَقَالَ يَابَنِيَّ لاَتَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ﴾۔

اور مزید کہا: "یہ حکم دے کر میں خدا کی طرف سے کسی حتمی حادثے کو تم سے برطرف نہیں کرسکتا" ﴿وَمَا أُغْنِي عَنكُمْ مِنَ اللهِ مِنْ شَيْءٍ﴾۔ لیکن ناگوار حوادث کا ایک سلسلہ ایسا ہے جس سے بچا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق خدا کا حتمی حکم صادر نہیں ہوا۔

میرا مقصد یہ ہے کہ ایسے حوادث تم سے دور ہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے۔

آخر میں کہا: "حکم اور فرمان خدا کے ساتھ مخصوص ہے" ﴿إِنْ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ﴾۔ "میں نے خدا پر توکل کیا ہے" ﴿عَلَيْهِ تَوَكَّلْت﴾۔ " اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہئیے اور اسی سے مدد طلب کرو اور اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو" ﴿وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلْ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں دوسرے شہروں کی طرح مصر کے پایہ تخت کے اگرد گرد بھی فصیل تھی۔ اس کے بھی برج و بار تھے اور اس کے متعدد دروازے تھے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیوں نصیحت کی کہ ان کے بیٹے ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ مختلف حصوں میں تقسیم ہوکر مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہو، اس کی وجہ مندرجہ بالاآیت میں مذکورنہیں ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ایک تو بہت حسین و جمیل تھ ء (اگرچہ وہ یوسف نہ تھے مگریوسف کے بھائی تو تھے)۔ ان کا قد کاٹھ بہت اچھا تھا۔ لہٰذا ان کے باپ پریشان تھے کہ گیارہ افراد اکھٹے جن کے چہرے مہرے معلوم ہوکہ وہ مصر کے علاوہ کسی اور ملک سے آئے ہیں، لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح انہیں نظربد لگ جائے۔

اس تفسیر کے بعد مفسرین کے درمیان نظر بد کی تاثیر کے بارے میں ایک طویل بحث چھڑ گئی ہے۔ انہوں نے اس کے لئے روایات و تاریخ میں سے کئی ایک شواہد پیش کئے ہیں جنہیں ہم انشاء الہ اس آیت کی تفسیر میں ذکر کریں گے:

﴿و ان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصار ھم﴾ (ن و القلم۔ ۵۱)

اس آیت کے ذیل میں ہم ثابت کریں گے کہ اس سلسلے کی کچھ بحث بجا بھی ہے اور سائنسی لحاظ سے بھی ایک مخصوص سیالہ مقناطیسی کہ جو آنکھ سے باہر اڑتا ہے اس کی توجیہ پیش کی جا سکتی ہے اگرچہ عامۃ الناس نے اس معاملے میں بہت سی خرافات شامل کردی ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس حکم کے بارے میں جو دوسری علت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے جب اونچے لمبے چوڑے چکلے مضبوط جسموں والے اکھٹے چلیں تو حاسدوں کو انہیں دیکھ کر حسد پیدا ہو اور وہ ان کے بارے میں حکومت سے کوئی شکایت کرنے لگیں اور ان کے متعلق یہ بد ظنی کریں کہ وہ کسی خرابی اور فتنہ و فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے باپ نے انہیں حکم دیا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہوں تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

بعض مفسرین (عظیم و خطیب مرحوم اشراقی (قدس سرہ) نے اس کی ایک عرفانی تفسیر بھی ہے۔ وہ یہ کہ یعقوب علیہ السلام راہنما راہ کے حوالے سے اپنے بیٹوں کو ایک اہم معاشرتی مسئلہ سمجھانا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ کھوئی ہوئی چیز کو صرف ایک ہی راستے سے تلاش نہ کریں بلکہ ہر دروازے سے داخل ہو کر اسے ڈھونڈیں۔

کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک مقصد تک پہنچنے کے لئے صرف ایک ہی راہ کا انتخاب کرتا ہے اور جب آگے راستہ بن پاتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو کہ متوجہ ہو کہ گمشدہ افراد اور چیزیں عموماً ایک ہی راستے پر جانے سے نہیں ملتیں بلکہ مختلف راستوں سے ان کی جستجو کرنا چاہتے تو عام طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔

برادران یوسف علیہ السلام روانہ ہوئے اور کنعان و مصر کے درمیان طویل مسافت طے کرنے کے بعد سرزمین مصر میں داخل ہوئے اور جب باپ کے دئے ہوئے حکم کے مطابق مختلف راستوں سے مصر میں داخل ہوئے تو یہ کام انہیں کسی خدائی حادثے سے دور نہیں کرسکتا تھا ﴿وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ۔بلکہ اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ "یعقوب کے دل میں ایک حاجت تھی جو اس طرح پوری ہوتی تھی" (إِلاَّ حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اثر صرف باپ کے دل کی تسکین اور آرام تھا کیونکہ وہ اپنے سارے بیٹوں سے دور تھا اور رات دن ان کی اور یوسف کی فکر میں رہتا تھا اور ان کے بارے میں حوادث کے گزند اور حاسدوں اور بد خواہوں کے بغض و حسد سے ڈرتا تھا اور اسے صرف اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ اس کے احکام کے کاربند رہیں گے۔ اس پر اس کا دل خوش تھا۔

اس کے بعد قرآن یعقوب علیہ السلام کی یوں مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کرتا ہے: وہ ہماری ہوئی تعلیم کے سبب علم آگہی رکھتا تھا جب کہ اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَيَعْلَمُونَ﴾۔

اس طرف اشارہ ہے کہ اسی طرح بہت سے لوگ عالم اسباب میں گم ہو جاتے ہیں، خدا کو بھول جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کو نظر بد سے نہیں بچایا جاسکتا۔ اسی بناء پر ایسے لوگ خدا اور اس پر توکل کو بھول کر ہر کہ کہ ومہ کے دامن سے جا چمٹتے ہیں لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام اس طرح کے نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک خدا کسی چیز کو نہ چاہے وہ انجام نہیں پا سکتی لہذا پہلے درجے میں ان کا بھروسہ اور اعتماد خدا پر تھا۔ اس کے بعد وہ عالمِ اسباب

کی طرف جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ ان اسباب کے پیچھے ایک مسبب الاسباب ذات پاک ہے

، جیسا کہ قرآن بقرہ ۱۰۲ میں شہر بابل کے جادوگروں کے بارے میں کہتا ہے :

﴿وما هم بضارين به من احد الا باذن الله﴾

وہ جادو سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تے مگر یہ کہ خدا چاہے ۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان سب چیزوں سے مافوق خدا کا ارادہ ہے دل اس سے باندھنا چاہئیے اور اسی سے مدد لینا چاہئیے ۔

آیات ٦٩،٧٠،٧١،٧٢،٧٣،٧۴،٧۵،٧٦

۶۹۔ ﴿وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ آوَى إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّى أَنَا أَخُوكَ فَلاَتَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

۷۰۔ ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِى رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ﴾۔

۷۱۔ ﴿قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ﴾۔

۷۲۔ ﴿قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ﴾۔

۷۳۔ ﴿قَالُوا تَاللهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ﴾۔

۷۴۔ ﴿قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنتُمْ كَاذِبِينَ﴾۔

۷۵۔ ﴿قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِى رَحْلِهِ فَهُو جَزَاؤُهُ كَذَلِكَ نَجْزِى الظَّالِمِينَ﴾۔

۷۶۔ ﴿فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِى دِينِ الْمَلِكِ إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ اللهُ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِى عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾۔

ترجمہ

۶۹۔جب یوسف کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ میں تمہارا بھائی ہوں جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے غمگین اور پریشان نہ ہو۔

۷۰۔ اورجس وقت ان کا سامان باندھا گیا تو ان کے بادشاہ نے پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کے بعد کسی نے آواز بلند کی کہ اے س قافلے والو! تم چور ہو۔

۷۱۔ انہوں نے اس کی طرف رخ کرکے کہا تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے۔

۷۲۔ انہوں نے کہا: بادشاہ کا پیمانہ، اور جو شخص اسے لے آئے (غلے کا) اونٹ کا ایک بار اسے دیا جائے گا اور میں (اس انعام کا) ضامن ہوں۔

۷۳۔ انہوں نے کہا: قسم بخدا تم جانتے ہو کہ ہم اس علاقے میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم (کبھی بھی) چور نہیں تھے۔

۷۴۔انہوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ہوئے تو تمہاری سزا کیا ہے۔

۷۵۔ انہوں نے کہا: جس کے سامان میں (وہ پیمانہ) مل گیا تو وہ خود اس کی سزا ہو گا (اور اس کام کی بناء پر وہ غلام ہو جائے گا) ہم ظالموں کو اس طرح سے سزا دیتے ہیں۔

۷۶۔ تو اس وقت (یوسف نے) اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ان کے سامان کی تلاشی لی اور پھر اپنے بھائی کے سامان سے اسے برآمد کرلیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کو چارہ کار یاد دلایا۔ وہ مصر (کے بادشاہ) کے آئین کے مطابق اپنے بھائی کو ہرگز نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ خدا چاہے۔ ہم جس شخص کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک عالم ہے۔

بھائی کو روکنے کی کوشش

آخر کار بھائی یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے والد پہلے چھوٹے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھے لیکن ہم نے اصرار کرکے اسے راضی کی ہے تاکہ آپ جالیں کہ ہم نے قول و قرار پورا کیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بڑی عزت و احترام سے ان کی پذیرائی کی، انہیں مہمان بلایا اور حکم دیا کہ دسترخوان یا طبق کے پاس دو دو افراد آئیں۔ انہوں نے ایسا ہیں کیا، اس وقت بنیامین جو تنہا رہ گیا تھا رونے لگا اور کہنے لگا کہ اگر میرا یوسف علیہ السلام زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھاتا کیونکہ ہم پدری مادری بھائی تھے۔

پھر حکم دیا کہ دو دو افراد کے لئے ایک ایک کمرہ سونے کے لئے تیار کیا جائے۔ بنیامین پھر اکیلا رہ گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اسے میرے پاس بھیج دو۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی لیکن دیکھا کہ وہ بہت دکھی اور پریشان ہے اور ہمیشہ اپنے کھوئے ہوئے بھائی یوسف علیہ السلام کی یاد میں رہتا ہے۔ ایسے میں یوسف علیہ السلام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آپ علیہ السلام نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی اور کہا کہ میں وہی تمہارا بھائی یوسف ہوں، غمگین نہ ہو اور اپنے دل کو دکھی نہ کر اور ان کے کسی کام سے پریشان نہ ہو﴿وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ آوَى إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَاتَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

"لاتبتئس" اصل میں "بوس" کے مادہ سے ضرر اور شدت کے معنی میں ہے اور اس مقام پر اس کا معنی ہے "غمگین نہ ہو"۔

بھائیوں کے کام کہ جو بنیامین کو دکھی اور پریشان کرتے تھے ان سے مراد ان کی وہ نامہربانیاں اور بے التفاتیاں تھیں جو وہ اس کے اور یوسف علیہ السلام کے لئے روا رکھتے تھے اور وہ سازشیں کہ جو اسے گھر والوں سے دور کرنے کے لئے انجام دیتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی کارستانیوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ میری ترقی اور بلندی کا ذریعہ بن گئیں لہٰذا اب تم بھی اس بارے میں اپنے دل کو دکھی نہ کرو۔

بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین سے کہا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میرے پاس رہ جاؤ اس نے کہا: ہاں میں تو راضی ہوں لیکن بھائی ہرگز نہیں راضی ہوں گے کیونکہ انہوں نے باپ سے قول و قرار کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تم فکر نہ کرو میں ایک منصوبہ بناتا ہوں جس وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں میرے پاس چھوڑ جائیں۔ غلات کے بار تیار ہو گئے تم حکم دیا کہ مخصوص قیمتی پیمانہ بھائی کے بار میں رکھ دیں (کیونکہ ہر شخص کے لئے غلے کا ایک بار دیا جاتا تھا) ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ﴾۔

البتہ یہ کام مخفی طور پر انجام پایا اور شاید اس کا علم مامورین میں سے فقط ایک شخص کو تھا۔

جب اناج کو پیمانے سے دینے والوں نے دیکھا کہ مخصوص قیمتی پیمانے کا کہیں نام ونشان نہیں ہے حالانکہ پہلے وہ ان کے پاس موجود تھا۔ لہٰذا جب وہ قافلہ چلنے لگا تو کسی نے پکار کر کہا: اے قافلے والو! تم چور ہو ﴿ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ﴾۔

یوسف (ع) کے بھائیوں نے جب یہ جملہ سنا تو سخت پریشان ہوئے اور وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ ان کے ذہن میں تو اس کا خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ اس احترام و اکرام کے بعد ان پر چوری کا الزام لگایا جائے گا۔ لہٰذا انہوں اس کی طرف رخ کرکے کہا: تمہاری کونسی چیز چوری ہوگئی ہے ﴿ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ﴾۔

انہوں نے کہا ہم سے بادشاہ کا پیمانہ گم ہوگیا ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں بدگمانی ہے ﴿قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ ﴾۔

پیمانہ چونکہ گراں قیمت ہے اور بادشاہ کو پسند ہے لہٰذا "وہ جس شخص کو ملے اور وہ اسے لے آئے تو اسے ایک اونٹ کا بار بطور انعام دیا جائے گا" ﴿وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ﴾۔

پھر یہ بات کہنے والے نے مزید تاکید سے کہا: اور میں ذاتی طور پر اس انعام کا ضامن ہوں ﴿وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ﴾۔

بھائی یہ بات سن کر سخت پریشان ہوئے اور حواس باختہ ہوگئے اور وہ نہیں سمجھتے تھے کہ معاملہ کیا ہوا، ان کی طرف رخ کرکے " انہوں نے کہا: خدا کی قسم تم جانتے کہ ہم یہاں اس لئے نہیں آئے کہ فتنہ و فساد کریں اور ہم کبھی بھی چور نہیں تھے "﴿قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ﴾۔

یہ جو انہوں نے کہا کہ تم خود جانتے ہو کہ ہم فسادی اور چور نہیں ہیں، شاید اس طرف اشارہ ہو کہ تم ہمارا سابقہ کردار اچھی طرح جانتے ہو کہ گزشتہ موقع پر ہماری پیش کردہ قیمت جو تم نے ہمارے غلات میں رکھ دی تھی وہ ہم دوبارہ تمہارے پاس لے آئے ہیں اور تمہیں بتایا کہ وہ ساری کی ساری ہم تمہیں واپس کرنے کو تیار ہیں لہٰذا وہ افراد جو دور دراز کے ملک سے اپنا قرض ادا کرنے واپس آجاتے ہیں ان سے کیونکر ممکن ہے کہ چوری کے لئے ہاتھ بڑھائیں۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو انہون نے اپنے اونٹوں کے منہ دہان بدنوں سے باندھ دیئے تھے تاکہ وہ کسی کی زراعت اور مال کا نقصان نہ کریں۔ لہٰذا ان کی مراد یہ تھی کہ ہم جو اس حد تک احتیاط کرتے ہیں حتی کہ ہمارے جانور بھی کسی کو ضرر یا نقصان نہ پہنچائیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ہم ایسے کام کے مرتکب ہوں۔

یہ سن کر مامورین ان کی طرف متوجہ ہوئے اور " کہا: لیکن اگر تم جھوٹے ہوئے تو اس کی سزا کیا ہے؟ "﴿قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ﴾۔

" انہوں نے جواب میں کہا: اس کی سزا یہ ہے کہ جو شخص کے بارے میں بادشاہ ک اپیمانہ مل جائے اسے روک لو اور اسے اس کے بدلے میں لے لو "﴿قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ﴾۔" جی ہاں! ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں﴿كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ﴾۔

اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کے غلات کے بارے کھولے جائیں اور ایک ایک جانچ پڑتال کی جائے البتہ اس بناء پر ان کے اصلی منصوبے کا کسی کو پتہ نہ چلے، اپنے بھائی بنیامین کے بار سے پہلے دوسروں کے سامان کی پڑتال کی اور پھر وہ مخصوص پیمانہ اپنے بھائی کے مال سے برآمد کرلیا ﴿فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ﴾۔

بنیامین کے بارے سے پیمانہ برآمد ہوا تو تعجب سے بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے گویا غم و اندوہ کے پہاڑ ان کے سروں پر آگرا اور انہیں یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب مقام پر پھنس گئے ہیں کہ جس کے چاروں طرف راستے بند ہوگئے ہیں۔ ایک طرف ان کا بھائی ظاہرا ایسی چوری کا مرتکب ہوا جس سے ان کے سر ندامت سے جھک گئے اور دوسری طرف

ظاہراً عزیز مصر کی نظروں میں ان کی عزت و حیثیت خطرے میں جا پڑی کہ اب آئندہ کے لئے اس کی حمایت حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہ رہا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر انہوں نے سوچا کہ باپ کو کیا جواب دیں گے اور وہ کیسے یقین کرے گا کہ اس میں ان کوئی قصور نہیں ہے ۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ موقع پر بھائیوں نے بنیامین کی طرف رخ کرکے کہا: اے بے خبر! تونے ہمیں رسوا کردیا ہے اور ہمارا منہ کالا کردیا ہے ۔ تونے یہ کیسا غلط کام انجام دیا ہے (نہ تونے اپنے باپ پر رحم کیا ، نہ ہم پر اور نہ خاندان یعقوب علیہ السلام پر کہ جو خاندانِ نبوت ہے)آخر ہمیں بتا تو سہی کہ تونے کس وقت پیمانہ اٹھایا اور اپنے بار میں رکھ لیا ۔

بنیامین نے جو معالے کی اصل اور قضیے کے باطن کو جانتا تھا ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ یہ کام اسی شخص نے کیا ہے جس نے تمہاری دی ہوئی قیمت تمہارے بار میں رکھ دی تھی لیکن بھائیوں کو اس حادثے نے اس قدر پریشان کررکھا تھا کہ وہ سمجھ نہ سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ۔ (۱)

پھر قرآن مزید کہتا ہے : ہم نے اس طرح یوسف علیہ السلام کے لئے ایک تدبیر کی (تاکہ وہ اپنے بھائی کو دوسرے بھائیوں کی مخالفت کے بغیر روک سکیں) ﴿کَذَلِکَ کِدْنَا لِیُوسُفَ﴾ ۔

اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام قوانین مصر کے مطابق سلوک کرتے تو انہیں چاہئیے تھا کہ اسے زود و کوب کرتے اور قید خانے میں ڈال دیتے لیکن اس طرح نہ صرف بھائی کو آزار و تکلیف پہنچتی بلکہ خود ان کا مقصد کہ بھائی کو اپنے پاس رکھیں ، پورا نہ ہوتا ۔ اسی لئے انہوں نے پہلے بھائیوں سے اعتراف لیا کہ اگر تم سے چوری کی ہو تو تمہارے نزدیک اس کی کیا سزا ہے تو انہوں نے اپنے ہاں رائج طریقے کے مطابق جواب دیا کہ ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ طور کو اس کی چوری کے بدلے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اسی طریقے کے مطابق ان سے سلوک کیا کیونکہ مجرم کو سزا دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے اس کے اپنے قانون کے مطابق سزا دی جائے ۔

اسی بناء پر قرآن کہتا ہے : یوسف علیہ السلام ملکِ مصر کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے اور اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے ﴿مَا کَانَ لِیَأْخُذَ أَخَاهُ فِی دِینِ الْمَلِکِ﴾ ۔

اس کے بعد استثناء کے طور پر فرماتا ہے : مگر یہ کہ خدا چاہے ﴿إِلاَّ أَنْ یَشَاءَ اللهُ﴾ ۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام جو یوسف علیہ السلام نے انجام دیا اور بھائیوں کے ساتھ ان کے طریقے کے مطابق سلوک کیا فرمان الٰہی کے مطابق تھا اور یہ بھائی کی حفاظت اور ان کے باپ کی اور دوسرے بھائیوں کی آزمائش کی تکمیل کے لئے ایک منصوبہ تھا۔

آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: ہم جس کو چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں ﴿نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ﴾۔

ان افراد کے درجات۔ جو اہل ہوں اور یوسف کی طرح امتحانات کی کٹھالی سے صحیح و سالم نکل آئیں۔

بہر حال ہر عالم سے بڑھ کر ایک عالم و دانا ہے (یعنی خدا) ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾۔ اور وہی ہے جس نے اس منصوبے کا یوسف علیہ السلام کو الہام کیا تھا۔

چند اہم نکات

مندرجہ بالا آیات سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا ایک ایک کر کے جواب دیا جائے گا:

۱۔ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا؟

یوسف علیہ السلام نے بھائیون نے اپنا تعارف کیوں نہیں کروایا، تاکہ ان کے باپ کو جانکاہ غمِ فراق سے جلدی نجات ملتی ؟۔

اس سوال کا جواب جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ باپ اور بھائیوں کے امتحان کے پروگرام کی تکمیل کے لئے تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کام خود غرضی کی بناء پر نہ تھا بلکہ ایک فرمان الٰہی کے ماتحت تھا۔ خدا چاہتا تھا کہ دوسرے بیٹھے کو کھونے پر بھی یعقوب علیہ السلام کے عزم اور حوصلے کا امتحان لے اور یوں ان کے تکامل اور ترقی کا آخری زینہ بھی طے ہو جائے اور بھائی بھی آزمائے جائیں کہ ایسے موقع پر جب ان کا بھائی اس طرح کے معالے میں گرفتار ہوا ہے تو وہ باپ سے باندھے پیمان کی کس طرح سے حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ بے گناہ پر چوری کا الزام ؟:

کیا جائز تھا کہ ایک بے گناہ پر چوری کا اتہام لگایا جاتا، ایسا اتہام کہ جس کے برے آثار نے باقی بھائیوں کو بھی کسی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا ؟

اس سوال کا جواب بھی خود واقعہ میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ خود بنیامین کی رضا مندی سے انجام پایا تھا۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے اپنے آپ کو اس سے متعارف کروایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ منصوبہ خود اس کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ نیز اس سے بھائیوں پر بھی کوئی تہمت نہیں لگی البتہ انہیں اضطراب اور پریشانی ضرور ہوئی جس میں کہ ایک اہم امتحان کی وجہ سے کوئی ہرج نہ تھا۔

۳۔ چوری کی طرف سب کی نسبت کیوں دی گئی؟:

کیا " انکم لسارقون " یعنی " تم چور ہو کہکر سب کی طرف چوری کی نسبت دینا جھوٹ نہ تھا اور اس جھوٹ اور تہمت کا کیا جواز تھا؟

ذیل کے تجربہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا:

اولاً: یہ معلوم نہیں کہ یہ بات کہنے والے کون تھے۔ قرآن میں صرف اس قدر: " قالوا " یعنی انہوں نے کہا۔" ہو سکتا ہے یہ بات کہنے والے حضرت یوسف علیہ السلام کے کچھ کارندے ہوں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ مخصوص پیمانہ نہیں ہے تو یقین کرلیا کہ کنعان کے قافلے میں سے کسی شخص نے اسے چرا لیا ہے اور یہ معمول ہے کہ اگر کوئی چیز ایسے افراد میں چوری ہو جائے کہ جو ایک ہی گروہ کی صورت میں متشکل ہو اور اصل چور پہچانا نہ جائے تو سب کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے یعنی تم میں سے ایک نے یا میں سے بعض نے ایسا کیا ہے۔

ثانیاً: اس بات کا اصلی نشانہ بنیامین تھا جو کہ اس نسبت پر راضی تھا کیونکہ اس منصوبے میں ظاہراً تو اس پر چوری کی تہمت لگی تھی لیکن در حقیقت وہ اس کے اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کے پاس رہنے کے لئے مقدمہ تھی اور یہ جو سب پر الزام آیا یہ ایک بالکل عارضی سی بات تھی جو صرف برادران یوسف علیہ السلام کے سامان کی تلاشی پر ختم ہوگیا اور جو در حقیقت مراد تھا یعنی " بنیامین " وہ پہچان لیا گیا۔

بعض نے کہا کہ یہاں جس چوری کی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے وہ گزشتہ زمانے سے مربوط تھی اور وہ تھی بھائیوں کا یوسف علیہ السلام کے باپ یعقوب علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام کو چرانا لیکن یہ خیال اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جب یہ نسبت حضرت یوسف علیہ السلام علیہ السلام کی طرف اشارہ سے انہیں دی جاتی کیونکہ وہی گزشتہ معاملے سے آگاہ تھے اور شاید بعد والے جملے میں اسی کی طرف اشارہ ہو کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مامورین نے یہ نہیں چاہا کہ تم نے بادشاہ کا پیمانہ

چوری کیا ہے بلکہ کہا: "﴿نفقد صواع الملک﴾" یعنی ہم بادشاہ کا پیمانہ مفقود پاتے ہیں"۔ (لیکن پہلا جواب زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے)۔

۴۔اس زمانے میں چوری کی سزا؟

اس زمانے میں چوری کی سزا کیا تھی اس سلسلے میں زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں اور کنعان کے باشندوں میں چوری کی سزا مختلف تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور احتمالاً اہل کنعان میں اس عمل کی سزا یہ تھی کہ چور کو اس چوری کے بدلے میں (ہمیشہ کے لئے یا وقتی طور پر) غلام بنا لیا جاتا۔[۲]

لیکن مصریوں میں یہ سزا رائج نہ تھی بلکہ چوروں کو دوسرے ذرائع سے مثلاً مارپیٹ سے اور قید و بند وغیرہ سے سزا دیتے تھے۔

بہر حال یہ جملہ اس امر کی دلیل نہیں بنتا کہ آسمانی ادیان میں سے کسی میں غلام بنا لینا چور کی سزا تھی کیونکہ بسا اوقات کسی گروہ میں رائج کوئی طریقہ اس زمانے کے لوگوں کی طرف سے شمار ہوتا ہے۔ غلامی کی تاریخ میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ بے ہودہ اقوام میں یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو جاتا تو اسے غلام بنا لیا جاتا۔

۵۔"سقایا"یا "صواع":

زیر نظر آیات میں کبھی لفظ "صواع"(پیمانہ) استعمال ہوا اور کبھی "سقایۃ" (پانی پینے کا برتن)۔ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ پیمانہ ابتداء میں بادشاہ کے پینے کا برتن تھا لیکن جس وقت اناج سرزمین مصر میں گراں اور کم یاب ہو گیا اور اس کی راشن بند ہو گئی تو اس امر کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کہ لوگ نہایت احتیاط سے اور کم خرچ کریں بادشاہ کے پانی پینے کے لئے استعمال ہونے والا مخصوص برتن اس کے پیمانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس برتن کی خصوصیت کے ضمن میں مفسرین نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ چاندی کا تھا اور بعض کے بقول وہ سونے کا تھا بعض نے اضافہ کیا ہے کہ اس میں جواہرات بھی جڑے ہوئے تھے۔ کچھ غیر معتبر روایات میں بھی ایسے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔

جو کچھ مسلم ہے وہ یہ کہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے کسی زمانے میں بادشاہِ مصر پانی پیتا تھا بعد میں وہ پیمانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ بھی واضح ہے کہ ایک ملک کی تمام تر ضروریات کو اس قسم کے پیمانے سے ناپ کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ایسا رمزاً کیا گیا ہو اور ان سالوں میں غلے کی کم یابی اور اہمیت ظاہر کرنے کے لئے خاص طور پر اسے استعمال کیا گیا ہوتا لوگ اسے صرف کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیں۔

ضمناً اس بناء پر کہ وہ پیمانہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے قبضے میں تھا لہذا وہ اس بات کا سبب بنتا اگر چور غلام بنایا جاتا تو وہ صاحبِ احتیاط پیمانہ یعنی خود حضرت یوسف علیہ السلام کا غلام بنتا اور انہی کے پاس رہتا اور بالکل اسی مقصد کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔

۱۔ مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۵۳۔ مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

۲۔ طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اس زمانے میں ایک گروہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ چور کو ایک سال کے لئے غلام بنا لیتے تھے۔ نیز یہ بھی نقل کیا ہے کہ خاندانِ یعقوب علیہ السلام میں چوری کی مقدار کے برابر غلامی کی مدت معین کی جاتی تھی (تاکہ وہ اسی کے مطابق کام کرے)۔

آیات ۷۷،۷۸،۷۹

۷۷۔﴿ قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ﴾۔

۷۸۔﴿قَالُوا يَاأَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

۷۹۔﴿قَالَ مَعَاذَ اللهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلاَّ مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ﴾ ۔

ترجمہ

۷۷۔) بھائیوں نے) کہا: اگر اس (بنیامین) نے چوری کی ہے تو (تعجب کی بات نہیں)اس کے بھائی (یوسف) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی یوسف (کو بہت دکھ ہوا اور اس) نے اس (دکھ) کو اپنے اندرچھپائے رکھا اور ان پر ظاہر نہیں کیا۔ (بس اتنا) کہا: تم بد تر ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو خدا اس سے زیادہ آگاہ ہے ۔

۷۸۔انہوں نے کہا : اے عزیز مصر ! اس کا ایک بوڑھا باپ ہے (اور وہ بہت پریشان ہوگا) ہم میں سے ایک کو لے لے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو نیکوکاروں میں سے ہے ۔

۷۹۔ اس نے کہا : اس سے خدا کہ پناہ کہ جس شخص کے پاس سے ہمارا مال و متاع ملا ہم سوائے اس کے کسی اور کو لیں کیونکہ اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے ۔

برادران یوسف ﷷ کی فداکاری کیوں قبول نہیں ہوئی ؟

آخر کار بھائیوں نے یقین کرلیا کہ ان کے بھائی بنیامین نے ایسی قبیح اور منحوس چوری کی ہے اور اس طرح اس نے عزیز مصر کی نظروں میں ان کا سابقہ رکارڈ سارا خراب کردیا ہے ۔ لہٰذا اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لئے انہوں نے کہا: اگر اس لڑکے نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اسکا بھائی یوسف ﷷ بھی پہلے ایسے کام کا مرتکب ہو چکا ہے “ اور یہ دونوں ایک ماں اور باپ سے ہیں اور ہم کہ جو دوسری ماں سے ہیں ہمارا حساب کتاب ان سے الگ ہے﴿قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَه مِنْ قَبْلُ﴾۔اس طرح سے انہوں نے اپنے اور بنیامین کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرنا چاہی اور اس کا تعلق یوسف ﷷ سے جوڑدیا ۔

یہ بات سن کر یوسف ﷷ بہت دکھی اور پریشان ہوئے اور ” اسے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے اظہار نہ کیا “ ﴿ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ﴾۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات کہہ کر انہوں ایک بہت بڑا بہتان باندھا

ہے لیکن انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ۔ بس اجمالی طور پر اتنا "کہا: جس کی طرف تم یہ نسبت دیتے ہو تم اس سے بدتر ہو " یا "میرے نزدیک مقام ومنزلت کے لحاظ سے تم بدترین لوگ ہو "﴿قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا﴾ ۔

اس کے بعد مزید کہا: جو کچھ تم کہتے ہو خدا اس کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے ﴿وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ﴾ ۔

یہ ٹھیک ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان بحرانی لمحوں میں اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لئے اپنے بھائی یوسف علیہ السلام پر ایک ناروا تہمت باندھی تھی لیکن پھر بھی اس کام کے لئے کوئی بہانہ اور سند ہونا چاہئیے جس کی بناء پر وہ یوسف علیہ السلام کی طرف ایسی نسبت دیں ۔ اس سلسلے میں مفسرین کاوش وزحمت میں پڑے ہیں اور گزشتہ لوگوں نے تواریخ سے انہوں نے تین روایات نقل کی ہیں ۔

پہلی یہ کہ یوسف علیہ السلام اپنی ماں کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کے پاس رہا کرتے تھے اور انہیں یوسف علیہ السلام سے بہت زیادہ پیار تھا جب آپ بڑے ہو گئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں ان کی پھوپھی سے واپس لینا چاہا تو ان کی پھوپھی نے ایک منصوبہ بنایا اور وہ یہ کمربندیا ایک خاص شال جو حضرت اسحاق (ع) کی جانب سے ان کے خاندان میں بطور یادگار چلی آرہی تھی یوسف علیہ السلام کی کمر سے باندھ دی اور دعویٰ کیا کہ یوسف علیہ السلام اسے چھپا لے جانا چاہتا تھا ایسا انہوں نے اس لئے کیا تاکہ اس خاص کمربند یا شال کے بدلے یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھ لیں ۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مادری رشتہ داروں میں سے ایک کے پاس ایک بت تھا جسے یوسف علیہ السلام نے اٹھا کر توڑ دیا اور اسے سڑک پر لا پھینکا لہٰذا انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام لگا دیا حالانکہ اس میں تو کوئی گناہ نہیں تھا ۔

تیسری روایت یہ ہے کہ کبھی کبھار وہ دسترخوان سے کھانا لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں کو دے دیتے لہٰذا بہانہ تراش بھائیوں نے اسے بھی چوری کا الزام دینے کے لئے سند بنا لیا حالانکہ ان میں سے کوئی چیز گناہ کے زمرے میں نہیں آتی ۔

اگر ایک شخص کسی کو کوئی لباس پہنا دے اور پہننے والا نہ جانتا ہو کہ یہ کسی دوسرے کا مال ہے تو کیا اسے چوری کا الزام دینا صحیح ہے ۔

اسی طرح کیا کسی بٹ کو اٹھا کر پٹخ دینا گناہ ہے ۔

نیز انسان کوئی کوئی چیز اپنے باپ کے دستر خوان سے اٹھا کر مسکینوں کو دے دے جب کہ اسے یقین ہو تو کیا اسے گناہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے چھوٹے بھائی بنیامین کو اس قانون کے مطابق عزیز مصر کے پاس رہنا پڑے گا جسے وہ خود قبول کر چکے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے باپ سے پیمان باندھا تھا کہ بنیامین کی حفاظت اور اسے واپس لانے کے لئے اپنی پوری کوشش کریں گے۔ ایسے میں انہوں نے یوسف علیہ السلام کی طرف رخ کیا جسے ابھی تک انہوں نے پہچانا نہیں تھا اور "کہا: اے عزیز مصر: اے بزرگوار صاحبِ اقتدار! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے اور وہ اس کی جدائی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہم نے آپ کے اصرار پر اسے باپ سے جدا کیا اور باپ نے ہم سے تاکیدی وعدہ لیا کہ ہم ہر قیمت پر اسے واپس لائیں گے۔ اب ہم پر احسان کیجئے اور اس کے بدلے میں ہم سے کسی ایک کو رکھ لیجئے" ﴿قَالُوا يَاأَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ﴾۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نیکو کاروں میں سے ہیں" اور یہ پہلا موقع نہیں کہ آپ نے ہم پر لطف و کرم اور مہربانی کرکے اپنی کرم نوازیوں کی تکمیل کیجئے۔ ﴿إِنَّا نَرَاكَ مِنْ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس تجویز کی شدت سے نفی کی اور "کہا: پناہ بخدا! کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس سے ہمارا مال و متاع برآمد ہوا ہے ہم اس کے علاوہ کسی شخص کو رکھ لیں" کبھی تم نے سنا ہے کہ ایک منصف مزاج شخص نے کسی بے گناہ کو دوسرے کے جرم میں سزا دی ہو ﴿قَالَ مَعَاذَ اللهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلاَّ مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ﴾۔ اگر ہم ایسا کریں تو یقینا ہم ظالم ہوں گے ﴿إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ﴾۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس گفتگو میں بھائی کی طرف چوری کی کوئی نسبت نہیں دی بلکہ کہتے ہیں کہ "جس شخص کے پاس سے ہمیں ہمارا مال و متاع ملا ہے" یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس امر کی طرف سنجیدگی سے متوجہ تھے کہ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی غلط بات نہ کریں۔

آیات ۸۲،۸۱،۸۰

۸۰۔ ﴿فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنَ اللهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّى يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللهُ لِي وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾۔

۸۱۔ ﴿ارْجِعُوا إِلَى أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَاأَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلاَّ بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ﴾۔

۸۲۔ ﴿وَاسْأَلْ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾۔

ترجمہ

۸۰۔ جب (بھائی) اس سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف گئے اور آپس میں سرگوشی کی۔ ان میں سے سب سے بڑے نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ سے تم سے الٰہی پیمان لیا تھا اور اس سے پہلے تم سے یوسف علیہ السلام کے بارے میں کوتاہی کی تھی لہٰذا میں اس سرزمین سے نہیں جاؤں گا جب تک مجھے میرا باپ اجازت نہ دے یا خدا اپنا حکم میرے بارے میں صادر نہ فرمائے اور وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔

۸۱۔ تم اپنے باپ کی طرف پلٹ جاؤ اور اس سے کہو ابا(جان)! تمہارے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کے سوا ہم نے گواہی نہیں دی اور نہ ہی ہم غیب سے آگاہ تھے۔

۸۔ (مزید اطمینان کے لئے) اس شہرے سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے نیز اس قافلے سے پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور ہم (اپنی بات میں) سچے ہیں۔

بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے

بھائیوں نے بنیامین کے رہائی کے لئے اپنی آخری کوشش کر دیکھی لیکن انہوں نے اپنے سامنے تمام راستے بند پائے۔ ایک طرف تو اس کام کو کچھ اس طرح سے انجام دیا گیا تھا کہ طاہراً بھائی کی برأت ممکن نہ تھی اور دوسری طرف عزیز مصر نے اس کی جگہ کسی اور فرد کو رکھنے کی تجویز قبول نہ کی لہٰذا وہ مایوس ہو گئے۔ یوں انہوں نے کنعان کی طرف لوٹ جانے اور باپ سے سارا ماجرا بیان کرنے کا رادہ کر لیا۔ قرآن کہتا ہے: جس وقت وہ عزیز مصر سے یا بھائی کی نجات سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف کو آئے اور دوسروں سے الگ ہو گئے اور سرگوشی کرنے لگے ﴿فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا﴾۔

"خلصوا""یعنی" خالص ہو گئے" ۔ یہ دونوں سے الگ ہونے اور خصوصی میٹنگ کرنے کی طرف اشارہ ہے ۔ اور "نجی" "مناجات" کے مادہ سے دراصل "نجوہ" سے مرتفع زمین کے معنی میں لیا گیا ہے چونکہ اونچی اور مفع زمینیں اپنے اطراف سے جدا اور الگ ہوتی ہیں اور مخفی میٹنگیں اور سرگوشیاں اردگرد والوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں اس لئے انہیں "نجوی" کہتے ہیں (اس بناء پر "نجوی" ہر قسم کی محرمانہ بات کو کہا جاتا ہے چاہے وہ کان میں کہی جائے یا کسی خفیہ میٹنگ میں) ۔

جملہ "خلصوا نجیا" جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ فصیح ترین اور خوبصورت ترین قرآنی تعبیر ہے جس میں دو لفظوں کے ذریعے بہت سے مطالب بیان کردئے گئے ہیں جب کہ یہ مطالب بیان کرنے کے لئے بہت سے جملے درکار تھے ۔

بہرحال سب سے بڑے بھائی نے اس خصوصی میٹنگ میں میں ان سے کہا : کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے الٰہی پیمان لیا ہے کہ بنیامین کو ہر ممکنہ صورت میں ہم واپس لائیں گے ﴿قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنْ اللهِ﴾ ۔ اور تمہی نے اس سے پہلے بھی یوسف کے بارے میں کوتاہی کی " اور باپ کے نزدیک تمہارا گزشتہ کردار برا ہے ﴿وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطتُمْ فِي يُوسُفَ﴾ ۔(۱)

" اب جبکہ معاملہ یوں ہے تو میں اپنی جگہ سے (یا سرزمین مصر سے) نہیں جاؤں گا اور یہیں پڑاؤ ڈالوں گا ، مگر یہ کہ میرا باپ مجھے دے دے یا خدا میرے متعلق کوئی فرمان صادر کرے جو کہ بہترین حاکم و فرماں روا ہے ﴿فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّى يأذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللهُ لِي وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾ ۔

اس حکم یا تو موت کا حکم مراد ہے یعنی مرتے دم تک یہاں سے نہیں جاؤں گا یا خدا کی طرف پیدا ہونے والا کوئی چارہ کار مراد ہے یا پھر کوئی قابل قبول اور ناقابلِ توجیہ عذر مراد ہے جو کہ باپ کے نزدیک قطعی طور پر قابل قبول ہو ۔

پھر بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کو حکم دیا " تم باپ کے پاس لوٹ آؤ اور کہو ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے ﴿ارْجِعُوا إِلَى أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَاأَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ﴾ ۔

" اور یہ جو ہم گواہی دے رہے ہیں اتنی ہی ہے جتنا ہمیں علم ہوا " بس ہم نے اتنا دیکھا کہ بادشاہ کا پیمانہ ہمارے بھائی کے بارے سے برآمد ہوا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے چوری کی ہے ، باقی رہا امرِ باطن تو وہ خدا جانتا ہے ﴿وَمَا شَهِدْنَا إِلاَّ بِمَا عَلِمْنَا﴾ ۔ " اور ہمیں غیب کی خبر نہیں " ﴿وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ﴾ ۔ اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ

بھائیوں کا مقصد یہ ہو کہ وہ باپ سے کہیں کہ اگر ہم نے تیرے پاس گواہی دی اور عہد کیا کہ ہم بھائی کو لے جائیں گے اور واپس لے آئیں گے تو اس بناء پر تھا کہ ہم اس کے باطن سے باخبر نہ تھے اور ہم غیب سے آگاہ نہ تھے کہ اس کا انجام یہ ہوگا۔

۱۔ "فرطتم" "تفریط" کے مادہ سے در اصل "فروط" (بروزن "شروط") مقدم ہونے کے معنی میں ہے اور جب یہ بات تفعیل میں آجائے تو آگے بڑھنے میں کوتاہی کرنے کے معنی میں ہے اور جب باب افعال سے "افراط" ہو تو تقدم اور اگے بڑھنے میں تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ سب سے بڑا بھائی کون تھا ؟

بعض نے سب سے بڑے بھائی کا نام " روبین " (روبیل) لکھا ہے ۔ بعض نے " شمعون " کو سب سے بڑا بھائی سمجھا ہے ۔ بعض نے اس کا نام "یہودا" بیان کیا ہے ۔

نیز اس لحاظ سے بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہاں بڑا ہونے سے مراد عمر میں بڑا ہے یا عقل و فہم کے لحاظ سے بڑا ہے ۔ البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ یہاں سن و سال میں بڑا ہونا مراد ہے ۔

۲۔ موجود قرائن کی بنیاد پر فیصلہ :

اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اقرار اور گواہ نہ ہوں تو قاضی قطعی قرائن پر عمل کر سکتا ہے کیونکہ برادرانِ یوسف (علیہ السلام) کے اس واقعے میں نہ گواہ تھے اور نہ اقرار۔ صرف بنیامین کے بارے میں بادشاہ کے پیمانے کا کامل جانا اس کے مجرم ہونے کی دلیل شمار کیا گیا ۔

نیز ان میں سے ہر ایک ذاتی طور پر اپنے بار کو پر کرتا تھا یا کم از کم پر کرتے وقت وہاں حاضر ہوتا تھا اور اگر تالا لگانا ہوتا یا بند کرنا ہوتا تو چابی وغیرہ بھی خود اسی کے قبضے میں ہوتی۔ دوسری طرف کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کار فرما ہے ۔ مزید یہ کہ کنعان کے مسافروں (برادران یوسف)کا اس شہر میں کوئی دشمن بھی نہ تھا کہ جو ان کے خلاف کوئی سازش کرتا ۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش، نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ بنیامین کے بارے میں جو بادشاہ کا پیمانہ برآمد ہوا ہے یہ خود اس کا ذاتی کام ہے ۔

دور حاضر میں ایسی ہی بنیادوں پر فیصلے کئے جاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں فقہِ اسلامی میں مزید جستجو اور تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ یہ امر موجودہ زمانے میں عدالتی بحثوں میں بہت مؤثر ہے ۔ کتاب القضاء میں اس سلسلے میں بحث کی جانا چاہئیے ۔

۳۔ برادران یوسف (علیہ السلام) میں فرق :

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ برادران یوسف (علیہ السلام) میں عزم و ہمت کے لحاظ سے بہت فرق تھا ۔ سب سے بڑا بھائی اپنے وعدہ کا بہت سختی سے پابند تھا جب کہ دوسرے بھائیوں نے جب دیکھا کہ عزیز مصر سے ان کی گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو انہوں نے بس اسی پر اپنے آپ کو معذور سمجھا اور مزید کوشش نہ کی البتہ حق بڑے بھائی کے ساتھ تھا کیونکہ وہ مصر ہی میں ٹھہر گیا تھا خصوصاً عزیز مصر کے دربار کے نزدیک اس نے پڑاؤ ڈال لیا ۔ اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ لطف و مہربانی کرے اور ایک پیمانے کی وجہ سے جو آخر کار مل گیا تھا اور ایک مسافر اس سے داغ دار بھی ہو گیا تھا ، اب اس کے بدلے بھائیوں اور اس کے بوڑھے باپ کو سزا نہ دے ۔ اسی احتمال کی بناء پر وہ مصر میں ٹھہر گیا اور بھائیوں کو باپ کا حکم معلوم کرنے کے لئے باپ کی خدمت میں روانہ کردیا تاکہ وہ جا کر سارا واقعہ بیان کریں ۔

آیات ۸۶،۸۵،۸۴،۸۳

۸۳۔ ﴿قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللهُ أَنْ يَأْتِيَنِى بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾۔

۸۴۔ ﴿وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاأَسَفَى عَلَى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ﴾۔

۸۵۔ ﴿قَالُوا تَاللهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنْ الْهَالِكِينَ﴾۔

۸۶۔ ﴿قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّى وَحُزْنِى إِلَى اللهِ وَأَعْلَمُ مِنْ اللهِ مَا لاَتَعْلَمُونَ﴾ ۔

ترجمہ

۸۳۔(یعقوب (علیہ السلام﴾نے کہا: نفس (اور ہوا و ہوس) نے معاملہ تمہاری نگاہ میں اس طرح سے مزین کردیا ہے ۔ میں صبر کروں گا ، صبر جمیل (کہ جس میں کفران نہ ہو)،مجھے امید ہے کہ خدا ان سب کو میری طرف پلٹادے گا کیونکہ وہ علیم و حکیم ہے ۔

۸۴۔ اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا: ہائےیوسف (علیہ السلام) ۔ اور اس کی آنکھیں غم اندوہ سے سفید ہوگئیں لیکن وہ اپنا غصہ پی جاتا (اورہر گز ناشکری نہ کرتا) ۔

۸۵۔ انہوں نے کہا : بخدا ! تویوسف (علیہ السلام) کو اس قدر یاد کرتا ہے کہ تو موت کے قریب جاپہنچے گا یا ہلاک ہو جائے گا ۔

۸۶۔ اس نے کہا: میں اپنا درد و غم صرف خدا سے کہتا ہوں (اور اس کے ہاں شکایت کرتا ہوں) اور میں خدا کی طرف سے ایسی چیزین جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے ۔

میں وہ الطاف الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

بھائی مصر سے چل پڑے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑ آئے اور پریشان و غم و زدہ کنعان پہنچے ۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اس سفر سے واپسی پر باپ نے جب گزشتہ سفر کے بر عکس غم و اندوہ کے آثار ان کے چہروں پر دیکھے تو سمجھ گئے کہ کوئی ناگوار خبر لائیں ہیں خصوصاًجبکہ بنیامین اور سب سے بڑا بھائی ان کے ہمراہ نہ تھا ۔جب بھائیوں نے بغیر کسی کمی بیشی کے ساری آپ بیتی کہہ دی تو یعقوب (علیہ السلام)بہت حیران ہوئے اور ان کی طرف رخ کرکے ”کہنے لگے : تمہاری نفسانی خواہشات کا یہ معاملہ تمہارے سامنے اس طرح سے پیش کیا ہے اور اسے اس طرح سے مزین کیا ہے“﴿قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْراً﴾۔

یعنی بالکل وہی جملہ کہا جو انہوں نے حادثہ یوسف (علیہ السلام) کے بعد کہا تھا جب کہ انہوں نے وہ جھوٹا واقعہ بیان کیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے ان کے سابقہ کردار ہی کے باعث ان کے بارے میں سوء ظن کیا اوریقین کرلیا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس میں کوئی سازش ہے حالانکہ ایسا کرنا نہ صرف یعقوب (علیہ السلام) جیسے پیغمبر سے بعید معلوم ہوتا ہے بلکہ عام لوگوں سے بھی بعید ہے کہ کسی کو صرف اس کے کسی سابقہ برے کردار کی وجہ سے یقینی طور پر متہم کریں جبکہ دوسری طرف گواہ بھی ہوں اور تحقیق کا راستہ بھی بند نہ ہو۔

یا پھر۔کیا اس جملہ کا مقصد ایک اور نکتہ بیان کرنا ہے جس کے یہ پہلو ہیں:

۱۔ تم فقط بادشاہ کا پیمانہ بھائی کے بارے میں دیکھ کر کیوں مان گئے کہ اس نے چوری کی ہے جب کہ تنہا یہ بات منطقی دلیل نہیں بن سکتی۔

۲۔ تم نے عزیز مصر سے کیوں کہا کہ طور کی یہ سزا ہے کہ اسے غلام بنا لو حالانکہ یہ کوئی خدائی قانون نہیں بلکہ کنعان کے لوگوں کی ایک غلط رسم ہے

(یہ بات اس صورت میں درست ہے جب بعض مفسرین کے قول کے خلاف اس قانون کو شریعت ِیعقوب کا حصہ نہ سمجھا جائے)۔

۳۔ اس واقعہ کے بعد تم فوراً کیوں چل پڑے اور برے بھائی کی طرح قیام کیوں نہیں کیا جبکہ تم میرے ساتھ پکا خدائی وعدہ کرچکے تھے۔ (۱)

اس کے بعد یعقوب (علیہ السلام) اپنی جانب متوجہ ہوئے اور "کہنے لگے کہ میں صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا اور اچھا صبر کروں گا کہ جو کفران نعمت سے خالی ہو ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾۔

مجھے امید ہے کہ خدا ان سب جو (یوسف (علیہ السلام)، بنیامین اور میرے بڑے بیٹے کو) میری طرف پلٹا دے گا ﴿عَسَى اللهُ أَنْ يَأْتِيَنِى بِهِمْ جَمِيعًا﴾۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ " وہ ان سب کے دل کو داخلی کیفیات سے باخبر ہے، علاوہ ازیں وہ حکیم بھی ہے اور وہ کوئی کام بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں کرتا" ﴿إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾۔

اس وقت یعقوب (علیہ السلام) رنج و غم میں ڈوب گئے۔ بنیامین کہ جو ان کے دل کی ڈھارس تھا واپس نہ آیا تو انہیں پیارے یوسف (علیہ السلام) کی یاد آگئی۔ انہیں خیال آیا کہ اے کاش آج وہ آبرومند، باایمان، باہوش اور حسین و جمیل

بیٹا ان کی آغوش میں ہوتا اور اس کی پیاری خوشبو ہر لحہ باپ کو ایک حیاتِ نو بخشتی لیکن آج نہ صرف یہ کہ اس کا نام و نشان نہیں بلکہ اس کا جانشین بنیامین بھی اس کے طرح ایک دردناک معالے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ " اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے رخ پھیر لیا اور کہا: ہائے یوسف (علیہ السلام) ﴿وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاأَسَفَى عَلَى يُوسُفَ﴾ بھائی کہ پہلے جو بنیامین کے ماجرے پر باپ کے سامنے شرمندہ تھے یوسف کا نام سن کر فکر میں ڈوب گئے۔ ان کے ماتھے پر عرقِ ندامت کے قطرے چمکنے لگے۔

حزن و ملال اتنا بڑھا کہ یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا سیلاب بہہ کر یہاں تک کہ " اس کی آنکھیں دردو غم سے سفید اور نابینا ہو گئیں ﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾۔

لیکن اس کے باوجود کوشش کرتے تھے کہ ضبط کریں اور اپنا غم و غصہ پی جائیں اور رضائے حق کے خلاف کوئی بات نہ کہیں " وہ باحوصلہ اور جواں مرد تھے اور انہیں اپنے غصے پر پورا کنٹرول تھا " ﴿فَهُوَ كَظِيمٌ﴾۔

ظاہر آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) اس وقت تک نابینا نہیں ہوئے تھے لیکن اب جب کہ رنج و غم کئی گنا بڑھ گیا اور آپ مسلسل گریہ و زاری کرتے رہے اور آپ کے آنسو تھمنے نہ پاتے تھے تو آپ کی بینائی ختم ہو گئی اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کوئی اختیاری چیز نہ تھی کہ جو صبر و جمیل کے منافی ہو۔ [۲]

بھائی کہ جو ان تمام واقعات سے بہت پریشان تھے، ایک طرف تو ان کا ضمیر حضرت یوسف (علیہ السلام) کے واقعے کی بناء پر انہیں عذاب دیتا اور دوسری طرف وہ بنیامین کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک نئے امتحان کی چوکھٹ پر پاتے اور تیسری طرف باپ کا اتنا غم اور دکھ ان پر بہت گراں تھا لہٰذا انہوں نے پریشانی اور بے حوصلگی کے ساتھ باپ سے "کہا: بخدا تو اتنا یوسف یوسف کرتا ہے کہ بیمار ہو جائے گا اور موت کے کنارے پہنچ جائے گا یا ہلاک ہو جائے گا ﴿قَالُوا تَاللهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنْ الْهَالِكِينَ﴾۔ [۳]

لیکن کنعان کے اس مرد بزرگ اور روشن ضمیر پیغمبر نے ان کے جواب میں کہا:

میں تمہارے سامنے اپنی شکایت پیش نہیں کی جو اس طرح کی باتیں کرتے وہ میں اپنا درد و غم بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہوں اور اس کے ہاں اپنی شکایت پیش کرتا ہوں " ﴿قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللهِ﴾۔ [۴]

اور اپنے خدا کی طرف سے مجھے ایسے الطاف و عنایات حاصل ہیں او رایسی چیزیں مجھے معلوم ہیں کہ جن سے تم بے خبر ہو ﴿وَأَعْلَمُ مِنْ اللهِ مَا لاَتَعْلَمُونَ﴾)

۱۔ یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعہ یوسف (علیہ السلام) کی طرف اشارہ ہے ، بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یوسف کو ماں باپ سے جدا کرنے کا معاملہ مندرجہ بالا آیات میں بالکل نہیں آیا ہے ۔

۲۔ مزید وضاحت کے لئے اس سورہ کی آیہ ۱۸ کی تفسیر ملاحظہ کیجئے ۔

۳۔ "بث" کا معنی ہے پراکندگی اور ایسی چیز جسے چھپایا نہ جاسکے او ریہاں واضح غم و اندوہ اور دل کی نمایاں پراکندگی کے معنی میں ہے ۔

۴۔ "حرض" (بروزن "مرض")فاسد اور پریشان کرنے والی چیز کے معنی میں ہے ۔یہاں اس کا معنی ہے بیمار، نحیف ، لاغر اور قریب المرگ۔

آیات ۸۷،۸۸،۸۹،۹۰،۹۱،۹۲،۹۳

۸۷۔ ﴿يَابَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلاَتَيْئَسُوا مِنْ رَوْحِ اللهِ إِنَّهُ لاَيَيْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللهِ إِلاَّ الْقَوْمُ الكَافِرُونَ﴾ ۔

۸۸۔ ﴿فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَاأَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِينَ﴾ ۔

۸۹۔ ﴿قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ﴾۔

۹۰۔﴿ قَالُوا أَئِنَّکَ لَأَنْتَ يُوسُفُ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهذَا أَخِى قَدْ مَنَّ اللهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللهَ لاَيُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

۹۱۔ ﴿قَالُوا تَاللهِ لَقَدْ آثَرَکَ اللهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ﴾ ۔

۹۲۔ ﴿قَالَ لاَتَثْرِيبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ ۔

۹۳۔ ﴿اذْهَبُوا بِقَمِيصِى هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِى يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِى بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔

ترجمہ

۸۷۔ اے میرے بیٹو! جاؤ اوریوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ خدا کی رحمت سے کافر کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا ۔

۸۸۔ جب وہ اس (یوسف) کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا : اے عزیز! ہم اور ہمارا خاندان پریشانی میں گھر گیا ہے اور ہم (اناج خریدنے کے لئے) تھوڑی سی پونجی اپنے ساتھ لائے ہیں ۔ ہمارا پیمانہ پوری طرح بھر دے اور ہم پر صدقہ کردے کیونکہ خدا صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے ۔

۸۹۔ اس نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم جاہل تھے ۔

۹۰۔ انہوں نے کہا: کیا تو وہی یوسف (علیہ السلام) ہے ۔ اس نے کہا : (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے خدا نے ہم پر احسان کیا ہے ۔ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر و استقامت دکھائے (آخر کار وہ کامیاب ہوتا ہے) کیونکہ خدا نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ۔

۹۱۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! تجھے ہم پر مقدم رکھا اور ہم خطا کار تھے۔

۹۲۔ اس نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں ہے، خدا تمہیں بخشنے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

۹۳۔ یہ میری قمیص لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جائے گا اور تمام گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔

کوشش کرو اور مایوس نہ ہو

مصر اور اطرافِ مصر جس میں کنعان بھی شامل تھا میں قحط ظلم ڈھا رہا تھا۔ اناج بالکل ختم ہو گیا تو حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے دوبارہ اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف جانے اور غلہ حاصل کرنے کا حکم دیا لیکن اس مرتبہ اپنی آرزوؤں کی بنیاد پھر یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی بنیامین کی تلاش کو قرار دیا اور کہا: "میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کو تلاش کرو" ﴿یَابَنِیَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ یُوسُفَ وَأَخِیه﴾۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے چونکہ اس بارے میں تقریباً مطمئن تھے کہ یوسف (علیہ السلام) موجود ہی نہیں اس لئے وہ باپ کی اس نصیحت اور تاکید پر تعجب کرتے تھے۔

یعقوب ان کے گوش گزار کرتے رہے تھے: "رحمت الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہونا" کیونکہ اس کی قدرت تمام مشکلوں اور سختیوں سے مافوق ہے ﴿وَلاَتَیْئَسُوا مِنْ رَوْحِ اللهِ﴾۔ کیونکہ صرف بے ایمان کافر کہ جو قدرتِ خدا سے بے خبر ہیں اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں ﴿إِنَّهُ لاَیَیْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللهِ إِلاَّ الْقَوْمُ الْکَافِرُونَ﴾۔

"تحسس" مادہ "حس" سے ہے اور یہ قوت حس کے ذریعے کسی چیز کی جستجو اور تلاش کے معنی میں ہے۔ اور یہ کہ "تجسس" میں اور اس میں کیا فرق ہے، اس سلسلے میں مفسرین اور اربابِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔

ابنِ عباس سے منقول ہے کہ "تحسس" امور خیر میں ہے اور "تجسس" امور شر میں۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ "تحسس" افراد اقوام کی سرگزشت جاننے کے لئے کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور "تجسس" عیوب و نقائص کی جستجو کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض دیگر احباب نے دونوں سے ایک ہی معنی مراد لیا ہے۔

لیکن اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس میں فرمایا گیا ہے: لاتجسسوا ولا تحسسوا

. واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں ۔ نیز ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں ، زیر بحث آیت کے معنی میں ، ابن عباس کا نظریہ مناسب معلوم ہوتا ہے او راگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں دونوں سے منع کیا گیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کے کاموں او رمعاملات کی ٹوہ میں نہ رہو نہ ان کے اچھے کاموں کی ٹوہ میں اور نہ ہی برے کاموں کی ٹوہ میں ۔

"روح" رحمت" راحت ، سہولت اور کشائش ِکار کے معنی میں ہے ۔ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ "روح" (بر وزنِ "لوح") اور "روح" (بروزن "نوح")دونوں کا اصل میں ایک ہی معنی ہے اور یہ "جان" اور تنفس" کے معنی میں ہیں ۔بعد ازاں "روح" (بروزن "لوح" رحمت اور کشائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا (اس بناء پر کہ ہمیشہ مشکلات ٹل جانے پر انسان نئی روح اور جان پاتا ہے اور آزاری کا سانس لیتا ہے) ۔

بہر حال فرزندان یعقوب (علیہ السلام) نے اپنامال و اسباب باندھا اور مصر کی طرف چل پڑے اور اب کے وہ تیسری مرتبہ داستانوں سے معمو راس سرزمین پ رپہنچے ۔ گزشتہ سفروں کے برخلاف اس سفر میں ان کی روح کو ایک احساس ِندامت کچوکے لگا رہا تھا کیونکہ مصر میں اور عزیز مصر کے نزدیک ان کا سابقہ کردار بہت برا تھا اور وہ بدنام ہو چکے تھے اور اندازہ تھا شاید بعض لوگ انہیں "کنعان کے چور" کے عنوان سے پہچانیں ۔ دوسری طرف ان کے پاس گندم اوردوسرے اناج کی قیمت دینے کے لئے درکار مال و متاع موجود نہیں تھا اور ساتھ ہی بھائی بنیامین کے کھو جانے اورباپ کی انتہائی پریشانی نے ان کی مشکلات میں اضافہ کردیا تھا ۔ گویا تلوار ان کے حلقوم تک پہنچ گئی تھی ۔ بہت ساری مشکلات اور روح فرسا پریشانیوں نے انہیں گھیر لیا تھا ۔ ایسے میں جو چیز ان کی تسکین ِقلب کا باعث تھی وہ صرف باپ کا آخری جملہ تھا کہ جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اس کے لئے ہر مشکل آساں ہے ۔ اس عالم میں " وہ یوسف (علیہ السلام) (علیہ السلام) کے پاس پہنچے اور اس وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں انہوں نے اس کی طرف رخ کیا اور کہا: اے عزیز! ہمیں او رہمارے خاندان کو قحط، پریشانی اور مصیبت نے گھیر لیا ہے " ﴿فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَاأَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُ﴾ ۔" اور ہمارے پاس صرف تھوڑی سی کم قیمت پونجی ہے " ﴿وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ﴾ ۔[۱]

لیکن پھر بھی ہمیں تیرے کرم اور شفقت پر بھروسہ ہے " اور ہمیں توقع ہے کہ تو ہمارا پیمانہ بالکل پورا کرے گا " ﴿فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ﴾ ۔" اور اس معاملے میں ہم پر احسان کرتے ہوئے صدقہ کر" ﴿وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا﴾ ۔

اور اپنا اجر و ثواب ہم نے لے بلکہ اپنے خدا سے لے کیونکہ خدا کریموں اور صدقہ کرنے والوں کو اجر خیر دیتا ہے ﴿إِنَّ اللهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ﴾۔

یہ قابل توجہ ہے کہ برادران یوسف (علیہ السلام) کو باپ نے تاکید کی تھی کہ پہلے یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کے لئے جستجو کریں اور بعد میں اناج حاصل کریں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس بات کی طرف چنداں توجہ نہیں کی اور سب سے پہلے انہوں نے عزیز مصر سے اناج کا تقاضہ کیا ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں یوسف (علیہ السلام) کے ملنے کی چنداں امید نہ تھی یا ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ بہتر ہے کہ اپنے کو اناج کے خریداروں کے طور پر پیش کریں جو کہ زیادہ طبعی اور فطری ہے اور بھائی کی آزادی کا تقاضا ضمناً رہنے دیں تا کہ یہ چیز عزیز مصر پر زیادہ اثر انداز ہو۔

بعض نے کہا کہ "تصدق علینا" سے مراد وہی بھائی کی آزادی ہے ورنہ وہ اناج بغیر معاوضے کے حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسے "تصدق" قرار دیا جاتا ۔

روایات میں بھی ہے کہ بھائی باپ کی طرف سے عزیز مصر کے نام ایک خط لے کر آئے تھے اس خط میں حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے عزیز مصر کے عدل و انصاف کا تذکرہ کیا ۔ اپنے خاندان سے اس کی محبتوں اور شفقتوں کی تعریف کی ۔ پھر اپنا اور پانے خاندان نبوت کا تعارف کروایا ۔ اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس کے ضمن میں اپنے بیٹے یوسف (علیہ السلام) اور دوسرے بیٹے بنیامین کے کھو جانے اور خشک سالی سے پیدا ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا ۔ خط کے آخر میں اس سے خواہش کی گئی تھی کہ بنیامین کو آزاد کر دے اور تاکید کی تھی کہ ہمارے خاندان میں چوری وغیرہ ہر گز نہ تھی اور نہ ہوگی ۔

جب بھائیوں نے باپ کا خط عزیز مصر کو دیا تو انہوں نے اسے لے کر چوما او راپنی آنکھوں پر رکھا اور رونے لگے ۔ گریہ کا عالم یہ تھا کہ قطرات اشک انکے پیراہن پر گرنے لگے ۔ (۲)

(یہ دیکھ کر بھائی حیرت و فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ عزیز مصر کو ان کے باپ سے کیا لگاؤ ہے ۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کے باپ کے خط نے اس میں ہیجان و اضطراب کیوں پیدا کر دیا ہے اور شاید اسی موقع پر ان کے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح اترا ہو کہ ہو نہ ہو یہی یوسف (علیہ السلام) ہو اور شاید باپ کے اسی خط کی وجہ سے یوسف (علیہ السلام) اس قدر بیقرار ہو گئے کہ اب مزید اپنے آپ کو عزیز مصر کے نقاب میں نہ چھپا سکے او رجیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بہت جلد بھائیوں سے بھائی کی حیثیت سے اپنا تعارف کروادیا) ۔

اس موقع پر جبکہ دور آزمائش ختم ہورہا تھا اوریوسف (علیہ السلام) بھی بیتاب اور پرشان نظر آرہے تھے تعارف کے لئے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھائیوں کی طرف رخ کرکے آپ نے ”کہا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم جاہل و نادان تھے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا﴿قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ﴾

۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کی عظمت اور شفقت ملاحظہ ملاحظہ کیجئے کہ اولاً تو ان کا گناہ مجمل طورپر بیان کیا اور کہا: ”مافعلتم“ (جو کچھ تم نے انجام دیا ہے اور اب تم عاقل اور سمجھدار ہو۔

ضمناً اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں انہوں نے صرف یوسف (علیہ السلام) پر ظلم نہیں ڈھایا تھا بلکہ بنیامین بھی اس دور میں ان کے شر سے محفوظ نہیں تھے اور انہوں نے اس کے لئے بھی اس زمانے میں مشکلات پیدا کی تھیں ۔ جب بنیامین مصر میں یوسف (علیہ السلام) کے پاس تھے شاید ان دنوں میں انہوں نے ان کی کچھ بے انصافیاں اپنے بھائی کو بتائی ہوں ۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ عزیز مصر ہم سے انتقام لینے والا ہے یوسف (علیہ السلام) نے اپنی گفتگو کو ایک تبسم کے ساتھ ختم کیا ۔ اس تبسم کی وجہ سے بھائیوں کو حضرت یوسف (علیہ السلام) کے خوبصورت دانت پوری طرح نظر آگئے ۔ جب انہوں نے خوب غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ دانت ان کے بھائی یوسف (علیہ السلام) سے عجیب مشابہت رکھتے ہیں ۔ (۳)

اس طرح بہت سے پہلو جمع ہو گئے ۔ ایک طرف تو انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں اور اس پر بھائیوں کی طرف سے کئے گئے مظالم کے بارے میں گفتگو کررہا ہے جنہیں سوائے ان کے اوریوسف (علیہ السلام) کے کوئی نہیں جانتا تھا ۔دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ یعقوب (علیہ السلام) کے خط نے اس قدر مضطرب کردیا ہے جیسے اس کا یعقوب (علیہ السلام) سے کوئی بہت ہی قریبی تعلق ہو۔

تیسری طرف وہ اس کے چہرے مہرے پر جتنا غور کرتے انہیں اپنے بھائی یو سف (علیہ السلام) سے بہت زیادہ مشابہت دکھائی دیتی ۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یوسف (علیہ السلام) عزیز مصر کی مسند پر پہنچ گیا ہو ۔ وہ سوچتے کہ یوسف (علیہ السلام) کہا اور یہ مقام کہاں ؟

لہٰذا انہوں نے شک و تردد کے لہجے میں ”کہا: کیا تم خوف یوسف (علیہ السلام) تو نہیں ﴿قَالُوا أَئِنَّکَ لَأَنْتَ یُوسُفُ﴾۔
یہ موقع بھائیوں پر بہت زیادہ حساس لمحات گزرا۔ کیونکہ صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ عزیز مصر کے سوال کے جواب میں کیا کہے گا۔ کیا سچ مچ وہ پردہ ہٹا دے گا اور اپنا تعارف کروائے گا یا انہیں دیوانہ اور بے وقوف سمجھ کر خطاب کرے گا کہ انہوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی ہے۔

گھڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں انتظار کے روح فرسا لمحے ان کے دل کو بوجھل کر رہے تھے لیکن حضرت یوسف (علیہ السلام) نے نہ چاہا کہ یہ زمانہ طویل ہو جائے۔ اچانک انہوں نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا اور ”کہا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے“ ﴿قَالَ أَنَا یُوسُفُ وَهٰذَا أَخِي﴾۔ لیکن اس بناء پر کہ وہ خدا کی نعمت پر شکر ادا کریں کہ جس نے یہ سب نعمات عطا فرمائی تھیں اور ساتھ ہی بھائیوں کو بھی ایک عظیم درس دیں انہوں نے مزید کہا: خدا نے ہم پر احسان کیا ہے جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرے گا خدا اسے اس کا اجر و ثواب دے گا کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا“ ﴿قَدْ مَنَّ اللهُ عَلَیْنَا إِنَّهُ مَنْ یَتَّقِ وَیَصْبِرْ فَإِنَّ اللهَ لاَیُضِیعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِینَ﴾۔

کسی کو معلوم نہیں کہ ان حساس لمحات میں کیا گزری اور جب دسیوں سال بعد بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تو کیسا شور و غوغا بپا کیا، وہ کس طرح آپس میں بغل گیر ہوئے اور کس طرح سے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امڈ پڑے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھائی اپنے آپ میں شرمندہ تھے۔ وہ یوسف (علیہ السلام) کے چہرے کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں ان کا عظیم گناہ بخشش و عفو کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا انہوں نے بھائی کی طرف رخ کیا اور کہا: خدا کی قسم: اللہ نے تجھے ہم پر مقدم کیا ہے اور تجھے ترجیح دی ہے اور علم حلم اور عقل و حکومت کے لحاظ سے تجھے فضیلت بخشی ہے ﴿قَالُوا تَاللهِ لَقَدْ آثَرَکَ اللهُ عَلَیْنَا﴾۔ [۴]

یقینا ہم خطاکار اور گناہ گار تھے ﴿وَإِنْ کُنَّا لَخَاطِئِینَ﴾۔ [۵]

لیکن یوسف (علیہ السلام) نہیں چاہتے تھے کہ بھائی اس طرح شرمسار رہیں خصوصاً جب کہ یہ ان کی اپنی کامیابی و کامرانی کا موقع تھا یا یہ کہ احتمالاً بھائیوں کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ یوسف (علیہ السلام) اس موقع پر انتقام لے گا لہٰذا

فوراً یہ کہہ کر انہیں مطمئن اور پر سکون کردیا کہ "آج تمہیں کوئی سرزنش اور توبیخ نہیں ہو گی" ﴿قَالَ لاَتَثْرِيبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ﴾۔[۶] تمہاری فکر آسودہ رہے اور وجدان کو راحت رہے اور گذشتہ گناہوں پر غم نہ کرو۔

اس بناء پر کہ انہیں بتایا جائے کہ انہیں نہ صرف یوسف (علیہ السلام) کا حق بخش دیا گیا ہے بلکہ ان کی ندامت و پشمانی کی وجہ سے اس سلسلے میں خدائی حق بھی قابل بخشش ہے، مزید کہا: اللہ بھی تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ ارحم المراحمین ہے ﴿يَغْفِرُ اللهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾۔

یہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی انتہائی عظمت کی دلیل ہے کہ نہ صرف اپنا حق معاف کردیا بلکہ اس بات پر بھی تیار نہ ہوئے کہ انہیں تھوڑی سی بھی سرزنش کی جائے چہ جائیکہ ،بھائیوں کو کوئی سزا دیتے بلکہ حق الٰہی کے لحاظ سے بھی انہیں اطمینان دلایا کہ خدا غفور اور بخشنے والا ہے بلکہ یہ بات ثابت کرنے کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ وہ ارحم الراحمین ہے۔

اس موقع پر بھائیوں کو ایک اور غم بھی ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ باپ اپنے بیٹوں کے غم میں نابینا ہوچکا تھا اور اس کا اس طرح رہنا پورے خاندان کے لئے ایک جانکاہ رنج ہے علاوہ ازیں ان کے جرم پر ایک مسلسل دلیل ہے۔ لہٰذا یوسف (علیہ السلام) نے اس عظیم مشکل کے حل کے لئے بھی فرمایا: "میرا یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تاکہ وہ بینا ہو جائے" ﴿اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا﴾۔"اس کے بعد سارے خاندان کے ہمراہ میرے پاس آجاؤ" ﴿وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔

۱۔بضاعت ۔ بضع کے مادہ سے ہے بروزن جزء

۲۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ "تثریب" اصل میں "ثرب" (بروزن "سرد") کے مادہ سے ہے "ثرب" در اصل چربی کی اس نازک اور پتلی جھلی کو کہتے ہیں جس نے معدے اور آنتوں کو چھپا رکھا ہوتا ہے اور "تثریب" اسے الگ کردینے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ سرزنش و ملامت کے معنی میں استعمال ہونے لگا گویا اس کام سے گناہ کا پردہ دوسرے کے چہرے سے دور کردیا جاتا ہے (قاموس، مفردات راغب، تفسیر فخررازی اور روح المعانی کی طرف رجوع فرمائیں)۔

۴۔ "اٰثرک" ایثار کے مادہ سے ہے.

۵۔ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ "خاطی" اور "مخطی" کے درمیان فرق یہ ہے کہ "خاطی" اس شخص کو کہتے ہیں جو جان بوجھ کر برے کام کرے اور "مخطی" اسے کہتے ہیں جو غلطی سے غلط کام کرے بیٹھے۔ ۶۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

چند اہم نکات

۱۔یوسف (علیہ السلام) کی قمیص کون لے کرگیا ؟

چند ایک روایات میں آیا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کہا :

میرا شفا بخش کرتہ باپ کے پاس وہی لے کر جائے جو خون آلودہ کرتہ لے کر گیا تھا تاکہ جیسے اس نے باپ کو تکلیف پہنچائی اورپریشان کیا تھا اب کے اسے خوش و خرم کرے ۔

لہٰذا یہ کام "یہودا" کے سپرد ہوا کیونکہ اس نے بتا تھا کہ وہ میں ہو جو خون آلودہ کرتہ لے کرباپ کے پاس گیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو بھیڑیا کھا گیا ہے ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ یوسف (علیہ السلام) اس قدر مشکلات او رمصائب میں گرفتار رہے لیکن اخلاقی مسائل کی باریکی سے غافل نہیں رہتے تھے ۔

۲۔یوسف (علیہ السلام) کی عظمت :

بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ اس ماجرے کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائی ہمیشہ شرمسار رہتے تھے ۔ انہوں نے کسی کو یوسف (علیہ السلام) کے پاس بھیجا او رکہلایا کہ آپ ہر صبح و شام ہمیں دستر خوان پر بٹھا تے ہیں اور آپ کا چہرہ دیکھ کر ہمیں شرم و خجالت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہم نے آپ کے ساتھ اس قدر جسارتیں کی ہیں ۔

اس بناء پر کہ انہیں نہ صرف احساس شرمندگی نہ ہو بلکہ یوسف (علیہ السلام) کے دستر خوان پر ان کی موجودگی کو یوسف (علیہ السلام) کی ایک خدمت محسوس کریں ، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے انہیں بہت ہی عمدہ جواب دیا ۔ آپ نے کہا: مصر کے لوگ اب تک مجھے ایک زر خرید غلام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے :

سبحان من بلغ عبداً بیع بعشرین درھماً مابلغ

پاک ہے وہ ذات جس نے اس غلام کو کہ جو بیس درہم میں بیچا گیا اس مقام تک پہنچا یا ۔

لیکن اب جب کہ تم لوگ آگئے ہو اور میری زندگی کی کتاب ان کے سامنے کھل گئی ہے تو وہ سمجھنے لگے کہ غلام نہیں تھا بلکہ میں خاندان نبوت سے تعلق رکھتا ہوں اور ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں سے ہوں اور یہ میرے لئے باعث ِ افتخار ہے ۔[۱]۔

۳۔ کامیابی کا شکرانہ:

مندرجہ بالا آیات میں یہ اہم اخلاقی درس اور واضح ترین اسلامی حکم موجود ہے کہ دشمن پر کامیابی کے وقت انتقام جو اور کینہ پرور نہ بنو۔

یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے انہیں نہایت سخت صدمے پہنچائے تھے اور انہیں موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا ۔ اگر لطف الٰہی شامل حال نہ ہوتا تو بچ جانا ان کے لئے ممکن نہ تھا صرف یہی نہیں کہ انہوں نےیوسف (علیہ السلام) کو تکلیف پہنچائی تھی بلکہ ان کے والد کو بھی سخت مصیبت میں بتلا کردیا تھا لیکن اب جب کہ وہ سب کے سب زار و نزار یوسف (علیہ السلام) کے سامنے تھے اوریوسف (علیہ السلام) کے پاس پوری قدرت و طاقت بھی تھی مگر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی گفتگو سے اور ان کے کلمات کے اندر جھانکنے سے اچھی طرح محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں نہ صرف یہ کہ کوئی کینہ موجود نہیں تھا بلکہ انہیں اس بات سے تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے بھائی گزشتہ واقعے کو یاد کریں اور پریشان و غمزدہ ہوں اور شرمندگی محسوس کریں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ احساس ان کی روح سے نکال دیں ۔یہاں تک کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں یقین دلائیں کہ ان کا مصر میں آنا اس لحاظ سے باعث افتخار ہے کہ خود حضرت یوسف(علیہ السلام) کے بارے میں مزید آگاہی کا سبب بنا ہے اور لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ وہ خاندان رسالت میں سے ہیں نہ کہ ایک کنعانی غلام ہیں کہ جسے چند درہموں میں بیچا گیا ہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ بھائی اس طرح محسوس کریں کہ نہ صرف یہ کہ میں ان پر احسان نہیں کررہا بلکہ وہ مجھ پر احسان کررہے ہیں۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ پیغمبر اسلام کو ایسے ہیں حالات میں پیش آئے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ کو خونخوار دشمنوں یعنی شرک و بت پرستی کے سرغنوں پر کامیابی حاصل ہوئی تو ابن عباس کے بقول آپ خانہ کعبہ کے پاس تشریف لائے ۔ اس وقت مخالفین کعبہ میں پناہ لے چکے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر اسلام ان کے بارے میں کیا حکم صادر کرتے ہیں ۔ ایسے میں آپ نے کعبہ کے کنڈے کو پکڑ کر فرمایا:الحمد للہ الذی صدق وعدہ و نصرعبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ

شکر ہے خدا کا کہ جس کا وعدہ پورا ہوا اور اس نے اپنے بندے کو کامیاب کیا اور دشمنون کے گروہوں کو شکست دی ۔ اس کے بعد آپ (علیہ السلام) نے لوگوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا :ماذا تظنون معشر قریش

اے قریش والو! کیا گمان ہے کہ میں تمہارے بارے میں حکم دوں گا۔

قالوا خیراً ، اخ کریم ، و ابن اخ کریم و قد قدرت

انہوں نے جواب دیا: ہم تجھ سے خیر و نیکی کے علاوہ کوئی توقع نہیں رکھتے۔ آپ کریم و شریف بھائی ہیں اور کریم و بزرگوار بھائی کے بیٹے ہیں اور اس وقت قدرت و طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

قال و انا اقول کما قال اخی یوسف : لاتثریب علیکم الیوم

اس پر پیغمبر اکرم نے فرمایا: میں تمہارے بارے میں وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں کے کے بارے میں کامیابی کے وقت کہا تھا "لاتثریب علیکم الیوم"۔ یعنی۔ آج تمہارے لئے روز ملامت و سر زنش نہیں ہے۔

عمر کہتے ہیں:

اس موقع پر میرے چہرے پر شرم و حیا سے پسینہ آگیا کیونکہ میں نے مکہ میں داخل ہوتے وقت ان سے کہا تھا: آج کے دن میں تم سے انتقام لوں گا۔ جب پیغمبر نے وہ جملہ فرمایا تو مجھے اپنی گفتگو پر شرم آئی۔[۲]

روایات اسلامی میں بھی بارہا یہ آیا ہے کہ:

کامیابی کی زکات عفو و بخشش ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا قدرت علی عدوک فاجعل العفو عنه شکراً للقدرة علیه۔

جس وقت تو اپنے دشمن پر کامیاب ہو جائے تو عفو بخشش کو اپنی کامیابی کا شکرانہ قرار دے۔[۳]

۱۔ تفسیر فخر رازی جلد ۱۸ ص ۲۰۶۔

۲۔ تفسیر قرطبی، جلد ۵ ص ۳۴۸۷۔

۳۔ نہج البلاغہ کلمات قصار۔ جملہ ۱۱۔

آیات ۹۸،۹۷،۹۶،۹۵،۹۴

۹۴۔ ﴿وَلَمَّا فَصَلَتْ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّی لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَاأَنْ تُفَنِّدُونِی﴾۔

۹۵۔ ﴿قَالُوا تَاللهِ إِنَّکَ لَفِی ضَلَالِکَ الْقَدِيمِ﴾۔

۹۶۔ ﴿فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَیوَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَکُمْ إِنِّی أَعْلَمُ مِنْ اللهِ مَا لَاتَعْلَمُونَ﴾۔

۹۷۔ ﴿قَالُوا يَاأَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا کُنَّا خَاطِئِينَ﴾۔

۹۸۔ ﴿قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّی إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾۔

ترجمہ

۹۴۔جس وقت قافلہ (س رزمین مصر سے) جدا ہوا تو ان کے باپ (یعقوب) نے کہا: اگر مجھے نادانی اور کم عقل کی نسبت نہ دو تو مجھےیوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

۹۵۔ انہوں نے کہا: بخدا تو اسی گزشتہ گمراہی میں ہے۔

۹۶۔ لیکن جب بشارت دینے والاآگیا (اور اس نے) وہ کرتہ) اس کے چہرے پرڈالا تو اچانک وہ بینا ہو گیا۔ تو اس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

۹۷۔ انہوں نے کہا ابا (جان)! خدا سے ہمارے گناہوں کی بخشش کو خواہش کریں، بے شک ہم خطا کار تھے۔

۹۸۔ اس نے کہا عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے طلب بخشش کروں گا۔ بے شک وہ غفور و رحیم ہے
۔

آخر کار لطف الٰہی اپنا کام کرے گا

فرزندان یعقوب (علیہ السلام) خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ خوشی خوشی یوسف (علیہ السلام) کا پیراہن اپنے ساتھ لے کر قافلے کے ساتھ مصر سے چل پڑے۔ ادھر بھائیوں کے لئے زندگی کے شیرین لمحات تھے ادھر شام کے علاقے کنعان میں بورھے کا گھر غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارا گھر نہ افسردہ اور غم زدہ تھا۔

لیکن۔ ادھر یہ قافلہ مصر سے چلا اور ادھر اچانک یعقوب (علیہ السلام) کے گھر میں ایک واقعی رونما ہوا جس سے سب کو تعجب میں ڈال دیا۔ یعقوب (علیہ السلام) کا جسم کانپ رہا تھا۔ انہوں نے بڑے اطمینان اور اعتماد سے پکار کر کہا: اگر تم بدگوئی نہ کرو اور میری طرف نادانی اور جھوٹ کی نسبت نہ دو تو میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پیارے یوسف (علیہ

السلام) کی خوشبو آرہی ہے، میں محسوس کررہا ہوں کہ رنج و غم اور زحمت و مشکل کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور وصال و کامیابی کا زمانہ آنے کو ہے، خاندانِ یعقوب (علیہ السلام) اب لباس ماتم اتار دے گا اور لباسِ مسرت زیب ترن کرے گا لیکن میرا خیال نہیں کہ تم ان باتوں پریقین کروگے ﴿وَلَمَّا فَصَلَتْ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلاَأَنْ تُفَنِّدُونِ﴾۔[۱]

"فصلت" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) میں یہ احساس اسی وقت پیدا ہوا جب قافلہ مصر سے چلنے لگا۔ قاعدتا حضرت یعقوب (علیہ السلام) سے کہا: آپ اسی پرانی گمراہی میں ہیں (قَالُوا تَاللهِ إِنَّکَ لَفِی ضَلاَلِکَ الْقَدِيمِ) ۔یعنی اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہوگی کہ یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو آرہی ہے، مصر کہاں اور شام کو کنعان کہاں ، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ہمیشہ خوا و خیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے خیالات و تصورات کو حقیقت سمجھتے ہیں، آپ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہیں، بہرحال آپ تو پہلے بھی اپنے بیٹوں سے کہہ چکے ہیں کہ مصر کی طرف جاؤ او رمیرے یوسف (علیہ السلام) کی تلاش کرو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ضلالت و گمراہی سے مراد عقیدے اور نظریے کی گمراہی نہیں ہے بلکہ یوسف (علیہ السلام) سے متعلق مسائل کے سمجھنے میں گمراہی مراد ہے۔

بہرکیف ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس عظیم کہنہ سال اور روشن ضمیر پیغمبر سے کیسا شدید اور جسارت آمیز سلوک کرتے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے کہا: ہمارا باپ "ضلا ل مبین "(کھلی گمراہی" میں ہے اوریہاں انہوں نے کہا: تم اپنی اسی دیرینہ گمراہی میں ہو۔

وہ پیر کنعان کے دل کی پاکیزگی اور روشنی سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا دل بھی انہی کے دل کی طرح تاریک ہے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ آئندہ کے واقعات اور دور و نزدیک کے مقامات اس کے آئینۂ دل میں منعکس ہوتے ہیں۔

کئی رات دن بیت گئے۔ یعقوب اسی طرح انتظار کہ جس کی گہرائی میں مسرو شادمانی اور سکون و اطمینان موجزن تھا حالانکہ ان کے پاس رہنے والوں کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یوسف (علیہ السلام) کا معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔

معلوم نہیں یعقوب (علیہ السلام) پر یہ چند دن اور راتیں کس طرح گزریں۔ آخر کار ایک دن آیا جب آواز آئی وہ دیکھو مصر سے کنعان کا قافلہ آیا ہے۔

گزشتہ سفروں کے بر خلاف فرزندان یعقوب (علیہ السلام) شاداں و فرخاں شہر میں داخل ہوئے اور بڑی تیزی سے باپ کے گھر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے "بشیر" بوڑھے یعقوب (علیہ السلام) کے پاس آیا (وہی "بشیر" جو وصال کی بشات لایا تھا اور جس کے پاس یوسف (علیہ السلام) کا پیراہن تھا) اس نے آتے ہیں پیراہن یعقوب (علیہ السلام) کے چہرے پر ڈال دیا۔ یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھیں تو بے نور تھیں۔ وہ پیراہن کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک آشنا خوشبوان کے مشامِ جان میں تر گئی ہے۔ یہ ایک پر کیف زریں لمحہ تھا۔ گویا ان کے وجود کا ہر ذرہ روشن ہو گیا ہو آسمان و زمین مسکرا اٹھے ہوں۔ ہر طرف قہقہے بکھر گئے ہوں، نسیم رحمت چل اٹھی ہو اور غم و اندوہ کا گرد و غبار لپیٹ کر لے جا رہی ہو در و دیوار سے خوشی کے نعرے سنائی دے رہے تھے اور یعقوب (علیہ السلام) اسی ساری فضا کے ساتھ تبسم کناں تھے۔ ایک عجیب پیجانی کیفیت تھی جو اس بوڑھے انسان پر طاری تھی۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں ہیں اور وہ ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔ دنیا اپنی تمام زیبائیوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب بشارت دینے والا آیا تو اس نے وہ (پیراہن) ان کے چہرے پر ڈال دیا تو اچانک وہ بینا ہو گئے ﴿فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَى وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا﴾۔

بھائیوں اور گردوں پیش والوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امنڈ آئے اور یعقوب (علیہ السلام) نے پورے اعتماد سے کہا: میں نہ کہتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے ﴿قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لاَتَعْلَمُونَ﴾۔

اس حیران کن معجزہ پر گہری فکر میں ڈوب گئے۔ ایک لمحہ کے لئے اپنا تاریک ماضی ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، خطا، اشتباہ اور تنگ نظری سے پر ماضی۔

لیکن کتنی اچھی بات ہے کہ جب انسان اپنی غلطی کو سمجھ لے تو فوراً اس کی اصلاح کی فکر کرے فرزندِ یعقوب (علیہ السلام) بھی اسی فکر میں گم ہو گئے۔ انہوں نے باپ کا دامن پکڑ لیا اور "کہا: باباجان! خدا سے درکواست کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے" ﴿قَالُوا يَاأَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا﴾۔

"کیونکہ ہم گناہگار اور خطا کار تھے"۔ ﴿إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ﴾۔

بزرگوار اور باعظمت بوڑھا جس کا ظرف سمندر کی طرح وسیع تھا، اس نے کوئی ملامت و سرزنش کئے بغیر ان سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد تمہارے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا ﴿قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّى﴾۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری توبہ قبول کرلے گا اور تمہارے گناہوں سے صرفِ نظر کرلے گا کیونکہ "وہ غفور و رحیم ہے" ﴿إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ یعقوب (علیہ السلام) نے پیراہن یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو کیسے محسوس کی؟

یہ سوال بہت سے مفسرین نے اٹھایا ہے اور اس پر بحث کی ہے عام طور پر مفسرین نے اسے یعقوب (علیہ السلام) یا یوسف (علیہ السلام) کا معجزہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ قرآن نے اسے اعجاز یا غیر اعجاز ہونے کے لحاظ سے پیش نہیں کیا اور اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے، اس کی سائنسی توجیہ معلوم کی جاسکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں "ٹیلی پیتھی" ایک مسئلہ علمی ہے (اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے دور رہنے والے افراد کے درمیان فکری ارتباط اور روحانی رابطہ ہو سکتا ہے۔ اسے "انتقال فکر" کہتے ہیں) ایسے افراد جو ایک دوسرے سے نزدیکی تعلق رکھتے ہیں یا جو بہت زیادہ روحانی طاقت رکھتے ہیں یہ تعلق ان کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ شاید ہم میں سے بہت سے افراد نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کا سامنا کیا ہو کہ بعض اوقات کسی کی والدہ یا بھائی اپنے اندر بلا سبب بہت زیادہ اضطراب اور پریشانی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ خبر پہنچتی ہے کہ اس کے بیٹے یا بھائی کو فلاں دور دراز علاقے میں ایک ناگوار حادثہ پیش آیا ہے۔

ماہرین اس قسم کے احساس کو ٹیلی پیتھی اور دور دراز کے علاقوں سے انتقال فکر کا عمل قرار دیتے ہیں۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے واقعہ میں بھی ممکن ہے یوسف (علیہ السلام) سے شدید محبت اور آپ روحانی عظمت کے سبب آپ میں وہی احساس پیدا ہو گیا ہو جو یوسف (علیہ السلام) کا کرتہ اٹھاتے وقت بھائیوں میں پیدا ہوا تھا۔

البتہ یہ بات بھی ہرح ممکن ہے کہ اس واقعے کا تعلق انبیاء کے دائرہ علم کی وسعت سے ہو۔

بعض روایات میں بھی انتقال فکر کے مسئلے کی طرف جاذبِ نظر اور عمدہ اشارہ کیا گیا ہے مثلاً:

کسی نے امام باقر (علیہ السلام) سے عرض کیا : کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں بغیر کسی مصیبت یا ناگوار حادثے کے غمگین ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ میرے گھر والے اور میرے دوست بھی اس کے اثرات میرے چہرے پر دیکھ لیتے ہیں ۔

امام (علیہ السلام) نے فرمایا : ہاں ، خدا نے مومنین کو ایک ہی بہشتی طینت سے پیدا کیا ہے اور اسکی روح ان میں پھونکی ہے لہٰذا مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس وقت کسی ایک شہر میں ان میں سے کسی ایک خاص بھائی کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو باقیوں پر اس کا اثر ہوتا ہے ۔ (۲)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرتہ نہ تھا بلکہ ایک جنتی پیراہن تھا جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) خلیل اللہ کی طرف سے خاندانِ یعقوب (علیہ السلام) میں یادگار کے طور پر چلا آرہا تھا اور جو شخص حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی طرح بہشتی قوت شامہ رکھتا تھا وہ اس کی خوشبو دور سے محسوس کرلیتا تھا ۔ (۳)

۲۔ انبیاء کے حالات میں فرق:

یہاں پر ایک اور مشہور اعتراض سامنے آتا ہے ۔ فارسی زبان کے اشعار میں بھی اعتراض بیان کیا گیا ہے ۔ کسی نے یعقوب (علیہ السلام) سے کہا :

زمصرش بوی پیراہن شنیدی چرا درچاہ کنعانش نہ دیدی

یعنی ..آپ نے مصر سے پیراہن کی خوشبو سونگھ لی لیکن آپ کو کنعان کے کنویں میں یوسف (علیہ السلام) کیوں دکھائی نہ دیا؟

کیسے ہوسکتا کہ اس عظیم پیغمبر نے اتنے دور دراز کے علاقے سے یوسف (علیہ السلام) کی قمیص کی خوشبو سونگ لی جب کہ بعض نے یہ فاصلہ اسّی فرسخ لکھا ہے اور بعض نے دس دن کی مسافت بیان کی ہے لیکن اپنے ہی علاقے کنعان کے اندر جب کہ یوسف (علیہ السلام) کو اس کے بھائی نے کنویں میں پھینک رہے تھے اور ان پر وہ واقعات گزررہے تھے اس سے یعقوب (علیہ السلام) آگاہ نہ ہوئے ؟

قبل ازیں انبیاء اور آئمہ کے علم غیب کی حدود کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ہرگز مشکل نہیں رہتا ۔ امور غیب کے متعلق ان کا علم پروردگار کے ارادے اور عطا کئے ہوئے علم پر منحصر ہے ۔ جہاں خدا چاہتا ہے وہ جانتے ہیں چاہے واقعے کا تعلق کسی دور دراز علاقے سے ہو اور جہاں وہ نہ چاہے نہیں جانتے چاہے معاملہ کسی نزدیک ترین علاقے سے مربوط ہو ۔ جیسے کسی تاریک رات میں ایک قافلہ کسی بیابان

سے گزر رہا ہو اور ۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہو ۔ ایک لمحے کے لئے بجلی خاموش ہو جائے اور پھر تاریکی ہر طرف چھا جائے اس طرح سے کہ کوئی چیز نظر نہ آئے ۔

شاید امام جعفر صادق علیہ السلام علم امام کے بارے میں مروی یہ حدیث اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے ، آپ فرماتے ہیں :

جعل اللہ بینه و بین الامام عموداً من نور ینظر اللہ به الیٰ الامام و ینظر الامام به الیه فاذا اراد علم شیء نظر فی ذٰلک النور فعرفه

خدا نے اپنے اور امام و پیشوائے خلق کے درمیان نور کا ایک ستون بنایا ہے ۔ اسی سے خدا امام کی طرف دیکھتا ہے اور امام بھی اسی طریق سے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتا ہے اور جب امام کوئی چیز جاننا چاہتا ہے تو نور کے اس ستون میں دیکھتا ہے اور اس سے آگاہ ہو جاتا ہے ۔ (۴)

ایک شعر جو پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سعدی کے مشہور اشعار میں ایسی ہی روایات کے پیش نظر کہا گیا ہے :

بگفت احوال ما برق جہان است گہی پیدا و دیگر دم نہان است

گہی بر کام اعلا نشینیم گہی تا پشت پای خود نبینیم

یعنی .اس نے کہا ہمارے حالات چمکنے والی بجلی کی طرح ہیں جو کبھی دکھائی دیتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے ۔

کبھی ہم آسمان کی بلندیوں پر بیٹھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پیچھے بھی دکھائی نہیں دیتا ۔

” جہان “ یہاں ” جہندہ “ یعنی چمکنے والی “ کے معنی میں ہے اور ” برق جہان “ کا معنی ہے چمکنے والی آسمانی بجلی ۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے تعجب کا مقام نہیں کہ ایک دن مشیت ِ الٰہی کی بناء پر یعقوب (علیہ السلام) کی آزمائش کے لئے وہ اپنے قریب رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ نہ ہوں اور کسی دوسرے دن جب کہ دورِ آزمائش ختم ہو چکا تھا اور مشکلات کے دن بیت چکے تھے انہوں نے مصر سے قمیص یوسف (علیہ السلام) کی مہک سونگھ لی ہو ۔

۳ ۔ بینائی کیسے لوٹ آئی ؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھوں کا نور بالکل ضائع ہو نہیں ہوگیا تھا بلکہ ان کی آنکھیں کمزور ہوگئیں تھی اور بیٹے کی ملاقات کے امکانات پیدا ہوئے تو ان میں ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ وہ

پہلی حالت پر واپس آگئیں لیکن آیات کا ظہور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بالکل نابینا ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں سفید ہوچکی تھیں لہٰذا ان کی بینائی معجزانہ طور پر واپس آئی ۔ قرآن کہتا ہے:﴿فارتد بصیراً﴾بینائی کی طرف لوٹ آیا ۔

۴۔ استغفار کا وعدہ:

مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ بھائیوں کے اظہارِ ندامت پر حضرت یوسف (علیہ السلام)نے کہا :

﴿یغفر الله لکم﴾ خدا تمہیں بخش دے گا ۔

لیکن انہوں نے حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے سامنے اعتراف گناہ اور اظہار ندامت کیا اور استغفار کا تضایا کیا تو انہوں نے کہا: میں بعد میں تمہارے لئے استغفار کروں گا ۔

جیساکہ روایات میں آیا ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس تقاضا پر شبِ جمعہ وقت سحر عمل کریں جو کہ اجابتِ دعا اور توبہ کی قبولیت کے لئے مناسب وقت ہے[۵]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے انہیں کس طرح قطعی جواب دیا جب کہ ان کے باپ نے آئندہ پر چھوڑ دیا ؟۔

ہو سکتا ہے یہ فرق اس بناء پر ہو کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) بخشش کے امکان کے بارے میں بات کررہے ہوں یعنی یہ گناہ قابل بخشش ہے لیکن حضرت یعقوب (علیہ السلام) اس کی فعلیت کے بارے میں گفتگو کررہے ہوں یعنی کیا کیا جائے کہ جس سے بخشش ہو جائے (غو کیجئے گا) ۔

۵۔ توسل جائز ہے:

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے استغفار کا تقاضا کرنا نہ صرف یہ کہ عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے بلکہ لطف الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ یعقوب (علیہ السلام) کہ جو نبی تھے بیٹوں کا یہ تقاضا قبول کرتے کہ ان کے لئے استغفار کی جائے اور کیسے ممکن تھا کہ ان کے توسل کا مثبت جواب دیتے ۔

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء اللہ سے توسل اجمالاً ایک جائز امر ہے اور جو اسے ممنوع اور اورا صلِ توحید کے خلاف سمجھتے ہیں وہ متون قرآن سے آگاہی نہیں رکھتے یا پھر غلط تعصبات نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے ۔

۶۔ سیاہ رات چھٹ گئی:

مندرجہ بالا آیات ہمیں یہ عظیم درس دیتی ہیں کہ مشکلات و حوادث جتنے بھی سخت اور دردناک ہوں اور ظاہری اسباب و علل جتنے بھی محدود اور نارسا ہوں اور کامیابی و کشائش میں کتنی ہی تاخیر ہو جائے ان میں سے کوئی چیز بھی لطفِ پروردگار پر امید رکھنے سے مانع نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ وہی خدا ہے جو نابینا آنکھ کو پیراہن کے ذریعے روشن کردیتا ہے اور پیراہن کو خوشبو دور کے فاصلے سے دیگر علاقوں کی طرف منتقل کردیتا ہے اور گمشدہ عزیز اور محبوب کو سالہا سال بعد لوٹا دیتا ہے اور جدائی سے مجروح دلوں پر مرہم رکھتا ہے اور جانکاہ تکالیف کو شفا بخشتا ہے۔

جی ہاں اس سرگزشت میں توحید اور خدا شناسی کا یہ عظیم درس ہے کہ کوئی چیز بھی خدا کے ارادے کے سامنے پیچیدہ نہیں ہے۔

۱۔ "تفندون" "فند" (بروزن "نمد") کے مادہ سے، فکر کی کمزوری اور حماقت کے معنی میں ہے۔ اسے "جھوٹ" کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ در اصل یہ فساد اور خرابی کے معنی میں ہے۔۔ لہذا " لولاان تفندو "کا معنی ہے: اگر تم مجھے بے وقوف اور فاسد العقل نہ کہو۔

۲۔ اصول کافی جلد ۲ ص ۱۳۳۔

۳۔ ان روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لئے نور الثقلین کی دوسری جلد ص ۴۶۴ کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ شرح نہج البلاغہ از خوئی جلد ۵ ص ۲۰۰۔

۵۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ شبِ جمعہ کہ جو روز عاشور کے برابر تھی، ان کے لئے اسغفار کریں (تفسیر قرطبی۔ جلد ۶ س ۳۴۹۱)

آیات ۱۰۱،۱۰۰،۹۹،

۹۹۔﴿فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ آوَى إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ﴾۔

۱۰۰۔﴿ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَاأَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾۔

۱۰۱۔﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾۔

ترجمہ

۹۹۔ جس وقت یوسف کے پاس پہنچے تو وہ اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے اور کہا: سب کے سب مصر میں داخل ہو جاؤ، انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے

۱۰۰۔ اور ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب ان کے لئے سجدے میں گر گئے اور اس نے کہا: ابا جان: یہ اس خواب کی تعبیر ہے کہ جو پہلے میں نے دیکھا تھا، خدا نے اسے حقیقت میں بدل دیا اور اس نے مجھ سے نیکی کی جب مجھے زندان سے نکالا اور آپ کو اس بیابان سے (یہاں) لے آیا اور جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان خرابی پیدا کرچکا تھا، اور میرا پروردگار جسے چاہتا ہے (اور مناسب دیکھتا ہے) اس کے لئے صاحبِ لطف ہے کیونکہ وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۰۱۔ پروردگارا! تونے مجھے حکومت کا (عظیم) حصہ بکشا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کا تعبیر کا علم دیا ہے تو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تو دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے، مجھے مسلمان مارنا اور صالحین کے ساتھ ملحق فرمانا۔

تفسیر

یوسف (علیہ السلام)، یعقوب (علیہ السلام) اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام

عظیم ترین بشارت لئے ہوئے مصر سے قافلہ کنعان پہنچا۔ بوڑھے یعقوب بینا ہوگئے۔ عجیب جوش و خروش تھا۔ سالہا سال سے جو گھرانا غم و اندوہ میں ڈابا ہوا تھا وہ خوشی اور سرور میں ڈوب گیا۔ ان سب نعمات الٰہی پر وہ پھولے

نہیں سماتے تھے۔یوسف (علیہ السلام) فرمائش کے مطابق اس خاندان کو اب مصر کی طرف روانہ ہونا تھا۔ سفر کی تیاری ہر لحاظ سے مکمل ہو گئی ہعقوب (علیہ السلام) ایک مرکب پر سوار ہوئے جب کہ ان کے مبارک لبوں پر ذکر و شکر خدا جاری تھا اور عشقِ وصال نے انہیں اس طرح قوت و توانائی بخشی کہ کہ گویا وہ نئے سے جواب ہو گئے تھے۔

بھائیوں کے گزشتہ سفر تو خوف و پریشانی سے گزرے لیکن ان کے بر خلاف یہی سفر ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے خالی تھا۔یہاں تک کہ سفر کی کوئی تکلیف تھی بھی تو اس انتظار میں پنہاں مقصد کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

وصال کعبہ چناں می دواندام بشتاب کہ خارہای مغیلاں می آید

کعبہ مقصود کے وصال نے مجھے اتنا دوڑایا کہ خار مغیلاں ریشم معلوم ہوتے تھے۔

رات و دن گویا بڑی آہستگی سے گزررہے تھے کیونکہ اشتیاقِ وصال میں ہر گھڑی ایک دن بلکہ ایک سال معلوم ہورہی تھی مگر جو کچھ تھا آخر گزر گیا۔ مصر کی آبادیاں دور سے نمایاں ہوئیں، مصر کے سر سبز کھیت، آسمان سے باتیں کرنے والے درخت اور خوبصورت عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔

لیکن .. قرآن اپنی دائمی سیرت کے مطابق ان سب مقدمات کو جو تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتے ہیں حذف کرتے ہوئے کہتا ہے: جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے ﴿فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ آوَى إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ﴾۔

" اٰوی " جیسا کہ راغب نے کہا ہے اصل میں کسی چیز کو دوسری چیز سے منضم کرنے کے معنی میں ہے یوسف (علیہ السلام) کا اپنے تئیں ماں باپ سے منضم کرنا، ان سے بغل گیر ہونے کے لئے کنایہ ہے۔

آخر کار یعقوب (علیہ السلام) کی زندگی کا شیرین ترین لمحہ آگیا۔ دیدار وصال کا یہ لمحہ فراق کے کئی سالوں بعد آیا تھا۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وصال کے یہ لمحات یعقوب (علیہ السلام) اور یوسف (علیہ السلام) پر کیسے گزرے، ان شیرین لمحات میں ان دونوں کے احساسات و جذبات کیا تھے، عالمِ شوق میں انہوں نے کتنے آنسو بہائے اور عالمِ عشق میں کیا نالہ ہوا۔

پھر یوسف (علیہ السلام) نے " سب سے کہا: سرزمین، مصر میں قدم رکھیں کہ انشاء اللہ یہاں آپ بالکل امن و امان میں ہوں گے " کیونکہ مصر یوسف (علیہ السلام) کی حکومت میں امن و امان کا گہوارہ بن چکا تھا ﴿وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ﴾۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) اپنے ماں باپ کے استقبال کے لئے شہر کے دروازے کے باہر تک آئے تھے اور اور شاید جملہ "دخلوا علی یوسف "کہ جو دروازے سے باہر سے مربوط ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے حکم دیا تھا کہ وہاں خیمے نصب کئے جائیں اور ماں باپاور بھائیوں کی پہلے پہل وہاں پذیرائی کی جائے۔

جب وہ بارگاہ یوسف (علیہ السلام) میں پہنچے "تو اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا "﴿وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾۔

نعمت الٰہی کی اس عظمت اور پروردگار کے لطف کی اس گہرائی اور وسعت نے بھائیوں اور ماں باپ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ "سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر گئے "﴿وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا﴾۔

اس موقع پر یوسف (علیہ السلام) نے باپ کی طرف رخ کیا " اور اعتراض کیا: اباجان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا "﴿وَقَالَ يَاأَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَاى مِنْ قَبْلُ﴾۔کیا ایسا ہی نہیں کہ میں نے خواب مین دیکھا تھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے میرے سامنے سجدہ کررہے ہیں۔ دیکھئے! جیسا کہ آپ نے پیش گوئی کی تھی "خدا نے اس خواب کو واقعیت میں بدل دیا ہے "﴿قَدْ جَعَلَهَا رَبِّى حَقًّا﴾۔ "اور پروردگار نے مجھ پر لطف و احسان کیا ہے کہ اس نے مجھے زندان سے نکالا ہے "﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِى إِذْ أَخْرَجَنِى مِنَ السِّجْنِ﴾۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کی مشکلات میں صرف زندانِ مصر کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن میرے بھائیوں کی وجہ سے کنعان کے کنوئیں کی بات نہیں کی۔

اس کے بعد مزید کہا: خدا نے مجھ پر کس قدر لطف کیا کہ آپ کو کنعان کے اس بیابان سے یہاں لے آیا جب جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائی کے درمیان فساد انگیزی کر چکا تھا﴿وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِى وَبَيْنَ إِخْوَتِى﴾۔

یہاں یوسف (علیہ السلام) ایک مرتبہ اپنی وسعت قلبی اور عظمت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ کوتاہی کس شکس نے کی صرف سربستہ اور اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ شیطان نے اس کام میں دخل اندازی کی اور وہ فساد کا باعث بنا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کا گزشتہ خطاؤں کا گلہ کریں۔

سرزمین کنعان کو "بدو "یعنی "بیابان" کہنا بھی جاذب نظر ہے۔ اس طرح سے مصر اور کنعان ک اتمدنی فرق واضح کیا گیا ہے۔

آخر میں یوسف (علیہ السلام) کہتے ہیں : یہ سب نعمات و عنایات خدا کی طرف سے ہیں کیونکہ میرا پروردگار مرکزِ لطف و کرم ہے اور جس امر میں چاہتا ہے لطف کرتا ہے ، وہ بندوں کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے اور ان مشکلات کو آسان کرتا ہے ﴿إِنَّ رَبِّی لَطِیفٌ لِمَا یَشَاءُ﴾۔

وہ جانتا ہے کہ کون حاجت مند ہیں اور کون اہل ہیں کیونکہ " وہ علیم و حکیم ہے " ﴿إِنَّه هُوَ الْعَلِیمُ الْحَکِیمِ﴾ ۔

اس کے بعد یوسف (علیہ السلام) حقیقی مالک الملک اور دائمی ولیِ نعمت کی طرف رخ کرتے ہیں اور شکر اور تقاضے کے طور پر کہتے ہیں :

"پروردگارا ! تونے ایک وسیع حکومت کا ایک حصہ مجھے مرحمت فرمایا ہے " ﴿رَبِّ قَدْ آتَیْتَنِی مِنْ الْمُلْکِ﴾۔ " اور تونے مجھے تعبیر خواب کے علم کی تعلیم دی ہے " ﴿وَعَلَّمْتَنِی مِنْ تَأْوِیلِ الْأَحَادِیث﴾ ۔ اور اسی علم نے جو ظاہراً سادہ اور عام ہے میری زندگی اور تیرے بندوں کی ایک بڑی جماعت کی زندگی میں کس قسم کا انقلاب پیدا کردیا ہے اور یہ علم کس قدر پربرکت ہے ۔

" تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایجاد کیا ہے " ﴿فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ۔ اور اسی بناء پر تمام چیزیں تیری قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں ۔ " پروردگارا ! دنیا و آخرت میں تو میرا ولی ، ناصر ، مدبر اور محافظ ہے " ﴿أَنْتَ وَلِیِّ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ﴾ ۔ " مجھے اس جہان سے مسلمان اور اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے لے جا " ﴿تَوَفَّنِی مُسْلِمًا﴾ ۔ اور مجھے صالحین سے ملحق کردے " ﴿وَأَلْحِقْنِی بِالصَّالِحِینَ﴾ ۔

یعنی میں تجھ سے ملک کے دوام اور اپنی مادی حکومت اور زندگی کی بقاء کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ تو سب فانی ہیں اور صرف دیکھنے میں دل انگیز ہیں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری عاقبت اور انجام کار بخیر ہو اور میں راہ ایمان و تسلیم کے ساتھ رہوں اور تیرے لئے جان دوں اور صالحین اور تیرے باخلوص دوستوں کی صف میں قرار پاؤں ، میرے لئے یہ چیزیں اہم ہیں ۔

چند اہم نکات

۱ ۔ کیا غیر خدا کے لئے سجدہ جائز ہے ؟

جیساکہ ہم پہلی جلد (جلد اوّل ص ۱۶۱ (اردو ترجمہ) میں فرشتوں کے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ پرستش و عبادت کے معنی میں سجدہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی مذہب میں کسی شخص کے لئے

پرستش جائز نہیں ہے اور توحید عبادت جو مسئلہ توحید کا اہم حصہ ہے او رجس کی تمام پیغمبروں نے دعوت دی ہے، کایہی مفہوم ہے۔

لہذا یوسف (علیہ السلام) کہ جو خدا کے پیغمبر تھے نہ وہ اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ انہیں سجدہ کیا جائے اور ان کی عبادت کیا جائے اور نہ ہی یعقوب (علیہ السلام) جیسے عظیم پیغمبر ایسا کام کرسکتے تھے او رنہ ہی قرآن اسے ایک اچھے یا کم ازکم جائزو مباح کام کے طور پر یاد کرسکتا تھا۔

اس بناء پر مذکورہ سجدہ یا خدا کے لئے "سجدہ شکر" کے طور پر تھا۔ اسی خدا کے لئے سجدہ شکر جس نے یہ تمام عنایات و نعمات اور مقام عظیم یوسف (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جس نے خاندان یعقوب (علیہ السلام) کی مشکلوں اور مصیبتوں ک ودور کیا تھا۔ اس صورت میں اگرچہ سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن چونکہ یوسف(علیہ السلام) کو عطا کی گی نعمت کی عظمت کے لئے تھا خودیوسف (علیہ السلام) کا احترام بھی اس سے ظاہر ہوتا تھا اور اس لحاظ سے "لہ "کی ضمیر جو مسلماً یوسف (علیہ السلام) کی طرف لوٹتی ہے اس معنی کے ساتھ پوری طرح مناسب ہوگی۔

یا یہ کہ یہاں "سجدہ" ک اوسیع مفہوم مراد ہے یعنی خضوع اور انکساری، کیونکہ سجدہ ہمیشہ اپنے مشہور معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہر قسم کی انکساری اور تواضع کے معنی میں بھی استعمال ہوجاتا ہے لہذا بعض مفسرین نے کہا کہ اس زمانے میں خم ہ وکر انکساری اور تواضع ک ااظہار کرتے تھے اور تعظیم و احترام بجالانے کا یہ طریقہ رائج تھا۔ ان مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیت میں "سجداً" سے مرادیہی ہے۔

لیکن "خروا" کا مفہوم ہے "زمین پر گرپڑنا"۔ اس لفظ کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سجدہ خم ہونے اور سرنیچا کرنے کے معنی میں نہیں تھا۔

بعض دیگر عظیم مفسرین نے کہاہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام)، بھائیوں اور ان کی والدہ کا سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن یوسف (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی طرح ان کے قبلہ تھے اسی لئے عربوں کی تعبیرات میں بعض اوقات کہا جاتا ہے:

فلان صلی للقبلہ

یعنی فلاں شخص نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ (۱)

البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے بالخصوص جب کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس سلسلے میں متعدد روایات بھی موجودہیں۔ فرمایا: کان سجودھم للہ

یعنی ..کا سجدہ خدا کے لئے تھا ۔

یہ بھی الفاظ ہیں: کان سجودھم عبادہ للہ

ان کا سجدہ اللہ کی عبادت کے طور تھا ۔ (۲)

نیز کچھ اور احادیث میں ہے: کان طاعۃ للہ و تحیۃ لیوسف

یہ سجدہ اللہ کی اطاعت کے عنوان سے اوریوسف (علیہ السلام) کے احترام کے لئے تھا ۔ ۳

جیسا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے واقعہ میں بھی سجدہ اس خدائے بزرگ و برتر کے لئے تھا کہ جس نے ایسی بدیع اور عجیب و غریب مخلوق پیدا کی تھی ۔ وہ سجدہ عبادت ِخدا کے ساتھ ساتھ حضرت آدم (علیہ السلام) کے احترام اور عظمت مقام کی دلیل بھی تھا ۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص کوئی بہت ہی اچھا اہم کام انجام دیتا ہے اور ہم اس کام کی بناء پر خدا کے لئے سجدہ کریں کہ جس نے ایسا بندہ پیدا یا ہے تو یہ سجدہ خدا کے لئے بھی ہے اور اس شخص کے احترام کے لئے بھی ۔

۲۔ شیطانی وسوسے:

”نزع الشیطان بینی و بین اخوتی“ میں لفظ ”نزع“ کسی کام میں فساد و افساد کے ارادے سے داخل ہونے کے معنی میں ہے ۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایسے معاملات مین شیطانی وسوسے ہمیشہ بہت اثر رکھتے ہیں ۔ لیکن ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں صرف اس قسم کے وسوسوں سے کچھ بھی نہیں ہوسکتا ۔ اٹل فیصلہ اور آخری مصمم ارادہ خود انسان کو کرنا ہوتا ہے بلکہ وہی اپنے دل کا دریچہ شیطان کے لئے کھولتا ہے اور اسے اندرداخل ہونے کی اجازت دیتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت سے اختیار و ارادہ کی آزادی کے برخلاف کوئی مفہوم نہیں نکلتا ۔

البتہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اپنی عظمت وبزرگواری، وسعت، ظرف اور کشادہ دلی کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کو اس معاملے میں زیادہ شرمندہ کریں کہ جو خود ہی بہت شرمندہ تھے ۔ اس لئے آخری ارادہ کرنے والے کی طرف اشارہ نہیں کیا اور صرف شیطانی وسوسوں کا ذکر کیا ہے جو دوسرے درجے کے عامل ہیں ۔

۳۔ امن و امان خدا کی عظیم نعمت:

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے مصر کی تمام تر نعمات میں سے امن و امان کا ذکر کیا ہے اور ماں باپ اور بھائیوں سے کہا کہ مصر میں داخل ہوجاؤ انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن و امان کی نعمت تمام نعمتوں کی جڑ ہے اور حقیقت میں ایسا ہی ہے کیونکہ جب امن و امان ختم ہو جائے تو تمام رفاہی امور او رمادی و روحانی نعمتیں مظرے میں پڑجاتی ہیں ۔ بے امنی کے ماحول میں نہ اطاعت خدا مقدور میں رہتی ہے او رنہ ندگی میں سربلندی اور آسودگئی فکر باقی رہتی ہے او رنہ ہی سعی و کوشش اور اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کے لئے جہاد ہوسکتا ہے ۔

ہوسکتا ہے یہ جملہ ضمناً اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ یوسف (علیہ السلام) چاہتے ہیں کہ یہ بتائیں کہ مصر میری حکومت و سلطنت میں کل کے فراعنہ کی سی سرزمین نہیں ہے ۔ وہ خود غرضیاں ، خودپرستیاں ، مظالم، لوٹ مار، گھٹن اور شکنجے سب کے سب ختم ہو گئے ہیں ۔ ایک مکمل امن و امان کا ماحول ہے ۔

۴۔مقام علم کی اہمیت : حضرت یوسف (علیہ السلام) آخر میں ایک مرتبہ پھر علم تعبیر خواب کا ذکر کرتے ہیں اور اس عظیم اور بغر نزاع کے حکومت کی بنیاد اس ظاہراًآسان اور سادہ علم کو قرار دیتے ہیں ۔ یہ امر دراصل علم و دانش کی اہمیت و تاثیر پر زیادہ سے زیادہ تاکید کرنے کے لئے ہے ۔ چاہے وہ علم سادہ اور عام قسم کا ہی کیوں نہ ہو.. لہٰذا کہتے ہیں :

﴿رب قد أتیتنی من الملک و علمتنی من تأویل الاحادیث﴾

۵۔ اختتام خیر:

ہو سکتا ہے انسان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن مسلم ہے کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی ساری زندگی اور سرنوشت سے زیادہ اصلاحی اور تعمیری ہیں کیونکہ عمر کا دفتر ان کے ساتھ بند ہو جاتا ہے اور آخری فیصلہ زندگی کے انہین آخری صفحات وابستہ ہے ۔ اسی لئے صاحب ایمان اور سمجھدار لوگ ہمیشہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمر کے یہ لحظے نورانی اور درخشاں ہوں ۔یوسف (علیہ السلام) بھی اس مقام پر خدا سے یہی چاہتے ہیں او رکہتے ہیں :

﴿توفنی مسلماً و الحقنی بالصالحین﴾

مجھے دنیا سے ایمان کے ساتھ لے جا اور میرا شمار صالحین کے زمرے میں کر ۔

یہ گفتگو خدا سے موت کا تقاضا کرنے کے لئے نہیں جیسا کہ ابن عباس نے گمان کیا ہے اور کہا ہے :

یوسف (علیہ السلام) کے سوا کسی پیغمبر نے خدا سے موت کا تقاضا نہیں کیا ۔ ان کے پاس اپنی حکومت کے تمام اسباب و وسائل موجود تھے لیکن ان کی روح میں عشقِ الٰہی کا شعلہ بھڑک اٹھا او رانہوں نے لقائے الٰہی کی آرزو کی ۔

لیکن ..یوسف (علیہ السلام) کا تقاضا شرط اور حالت کا تقاضا تھا یعنی انہوں نے یہ تقاضا کیا تھا کہ موت کے وقت وہ ایمان و اسلام کے حامل ہوں جیسا کہ ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) نے بھی اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی ۔﴿فلا تموتن الا و انتم مسلمون﴾

میرے بچو! کوشش کرو کہ دنیا سے جاتے وقت باایمان اور فرمانِ خدا کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہو (بقرہ ۔ ۱۳۲) ۔بہت سے مفسرین نے بھی یہی معنی انتخاب کیا ہے ۔

۶۔ کیا یوسف (علیہ السلام) کی والدہ مصر آئی تھیں ؟

مندرجہ بالا آیات کے ظاہری معنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی والدہ اس وقت زندہ وسلامت تھیں اور وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ مصر آئی تھیں اور اس نعمت کے شکرانے کے طورپر انہوں نے بھی سجدہ کیا تھا لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ ان کی والدہ "راحیل" فوت ہو چکی تھیں اور یہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی خالہ تھیں جو مصر آئی تھیں اور وہ ماں کی جگہ شمار ہوتی تھیں موجودہ تورات کے سفر تکوین کی فصل ۳۵ اور جملہ ۱۸ میں ہے :

بنیامین کے پیدا ہونے کے بعد راحیل فوت ہو گئیں ۔

بعض روایات جو وہب بن منبہ سے اور کعب الاحبار سے نقل ہوئی ہیں ان میں بھی یہی بات مذکور ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے یہ بات تورات سے لی ہے ۔

بہر حال ہم قرآن کے ظاہری مفہوم سے بغیر کسی یقینی مدرک کے آنکھیں بند کر کے اس کی توجیہ و تاویل نہیں کرسکتے اور ظاہرِ قرآن یہی ہے کہ اس وقت یوسف (علیہ السلام) کی ماں زندہ تھیں ۔

۷۔ باپ کو سر گزشت نہ سنانا:

امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے :

جس وقت یعقوب (علیہ السلام) یوسف سے ملاقات کے لئے پہنچے تو ان سے کہا: میرے بیٹے دل چاہتا ہے کہ میں پوری تفصیل جانوں کہ بھائیوں نے تم سے کیا سلوک کیا ۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے باپ سے تقاضا کیا کہ وہ اس معاملے کو جانے دیں لیکن یعقوب (علیہ السلام) نے انہیں قسم دے کہا کہ بیان کریں ۔

یوسف (علیہ السلام) نے واقعات کا کچھ حصہ بیان کیا ، یہاں تک کہ بتایا: بھائیوں نے مجھے پکڑ لیا اور کنویں میں بٹھا یا ۔ مجھے حکم دیا کہ کرتا اتاردوں تو میں نے ان سے کہا: میں تمہیں اپنے باپ (علیہ السلام) یعقوب (علیہ السلام) کے احترام کی قسم دیتا ہوں کہ میرے بدن سے کرتا نہ اتارو اور مجھے برہنہ نہ کرو ۔ ان میں سے ایک پاس چھری تھی اس نے وہ چھری نکال اور چلا کر کہا: کرتا اتاررو۔

یہ جملہ سنتے ہی یعقوب (علیہ السلام) کی طاقت جواب دے گئی ، انہوں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئے ۔ جب ہوش میں آئے تو بیٹے سے چاہا کہ اپنی بات جاری رکھے لیکن یوسف (علیہ السلام) نے کہا: آپ (علیہ السلام) کو ابراہیم ،(علیہ السلام) اسماعیل اور اسحاق (علیہ السلام) کے خدا کی قسم مجھے اس کام سے معاف رکھیں ۔

جب یعقوب (علیہ السلام) نے یہ سنا تو اس معاملے سے صرفِ نظر کرلیا ۔[۴]

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ماضی کے تلخ واقعات اپنے دل میں لائیں یا باپ کے سامنے انہیں دھرائیں اگرچہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی جستجو کی حس ّانہیں مجبور کرتی تھی ۔

۱-تفسیرالمیزان و تفسیر فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۶۷۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ص۴۶۸۔

۴ مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۶۵۔

آیات ۱۰۲،۱۰۳،۱۰۴،۱۰۵،۱۰۶،۱۰۷

۱۰۲۔ ﴿ذَلِکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْکَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهمْ يَمْكُرُونَ﴾ ۔

۱۰۳۔ ﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾۔

۱۰۴۔ ﴿وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلاَّ ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾۔

۱۰۵۔ ﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنهَا مُعْرِضُونَ﴾ ۔

۱۰۶۔ ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللهِ إِلاَّ وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾ ۔

۱۰۷۔ ﴿أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيهم غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللهِ أَوْ تَأْتِيَهُمْ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لاَيَشْعُرُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۰۲۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کہ جس کی ہم تجھے وحی کرتے ہیں تو (ہرگز) ان کے پاس نہیں تھا جب انہوں نے مصمم ارادہ کیا اور جب منصوبہ بنارہے تھے ۔

۱۰۳۔ اور اگرچہ تو اصرار کرے تو زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے ۔

۱۰۴۔اورتو اس پر(ہرگز) ان سے اجرت کامطالبہ نہیں کرتا، یہ نہیں ہے مگر یہ کہ عالمین کے لئے یادھانی۔

۱۰۵۔ اور (خدا کی) بہت سے نشانیاں آسمانوں اور زمین میں موجودہیں کہ وہ جن کے پاس سے گزرتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔

۱۰۶۔ اور ان میں کہ جو خدا پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اکثر مشرک ہیں ۔

۱۰۷۔کیا وہ اس سے مامون ہیں کہ خدا کی طرف سے گھیرنے والا عذاب ان پر آجائے یا قیامت کی گھڑی اچانک ان پر آجائے جب کہ وہ متوجہ نہ ہوں ۔

یہ دعویدار عام طور پر مشرک ہیں

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ تمام ہوا ۔ اس میں عبرت اور اصلاح کے بہت سے درس موجودہیں ۔ اس میں گرانبہا قیمتی اور ثمر بخش نکات موجودہیں اور یہ تاریخی واقعہ ہر قسم کی فضولیات اور خرافات سے پاک کرکے بیان کردیا گیا ہے ۔ اب قرآن روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے : یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم تیری طرف وحی کررہے ہیں ﴿ذَلِکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْکَ﴾ ۔

تو ہرگز ان کے پاس نہیں تھا جبکہ وہ مصمم ارادہ کررہے تھے اور منصوبہ بنا رہے تھے ﴿وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ﴾۔ ان باریکیوں اور تفصیلات کو صرف خدا جانتا ہے یا وہ شخص جو اس موقع پر موجود تھا اور چونکہ تو وہاں موجود نہیں تھا لہٰذا صرف وحی الٰہی ہے جو ایسی خبریں تجھ تک پہنچ جاتی ہیں ۔

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ اگرچہ تورات میں آیا ہے اور قاعدتاً حجاز والے اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے پھر بھی پوری تفصیلات کے ساتھ تمام واقعہ حتی کہ جو کچھ خصوصی مجالس میں ہوا تھا لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ جس میں کوئی اضافہ نہ کیا گیا ہو اور خرافات شامل نہ کی گئی ہوں ۔

ان حالات میں لوگوں کو چاہیئے کہ ان سب نشانیوں کو دیکھنے کے بعد اور ان خدائی نصیحتوں کو سننے کے بعد ایمان لے آئیں اور غلط راستے سے پلٹ جائیں مگر اے پیغمبر! اگرچہ تو اس پر اصرار کرے کہ یہ ایمان لے آئیں ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے ﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ ۔

لفظ "حرص" لوگوں کے ایمان لانے کے لئے پیغمبر کے شدید لگاؤ اور شوق کی دلیل ہے لیکن صرف آپ (علیہ السلام) کا شوق اور حرص کافی نہ تھا ۔ زمینوں اور ظرفوں کی قابلیت بھی شرط نہ تھی ۔

یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے کہ جو وحی و نبوت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے جب وہ ہوا وہوس میں گرفتار ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اپنے بھائی کو نابود کرنے پر تل سکتے ہیں تو پھر دوسروں سے کیا توقع کیا جا سکتی ہے کہ وہ ہوا و ہوس کے دیو اور شہوت بھوت پر غالب آجائیں اور سب کے سب ایک ہی دفعہ پوری طرح خدا کی طرف رخ کریں ۔

یہ جملہ ضمنی طور پر پیغمبر کی ایک طرح سے تسلی اور دلجوئی کے لئے ہے کہ وہ لوگوں کے کفر و گناہ پر اصرار سے ہرگز مایوس نہ ہو جائیں اور اس راہ میں ہم سفروں کی کمی سے ملول خاطر نہ ہوں ، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات میں بھی ہے مثلاً :

﴿فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفاً﴾

اے پیغمبر! گویا تو چاہتا ہے کہ قرآن ان کے ایمان نہ لانے پر شدت تاسف سے اپنی جان گنوا بیٹھے (کہف ۔ ۶)

قرآن مزید کہتا ہے کہ در اصل تیری دعوت کو قبول نہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی عذر و بہانہ نہیں ہے کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں حق کی نشانیاں واضح ہیں "تو نے اس کے بدلے ان سے ہرگز کوئی اجر مزدوری نہیں چاہی" کہ جسے وہ مخالفت کا بہانہ بنا سکیں ﴿وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾ ۔

”یہ ایک عمومی دعوت ہے اور سب جہانوں کے لئے اورعالمین کے لئے ایک دھانی ہے “ اور یہ عام و خاص تمام انسانوں کے لئے بچھا یا گیا ایک دسترخوان ہے﴿إِنْ هُوَ إِلاَّ ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾۔

وہ دراصل اس لئے گمراہ ہوئے کہ ان کے پاس کھلی اور بینا آنکھ اور سننے والے کان نہیں ہیں ”’آسمان و زمین میں بہت سے خدائی آیات ہیں کہ وہ جن کے قریب سے گزرجاتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں “ ﴿ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنهَا مُعْرِضُونَ ﴾۔

یہی حوادث کہ جنہیں ہر روز وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں ۔ صبح کے وقت آفتاب افقِ مشرق سے سر نکالتا ہے ۔ اس کی سنہری کرنیں پہاڑوں درّو ں ، صحراؤں اور دریاؤں پرپڑتی ہیں اور شام کے وقت افق مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور رات کی گہری سیاہ چادر ہر جگہ کو ڈھانپ دیتی ہے ۔

عجیب و غریب نظام کے یہ اسرار ، یہ طلوع و غروب ، سبزوں ، پرندوں ، حشرات اور انسانوں میں زندگی کا یہ شور و غوغا ، یہ ندیوں زمزمہ ، نسیم سحری کا یہ ہمہمہ اور یہ سب عجیب و دلنشین نقش کہ وجود کے درو دیوار پرہیں ۔ اس قدر آشکار ہیں کہ جو کوئی ان میں اور ان کے خالق میں غور و فکر نہ کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے دیوار پر کوئی نشان تھا ۔

بہت چھوٹے چھوٹے امرہیں جو ظاہراً کوئی اہمیت نہیں رکھتے ، جن کے قریب سے ہم بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں لیکن اچانک گہرائی تک پہنچنے والا ماہرپیدا ہوتا ہے جو کئی ماہ اور سالوں کے مطالعہ کے بعد عجیب و غریب اسرار معلوم کرتا ہے کہ جن سے دنیا کے منہ مارے تعجب کے کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں ۔

اصولی طورپر اہم بات یہ ہے کہ ہم جانیں کہ اس عالم ک وئی چیز معمولی اور بے اہمیت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز خدا کی مصنوع و مخلوق ہے ۔ وہ خدا کہ جس کا علم لاتناہی او رجس کی حکمت بے پایاں ہے ۔ بے وقعت وہ لوگ ہیں جو اس عالم کو بے اہمیت اور سر سری سی چیز سمجھتے ہیں ۔ لہٰذا اگر وہ ان آیاتِ قرآنی پر کہ جو تجھ پر نازل ہو ئی ہیں ایمان نہیں لاتے تو اس پر تعجب نہ کر کیونکہ وہ آیاتِ خلقت پر بھی ایمان نہیں لائے کہ جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں ۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : وہ جو ایمان لے آتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کا ایمان خالص نہیں ہے بلکہ اس میں شرک کی آمیزش ہے﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللهِ إِلاَّ وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾۔ہو سکتا ہے وہ خود سمجھتے ہوں کہ وہ خالص مومن ہیں لیکن شرک کی رگیں عموماً ان کے افکار ، گفتار اور کردار میں موجود ہوتی ہیں ۔

ایمان صرف یہ نہیں کہ انسان صرف وجود خدا کا اعتقاد رکھتا ہوبلکہ ایک خالص موحدوہ ہے جس کے قلب و جان میں خدا کے علاوہ کسی شکل میں کوئی معبود نہ ہو۔ اس کی گفتار خدا کے لئے، اس کے اعمال خدا کے لئے اور اس کا ہر کام اسی کے لئے انجام پائے۔

خدا کے قانون کے علاوہ کسی قانون کو قبول نہ کرے اور اسکے غیر کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالے اور خدا یہ فرامین ک ودل و جان سے قبول کرے چاہے وہ اس کے میلان کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ خدا او رہوائے نفس کے انتخاب کے دوراہے پر ہمیشہ خدا کو مقدم شمار کرے۔ یہ ہے ہر قسم کے شرک سے پاک ایمان۔ عقیدے کا شرک، گفتاگر اور عمل کا شرک، اگر ہم واقعاً ہر پہلو کے بارے میں باریک بینی سے کام لیں تو دیکھیں گے کہ سچے، خالص اور حقیقی موحد بہت کم ہیں۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

الشرک اخفی من دبیب النمل

انسانی اعمال میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ (سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۱۶۹۷)

یہ بھی روایت ہے:

﴿ان اخوف ما اخاف علیکم الشرک الاصغر قالوا وما الشرک الاصغر یا رسول اللہ ؟ قال الریا، یقول اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ اذا جاء الناس باعمالھم اذھبوا الیٰ الذین کنتم تراء ون فی الدنیا ، فانظروا ھل تجدون عندھم من جزاء ؟﴾

!

رسول اللہ نے فرمایا:

خطرناک ترین چیز کہ جس کا مجھے تم سے خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔

اصحاب نے پوچھا:

یا رسول اللہ: شرکِ اصغر کیا ہے:

فرمایا:

ریاکاری، قیامت کے دن جب لوگ اپنے اعمال کے ساتھ بارگاہ خدا میں حاضر ہوں گے تو پروردگار انہیں کہ جو دنیا میں ریا کرتے تھے، فرمائے گا: ان کے پاس جاؤ کہ جن کے لئے تم ریا کرتے تھے اور دیکھو کہ ان کے ہاں سے تمہیں کوئی اجر ملتا ہے؟ (۱)

امام محمد باقر علیہ السلام سے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

شرک طاعة ولیس شرک عبادة المعاصی التی ترتکبون وھی شرک طاعة اطاعوا فیھا الشیطان فاشرکوا باللہ فی الطاعة لغیرہ

اس آیت سے مراد اطاعت میں شرک کرنا ہے نہ کہ عبادت میں شرک کرنا اور جن گناہوں کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں وہ شرک اطاعت ہے کیونکہ اس میں وہ شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اور اس عمل کی بناء پر خدا کے لئے اطاعت میں شریک کے قائل ہوتے ہیں۔ [۲]

بعض دوسری روایات میں ہے کہ مراد "شرکِ نعمت" ہے اس معنی میں کہ کوئی نعمت خدا کی طرف سے انسان کو پہنچے اور وہ کہے کہ یہ نعمت فلاں شخص کی طرف سے مجھے پہنچی ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو میں مرجاتا یا میری زندگی تباہ ہوجاتی اور میں بے چارہ رہ جاتا۔ (نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۷۶)۔

یہاں غیر خدا کو روزی اور نعمات بخشنے میں خدا کا شریک شمار کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت میں شرک سے مراد کفر، انکار خدا اور ظاہری طور پر بت پرستی کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ امام علی بن موسیٰ رضا (علیہ السلام) سے نقل ہوا ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

شرک لایبلغ بہ الکفر

ایسا شرک جو کفر کے درجے تک نہ پہنچے۔

البتہ وسیع مفہوم کے لحاظ سے شرک میں یہ تمام امر شامل ہیں۔

زیر بحث آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ایمان نہیں لائے، جو خدا کی واضح آیات کے قریب سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور جو اپنے اعمال میں مشرک ہیں خدا تعالیٰ انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا یہ لوگ اپنے آپ کو اس امر سے مامون سمجھتے ہیں کہ اچانک اور بغیر کسی تمہید کے انہیں عذاب الٰہی آگھیرے، احاطہ کرنے والا ایسا عذاب کہ جو ان کے سب کو آگھیرے ﴿أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللهِ﴾۔ اور یا یہ کہ ناگہاں قیامت آپہنچے اور عظیم خدائی عدالت لگ جائے اور ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے کہ جب وہ بے خبر اور غافل ہوں ﴿أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَايَشْعُرُونَ﴾۔

"غاشیہ" ڈھانپنے والی چیز اور ڈھکنے کے معنی میں ہے ۔ دیگر چیزوں کے علاوہ گھوڑے کی زین پر ڈالنے جانے والے بڑے کپڑے کو بھی غاشیہ کہتے ہیں جو اسے ڈھانپ دیتا ہے ۔ یہاں پر اس سے مراد وہ سزا ہے جو تمام بدکاروں کا گھیر لے گی ۔ (۳)

"ساعۃ" سے مراد قیامت ہے جیسا کہ بہت سی دوسری قرآنی آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے ۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ "ساعۃ" ہولناک حوادث کے لئے کنایہ ہو کیونکہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کے دن کا آغاز بہت ہی زیادہ ہولناک حوادث کے ایک سلسلے سے ہوگا ۔ مثلاً زلزلے، طوفان اور بجلیاں یا موت کی گھڑی کی طرف اشارہ ہے ۔ پہلو تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

۱۔ تفسیر فی ظلال جلد ۵ ص ۵۳۔

۲۔ نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۷۵ و اصول کافی جلد ۲ ص ۲۹۲۔

۳۔ "غاشیہ" یہاں اس لئے مونث ہے کہ یہ لفظ "عقوبہ" کی صفت ہے کہ جو مقدر ہے ۔

آیات ۱۱۱،۱۱۰،۱۰۹،۱۰۸

۱۰۸۔﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِی أَدْعُو إِلَى اللهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنْ اتَّبَعَنِی وَسُبْحَانَ اللهِ وَمَا أَنَا مِنْ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

۱۰۹۔﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ إِلاَّ رِجَالًا نُوحِی إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِی الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلاَتَعْقِلُونَ﴾۔

۱۱۰۔﴿حَتَّى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَائَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّیَ مَنْ نَشَاءُ وَلاَيُرَدُّ بَأْسُنَا عَنْ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾۔

۱۱۱۔﴿لَقَدْ كَانَ فِی قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُوْلِی الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِی بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۰۸۔ کہہ دو: یہ میرا راستہ ہے کہ میں اور میرے پروکار پوری بصیرت سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ خدا منزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

۱۰۹۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجا مگر شہر والوں میں سے ان مردوں کو کہ جن کی طرف ہم نے وحی کی ہے۔ کیا (تیری دعوت کے مخالفین نے) زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

۱۱۰۔ (انبیاء نے اپنی دعوت اور دشمنوں نے اپنی مخالفت اسی طرح جاری رکھی) یہاں تک کہ پیغمبر مایوس ہو گئے اور انہوں نے گمان کیا کہ (حتی مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی) ان سے جھوٹ بولا تو اس موقع پر جاری مدد ان کے پاس آئی۔ ہم جس شخص کو چاہتے ہیں نجات دیتے ہیں اور زیاں کار قوم کے لئے ہماری سزا اور عذاب کو پلٹا یا نہیں جاسکتا۔

۱۱۱۔ ان کی سرگزشتوں میں صاحبانِ فکر کے لئے درس عبرت ہے۔ یہ واقعات جھوٹی بات نہیں تھے بلکہ (آسمانی وحی ہے اور) گزشتہ آسمانی کتب) سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے سامنے ہیں اور ہر چیز (کہ جو سعادت انسانی کی بنیاد ہے) کی تشریح اور ہدایت و رحمت ہے ایسے گروہ کے لئے کہ جو ایمان لایا ہے۔

عبرت کے زندہ درس

زیر نظر پہلی آیت میں پیغمبر اسلام سے اپنے آئین، دین، روش اور خط کو مشخص کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: کہہ دو: میری راہ اور طریقہ یہ ہے کہ سب کو اللہ کی طرف (کہ جو ایک اکیلا خدا ہے) دعوت دوں ﴿قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ﴾۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ سفر میں نے بے خبری یا تقلیداً اختیار نہیں کیا بلکہ میں خود اور میرے پیروکار دنیا کے سب لوگوں کو اس راستے کی طرف آگاہی اور بصیرت سے بلاتے ہیں ﴿عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾۔

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم کا پیروکار ہر مسلمان اپنے مقام پر حق کی طرف بلانے والا ہے اسے چاہیئے کہ اپنی گفتار اور کردار سے دوسروں کو راہِ خدا کی طرف دعوت دے۔ نیز یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ "رہبر کو کافی بصیرت، بینائی اور آگاہی کا حامل ہونا چاہیئے ورنہ اس کی دعوت حق کی طرف نہیں ہوگی۔

اس کے بعد بطور تاکید کہا گیا ہے: خدیعنی وہ ذات جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں. ہر قسم کے عیب، نقص، شبیہ اور شریک سے پاک اور منزہ ہے ﴿و سبحان اللہ﴾۔

مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: "میں مشرکین میں سے نہیں ہوں" اور میں اس کے لئے کسی قسم کے شبیہ و شریک کا قائل نہیں ہوں ﴿وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

واقعاً ایک سچے رہبر کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ صراحت سے اپنے پروگراموں اور اہداف کا اعلان کرے اور وہ خود اور اس کے پیروکار بھی ایک مشخص پروگرام کی پیروی کریں۔ نہ یہ کہ اس کا ہدف، روش اور طریقہ ابہام میں ہو یا یہ کہ ہر ایک الگ الگ راہ پر چل رہا ہو۔ اصولی طور پر سچے رہبروں کو جھوٹے رہبروں سے جدا پہچاننے کا یہی ایک راستہ ہے کہ یہ صراحت سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا راستہ واضح ہوتا ہے جب کہ جھوٹے کاموں کا چھپائے رکھتے ہیں اور ہمیشہ مبہم پہلو دار باتیں کرتے ہیں۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) سے متعلق آیات کے بعد اس آیت کا آنا اس طرف اشارہ ہے کہ میری راہ و رسم خدا کے عظیم پیغمبر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی راہ و رسم سے جدا نہیں ہے۔ وہ بھی ہمیشہ یہاں تک کہ گوشہ زندان میں بیٹھ کر بھی خدائے واحد و قہار کی طرف دعوت دیتے تھے اور اس کے اغیار کو اسماء بے مسمیٰ شمار کرتے تھے کہ جو تقلیداً جاہلوں کے ایک گروہ سے دوسرے تک پہنچے تھے۔ جی ہاں! میری روش اور تمام انبیاء کی روش یہی ہے۔

گمراہ اور نادان قوموں کی طرف سے انبیاء پرہمیشہ یہ اعتراض ہوتا تھا کہ وہ انسان کیوں ہیں، یہ ذمہ داری فرشتے کے کندھے پر کیوں نہیں رکھی گئی؟ طبعاً زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی پیغمبر اسلام پر ان کی عظیم دعوت کے جواب میں یہی اعتراض کرتے تھے لہٰذا قرآن مجید ایک مرتبہ پھر اعتراض کا جواب دیتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ مرد تھے کہ جن کی طرف وحی نازل ہوتی تھی، ایسے مرد کہ جو آباد شہروں اور عوامی مراکز سے اٹھتے تھے ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلاَّ رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى﴾۔

وہ بھی انہی شہروں اور آبادیوں میں دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور لوگوں سے میل جول رکھتے تھے ۔ان کی مصیبتوں، تکلیفوں، ضروتوں اور مشکلوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

آیت میں لفظ "من اہل قریٰ" آیا ہے، یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ "قریة" ہر قسم کے شہر آباد ی کو کہا جاتا ہے اور یہ لفظ "بدو" کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہے بیابان۔ ہوسکتا ہے یہ ضمنی طور پر اس طر اشارہ ہو کہ انبیاء الٰہی ہرگز بیابانوں نشینوں میں سے نہیں ہوتے تھے (جیسا کہ بعض مفسرین نے تصریح بھی کی ہے) کیونکہ بیابانوں میں گردش کرنے والے عام طور پر جہالت، نادانی اور قساوت قلبی میں گرفتار ہوتے ہیں اور مسائل زندگی اور روحانی و مادی ضروریات سے بہت کم آگاہی رکھتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ سرزمین حجاز میں صحرا نورد اعراب او ربدو بہت زیادہ تھے لیکن پیغمبر اسلام مکہ میں مبعوث ہوئے کہ جو اس وقت نسبتاً بڑا شہر تھا اور یہ ٹھیک ہے کہ کنعان کا علاقہ سرزمین مصر کہ جس میں یوسف (علیہ السلام) حکومت کرتے تھے کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسی بناء پر حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس کے بارے میں لفظ "بدو" استعمال کیا لیکن ہم جانتے ہیں پیغمبر خدا حضرت یعقوب (علیہ السلام) اور ان کے بیٹے کبھی بھی صحرانورد اور بیاباں نشین نہیں تھے بلکہ ایک چھوٹے سے قصبے کنعان میں زندگی بسر کرتے تھے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: یہ جو تیری دعوت کے خلاف ہیں، جب کہ تیری دعوت توحید کی طرف ہے ان کے لئے بہتر ہے کہ جائیں اور گزشتہ لوگوں کے آثار اور نشانات دیکھیں تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ ان کی مخالفتوں کا انجام کیا ہوگا۔ کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ وہ دیکھ سکتے کہ گذشتہ قوموں کا انجام کیا ہوا ﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾۔

کیونکہ یہ ”زمین میں سیر“ روئے زمین پر گردش ۔ گزشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ اور عذاب الٰہی کی تباہ کن ضربوں کے نتیجے میں ان کے محلوں اور آبادیوں کی ویرانی بہترین درس ہے ۔ یہ زندہ اور محسوس درس ہے اور ایسا درس ہے جو سب کے لئے قابل لمس ہے ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے مسلماً بہتر ہے ﴿وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا﴾۔

کیا تمام عقل سے کام نہیں لیتے اور اپنی فکر و نظر کو کام میں نہیں لاتے ﴿أَفَلاَتَعْقِلُونَ﴾۔ کیونکہ یہاں کا گھر تو ناپائیدار ہے ۔ یہاں تو طرح طرح کے مصائب و آلام و تکلیفیں ہیں لیکن وہاں کا گھر جاودانی ہے اور ہر قسم کے رنج و تکلیف اور پریشانی سے خالی ہے ۔

بعد والی آیت میں انبیاء کی زندگی کے حساس ترین اور زیادہ بحرانی لمحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : خدائی پیغمبر حق کی طرف دعوت دینے کی راہ میں استقامت دکھاتے تھے اور ڈٹے رہتے تھے اور دوسری طرف گمراہ اور سر کش قومیں اپنی مخالفت کو اس طرح جاری رکھتی تھیں کہ آخر کار انبیاء مایوس ہو جاتے اور گمان کرنے لگتے کہ شاید مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی ان سے جھوٹ بولا ہے اور اپنی دعوت کے راستے میں وہ تن تنہا ہیں ۔ اس وقت کے جب ہر طرف سے ان کی امید ختم ہو گئی تو ہماری طرف سے نصرت و کامیابی آپہنچی جسے ہم چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں ، نجات دیتے ہیں

﴿حَتَّى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَائَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ﴾ ۔[1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : ہمارا عذاب و عقاب گنہگار اور مجرم قوم سے پلٹا ی انہیں جائے گا ﴿ وَلاَيُرَدُّ بَأْسُنَا عَنْ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾۔

یہ ایک سنت الٰہی ہے کہ جب مجرمین اپنے کام پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کرلیتے ہیں اور ان پر اتمام حجت ہو جاتی ہے تو پھر خدائی عذاب اور سزائیں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور پھر کسی کی قدرت میں نہیں کہ انہیں پلٹا سکے ۔

اس آیہ کی تفسیر کے متعلق اور یہ کہ ” ظنوا انھم قد کذبوا “ کس گروہ کے بارے میں ہے ، مفسرین کی مختلف آراء ہیں

۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے یہی تفسیر بہت سے علماء نے انتخاب کی ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کا معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا تھا کہ وہ گمان کرنے لگتے کہ بغیر کسی استثناء کے تمام لوگ ان کی تکذیب کریں گے یہاں تک کہ اظہار ایمان کرنے والے مومنین بھی اپنے عقیدے میں ثابت قدم نہیں ہیں ۔

اس کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "ظنوا" کا فاعل مومنین ہیں ۔ یعنی مشکلات اور بحران کا عالم یہ ہوتا کہ ایمان لانے والے یہ خیال کرتے کہ کہیں انبیاء کی طرف سے دیا جانے وال نصرت و کامیابی کا وعدہ غلط نہ ہو اور یہ سوئے ظن اور تزلزل نئے ایمان لانے والوں میں پیدا ہونا کوئی بعید نہیں ہے ۔

بعض نے آیت کی ایک اور تفسیر بھی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " انبیاء بلا کش و سبہ بشر تھے ۔ جب انہیں زیادہ طولانی حالات کا سامنا ہوتا تو حالات کی اس سنگینی کا اثر ان پر بھی ہوتا ۔ وہ دیکھتے کہ تمام دروازے بند ہو گئے ہیں او رکشائش کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا ، طولانی حوادث کے تھپیڑ مسلسل انہیں پڑتے اور جن مومنین کے صبر کا یمانہ لبریز ہو جاتا ان کی فریاد متواتر ان کے کانوں سے تکراتی رہتی ۔

جی ہاں ! اس حالت میں ایک ناپائیدار لمحے میں طبیعت بشری کی بناء پر بے اختیار یہ فکر ان کے دماغ سے ٹکراتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کامیابی کا وعدہ ہی غلط ثابت ہو جائے یا ممکن ہے کامیابی کا وعدہ ایسے شرائط سے مشروط ہو کہ جو حاصل نہ ہوئی ہوں لیکن بہت جلد وہ اس فکر پر غالب آجاتے اور اسے صفحہ دل سے محو کردیتے اور امید کی بجلی ان کے دلوں میں کوندنے لگتی اور اس کے ساتھ ہی کامیابی کے آثار اور ہراول دستے ظاہر ہوتے " ۔

اس تفسیر کے لئے انہوں نے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ سے شاہد پیش کیا ہے :

﴿حتی یقول الرسول و الذین أمنوا معه نصر الله﴾

یعنی ۔ گزشتہ قومیں شدائد و مصائب کے بھنور میں اس طرح پھنس گئیں اور وہ خود سے لرزنے لگیں یہاں تک کہ ان کے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے پکار کے کہتے تھے : کہاں ہے خدا کی نصرت . لیکن انہیں جواب دیا جاتا تھا :

﴿الا ان نصر الله قریب﴾

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں یہ احتمال ذکر کرنے کے بعد اسے بعید قرار دیا ہے کیونکہ مقامِ انبیاء سے اس قدر بھی بعید ہے ۔

بہر حال پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے ۔

اس سورہ کی آخری آیت ایک جامع مضمون کی حامل ہے ۔ اس میں وہ تمام مباحث مختصر سے الفاظ میں جمع کردیئے گئے ہیں جو اس سورہ میں گزرے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت یوسف (علیہ السلام)، ان کے بھائیوں، گزشتہ انبیاء و مرسلین اور مومن و غیرہ قوموں کی سرگزشتاور حالات ِ زندگی میں غور وفکر کرنے والے تمام صاحبانِ عقل کے لئے عبرت کے عظیم درس موجودہیں ﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾۔

گزرے ہوؤں کی سرگزشت ایک آئینہ جس میں فتح و شکست، کامیابی و ناکامی، خوبختی و بدبختی اور سربلندی و ذلت سب کچھ بھی دیکھا جاسکتا ہے، خلاصہ یہ کہ انسان اس آئینے میں وہ کچھ دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت اور منزلت رکھتا ہے اور وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت و منزلت نہیں رکھتا ۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں گزشتہ قوموں اور عظیم رہبروں کے تمام تجربات کا ماحصل نظر آتا ہے ۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس کا مشاہدہ کم عمر والے انسان کو تمام عالم بشریت کی عمر کے برابر طولانی زندگی والا کر دیتا ہے ۔

لیکن صرف اولو االباب اور صاحبان فکر ہی ہیں جو اس عجیب و غریب آئینہ سے ان نقوش عبرت کو دیکھ سکتے ہیں ۔

مزید فرمایا گیا ہے: جو کچھ کہا گیا ہے کوئی گھڑا ہوا افسانہ اور خیالی داستان نہیں ہے ﴿مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى﴾۔

یہ آیات جو تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور گزشتہ لوگوں کو صحیح تاریخ کے چہرے سے پردہ ہٹاتی ہیں تیرے دماغ اور فکر کی پیدا وار نہیں ہیں " بلکہ یہ ایک عظیم آسمانی وحی ہے، گزشتہ انبیاء کی بنیادی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی شہادت دیتی ہے " ﴿وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ۔

علاوہ ازیں جس چیز کی انسان کو ضرورت ہے اور جو کچھ اس کی سعادت اور تکامل کے لئے درکار ہے وہ ان آیات میں آیا ہے ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ۔

اسی بناء پر یہ جستجو کرنے والوں کے لئے سرمایہ ہدایت ہے اور تمام ایمان لانے والوں کے باعثِ رحمت ہے ﴿وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾۔

گویا مندرجہ بالا آیت میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ کوبصورت اور دل انگیز داستانیں و بہت ہیں اور تمام قوموں میں ہمیشہ خیالی اور دلکش افسانے بہت رہے ہیں. کہیں کوئی یہ تصور نہ کرے کہ یوسف (علیہ السلام) کی سر گزشت یا قرآن میں آنے والے دیگر انبیاء کے واقعات بھی اسی قبیل سے ہیں ۔

یہ امر بہت اہم ہے کہ یہ عبرت انگیز اور جھنجھوڑ نے والے واقعات عین حقیقت ہیں اور ان میں ذرہ بھر انحراف نہیں اور نہ کوئی خارجی چیز ان میں شامل کی گئی ہے ۔ اسی بناء پر ان کی تاثیر بہت زیادہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خیالی افسانہ کتنا ہی جاذب نظر، ہلادینے والا اور مرتب و منظم ہو اس کی تاثیر ایک حقیقی واقعے کی نسبت کچھ بھی نہیں ہے ..کیونکہ :

اولاً:۔ جس وقت سننے والا پڑھنے والا داستان کے زیادہ ہیجان انگیز لمحات تک پہنچتا ہے اور اس سے لرز نے لگتا ہے تو اچانک یہ خیال بجلی کی کرنٹ کی طرح اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک خیالی تصوراتی چیز سے زیادہ کچھ نہیں ہے ۔

ثانیاً:۔ یہ واقعات اور داستانیں در اصل انہیں پیش کرنے والے کی فکر کو بیان کرتی ہیں ۔ وہ اپنے افکار اور خواہشات کا نچوڑ داستان کے ہیرو کے کردار میں مجسم کرتا ہے ۔

لہٰذا ایک خیالی داستا ن ایک انسان کی فکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ چیز ایک عینی حقیقت سے بہت مختلف ہے ۔خیالی بات کہنے والے کی نصیحت اور وعظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن انسانوں کی حقیقی تاریخ کی یہ صورت نہیں ہے وہ تو نتیجہ خیز، پر برکت اور ہر لحاظ سے راہ کشا ہوتی ہے ۔

سورہ یوسف (علیہ السلام) کا اختتام

پروردگارا !

ہمیں چشم بینا ، گوش سنوا اور قلب دانا مرحمت فرما ۔

تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کی سرگزشتوں سے اپنی نجات کے راستے تلاش کرسکیں اور ان مشکلات سے نکل جائیں کہ جن میں اس وقت ہم غوطہ زن ہیں ۔

خدا وندا !

ہمیں تیز نگاہ عطا فرما ۔

تاکہ ہم اقوامِ عالم کے انجام سے سبق حاصل کریں اور کامیابی کے بعد اختلاف و انتشار کی بناء پر دردناک ترین شکستوں سے دوچار ہونے والی اقوام کو ہم دیکھیں اور اس طرح ہم اس راستے پر نہ چلیں جس پر وہ قومیں چلی ہیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں ایسی خالص نیت عطا فرما. کہ ہم نفس کے دیو کے سر پر پاؤں رکھ دیں اور ایسی معرفت عطا فرما. کہ
ہم کامیابی پر مغرور نہ ہوں اور ایسی گزشت و بخشش عطا فرم کہ
اگر دوسرا ہم سے بہتر اکام انجام دے تو وہ کام ہم اس کے سپرد کردیں ۔

اگر یہ چیزیں تو ہمیں مرحمت فرمادے تو ہم تمام مشکلات پر کامیابی حاصل کرسکتے ہیں اور ہم اسلام و قرآن کا چراغ ساری دنیا میں روشن رکھ سکتے ہیں ۔

۱۔ ''حتیٰ'' محذوف جملے کے لئے غایت و انتہا کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: ان الرسل اقاموا علی دوتھم و الکافرین بھم علی مخالفتھم حتیٰ ازا تیئس الرسل

سورہ رعد

آسمان و زمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیاں ہیں

اس سورہ کے آغاز میں ہم پھر قرآن کے حروف مقطعات کا سامنا کررہے ہیں ۔ ایسے الفاظ قرآن کی ۲۹ سورتوں کی ابتداے میں آئے ہیں ۔یہاں آنے والے حروف در اصل " الم " اور " الر " کا مرکب ہیں جو چند دیگر سورتوں کی ابتداء میں الگ الگ آئے ہیں ۔ در حقیقت یہ وہ واحد سورۃ ہے جس کی ابتداء میں "المر " نظر آتا ہے اور چونکہ ہر سورہ کی ابتداء میں جو حروف مقطعات آتے ہیں وہ اس سورہ کے مضامین کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتے ہیں لہٰذا احتمال ہے کہ یہ ترکیب جو سورہ رعد کی ابتداء میں آئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ سورہ رعد کے مضامین ان دونوں قسم سورتوں کے مضامین کے جامع ہیں جن کی ابتداء میں " الم " اور الر " آیا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ ان سورتوں کے مضامین میں غور و خو کرنے سے اس امر کی تائید ہوتی ہے ۔

قرآن کے حروف مقطعات کی تفسیر کے بارے میں اب تک ہم نے سورہ بقرہ ، سورہ آل عمران ، اور سورہ اعراف کے آغاز میں تفصلی بحث کی ہے کہ جس کی تکرار کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

بہر حال اس سورہ کی سب سے پہلی آیت عظمت قرآن کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔

" یہ عظیم آسمانی کتاب کی آیات ہیں " ﴿تِلْکَ آیَاتُ الْکِتَابِ﴾ "۔(۱)

اور جو کچھ تیرے پر وردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے " ﴿وَالَّذِی أُنزِلَ إِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ الْحَقُّ﴾)۔اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حقائق عینی بیان کرنے والا جہاں آفرینش اور اس کے انسان سے روابط عینی کا شاہد ہے ۔

یہ ایسا حق ہے جو باطل میں ملا ہوا نہیں ہے ۔ اسی لئے اس کی حقانیت کی نشانیاں اس کے چہرے سے ہویدا رہیں اور یہ مزید استدلال کی ضرورت نہیں رکھتا ۔

لیکن اس کے باوجود بوالہوس اور نادان لوگ ، کہ جن کی اکثریت ہے، ان آیات پر ایمان نہیں لاتے ﴿وَلَکِنَّ أَکْثَرَ النَّاسِ لاَیُؤْمِنُونَ ﴾۔

کیونکہ اگر انسان کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور وہ پاک دل معلم کی پیروی نہ کرے کہ جو راہِ حیات میں اس کی ہدایت اور تربیت کرے اور اس طرح ہوا و ہوس کی پیروی کرنے میں بھی آزاد ہو تو اکثر وہ اپنے آپ کو ان کے اختیار میں دے دیں تو پھر اکثریت راہِ حق پر چلے گی۔

اس کے بعد توحید اور عالم آفرینش میں خدا کی نشانیوں کے اہم دلائل کی تشریح کی گئی ہے اور خاکی انسان کو آسمانوں کی وسعت میں گردش کرنے پر ابھارا گیا ہے اور اس کے لئے ان عظیم کروں، ان کے نظام حرکت اور ان کے اسرار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ وہ اس کی لامتناہی اور بے پایاں قدرت و حکمت کو جان سکے، کس قدر خوبصورتی سے فرمایا گیا ہے:

خدا وہی ہے جو آسمانوں کو جیسا تم دیکھتے ہو بغیر ستون کے قائم کئے ہوئے ہے یا وہ انہیں غیر مرئی ستونوں کے ساتھ بلند کئے ہوئے ہے ﴿اللّٰهُ الَّذِی رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾)۔[۲]

"بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" کے بارے میں دو تفسریں بیان کی ہیں:

پہلی یہ کہ "جس طرح تم دیکھتے ہو آسمان بغیر ستون کے ہے (گویا اصل میں ایسے تھا:﴿ترونها بغیر عمد﴾۔

دوسری یہ کہ "ترونها" صفت ہے "عمد" کے لئے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں کو بغیر کسی مرئی ستون کے بلند کیا گیا ، جس کا لازمہ ہے کہ آسمان کے لئے ستون جو غیر مرئی ہے۔

پہلی بات امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے حسین بن خالد کی حدیث میں آئی ہے، وہ کہتا ہے:

میں نے امام ابو الحسن علیہ السلام رضا علیہ السلام سے پوچھا: یہ خدا کہتا ہے "﴿والسماء ذات الحبک﴾" (اس آسمان کی قسم جو راستوں کا حامل ہے) اس سے کیا مراد ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

اس آسمان کے زمین کی طرف راستے ہیں۔

حسین بن خالد کہتے ہیں: میں نے عرض کیا:

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آسمان زمین کے ساتھ ارتباطی راستہ رکھتا ہو حالانکہ خدا فرماتا ہے: آسمان ستون کے بغیر ہیں

اس پر امام نے فرمایا:

سبحان اللہ ! لیس اللہ یقوم : بغیر عمد ترونها

سبحان اللہ ! کیا خدا نے نہیں فرمایا: بغیر ایسے ستون کے جو قابل مشاہدہ ہو؟

فقلت بلیٰ

راوی کہتا ہے: میں نے کہا جی ہاں

فقال ثم عمد ولکن لاترونھا

فرمایا: پس ستون تو ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے ۔ ۳

اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت کی تفسیر میں آئی ہے، اس آیت نے ایک سائنسی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ جو نزول آیات کے وقت کسی پر آشکار نہیں تھی کیونکہ اس نے زمانے میں بطلیموس کی ہیئت اپنی پوری طاقت کے ساتھ دنیا کے سائنسی مسائل اور لوگوں کے افکار و نظریات پر حکمران تھی اور اس کے مطابق آسمان ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکے کی طرح کرات کی شکل میں تھے۔ ظاہر ہے اس طرح تو ان میں کوئی بھی معلق اور ستون کے بغیر نہ تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کا سہارا لیئے ہوئے تھا لیکن ان آیات کے نزول کے تقریباً ایک ہزار سال بعد انسانی علم اس مقام پر پہنچا ہے کہ پیاز کے چھلکوں والے افلاک کی بات موہومی ہے۔

واقعیت یہ ہے کہ آسمانی کرات میں سے ہر ایک اپنے مدار اور جگہ سے بغیر کسی سہارے کے ثابت اور معلق ہے اور وہ واحد چیز جو انہیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے وہ قوت جاذبہ اور دافعہ کا اعتدال ہے کہ جن میں سے ایک ان کے کرات کے جرم سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ان کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے۔

جاذبہ و دافعہ کا یہ اعتدال غیر مرئی ستون کی شکل میں آسمانی کرات کو اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس سلسلے میں ایک حدیث جو امیر المومنین علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے بہت ہی جاذب نظر ہے۔ اس حدیث کے مطابق امام علیہ السلام نے فرمایا:

ھٰذہ النجوم التی فی السماء مدائن مثل مدائن فی الارض مربوطة کل مدینة الیٰ عمود من نور۔[۴]

یہ ستارے جو آسمان میں ہیں یہ زمین کے شہروں کی طرح شہر ہیں کہ جن میں سے ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) نور کے ایک ستون کے ذریعے مربوط ہے۔

کیا اس زمانے کے افق ادبیات میں قوت جاذبہ کی امواج اور ان کے قوتِ دافعہ میں اعتدال کے لئے "غیر مرئی ستون" اور "نورانی ستون" سے بڑھ کر روشن اور رسا تعبیر ہو سکتی تھی؟[۵]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا نے بغیر ستون کے ان آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد کہ جو اس کی لامتناہی عظمت و قدرت کی واضح نشانی ہیں عرش کا کنٹرول سنبھالا، یعنی عالم ہستی کی حکومت اپنے قبضے میں لی ﴿ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ﴾۔

"عرش" کے معنی اور اس پر خدا کے تسلط کے مفہوم کے سلسلے میں سورہ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں کافی بحث ہو چکی ہے ۔[۶]

آسمانوں کی خلقت اور ان پر پروردگار کی حکومت کا ذکر کرنے کے بعد سورج اور چاند کی تسخیر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہی ہے جس نے سورج اور چاند کا مسخر کیا اور انہیں فرمابردار اور خدمت گزار قرار دیا ﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ﴾۔

اس سے بڑھ کر اور کیا تسخیر ہوگی کہ یہ سب اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں نیز انسانوں اور تمام زندہ موجودات کے خدمت گزار ہیں، نور چھڑکتے ہیں ۔ ایک عالم کو روشن کرتے ہیں، موجودات کا بستر گرم کرتے ہیں، موجودات زندہ کی پرورش کرتے ہیں اور دریاؤں میں مدجزر پیدا کرتے ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ تمام حرکتوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہیں ۔

لیکن جہان مادہ کا یہ نظام جاودانی اور ابدی نہیں ہے اور شمس و قمر میں سے ہر ایک ، ایک مدتِ معین تک اپنے راستے پر حرکت جاری رکھے ہوئے ہے ﴿كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى﴾۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ یہ حرکات ، گردشیں ، آمد و شد اور تبدیلیاں بغیر کسی حساب و کتاب کے اور بے نتیجہ و بے فائدہ نہیں ہیں بلکہ " وہی ہے جو تمام کاموں کا تدبیر کرتا ہے " اور ہر حرکت کے لئے حساب اور ہر حساب کے لئے ہدف اور مقصد نظر میں رکھتا ہے ﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾۔

" وہ اپنی آیات تمہارے لئے شمار کرتا ہے اور ان کی باریکیاں تفصیل سے بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں لقائے پروردگار اور دوسرے جہان کا یقین پیدا ہو " ﴿يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ﴾۔

گزشتہ آیت انسان کو آسمانوں پر لے جاتی ہے اور عالم بالا میں اسے آیات الٰہی کی طرف متوجہ کرتی ہے دوسری آیت انسان کو توحیدی آیات کے مطالعے کی دعوت دیتی ہے ، انسان کو زمین ، پہاڑوں ، نہروں ، انواع و اقسام کے پھلوں اور سورج کے طلوع و غروب پر غور کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ وہ سوچ بچار کرے کہ اس مقامِ آسایش و آرام پہلے کیا تھا اور وہ اس شکل میں کیسے آیا۔

قرآن کہتا ہے: وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا ﴿وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ﴾۔ اس نے اسے یوں پھیلایا کہ وہ انسانی زندگی اور نباتات و حیوانات کی پرورش کے قابل ہو ۔ تند اور خطرناک گڑھوں اور ڈھلوانوں میں پہاڑ داخل کردیئے اور

انہیں پتھروں کو مٹی میں تبدیل کرکے پر کیا اور ان کی سطح کو قابل حیات بنایا حالانکہ ابتداء میں ان کے پیچ و خم ایسے تھے جن میں انسان کے لئے زندگی بسر کرنے کی گنجائش نہیں تھی ۔

اس جملے میں "مد الارض" سے یہ احتمال بھی ہے کہ جیسا کہ ماہرین ارض بھی کہتے ہیں ابتداء میں ساری زمین پانی کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی ۔ پھر پانی گڑھوں میں چلا گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی سے نمایاں ہونے لگیں اور دن بدن ان میں وسعت ِپیدائش ہوتی گئی یہاں تک کہ انہوں نے موجوداہ صورت حال اختیار کرلی۔

اس کے بعد پہاڑوں کی پیدائش کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدا نے زمین میں پہاڑ بنائے ﴿وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ﴾۔

وہی پہاڑ.... کہ جن کا قرآن کی دوسری آیات میں "اوتاد" (یعنی "اونچی میخیں") کے طور پر تعارف کروایا گیا ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے پہاڑوں نے ایک دوسرے میں پنجے ڈالے ہوئے ہیں اور زرہ کی طرح ساری سطح زمین کوڈھانپا ہوا ہے تاکہ اندرونی دباؤ بھی ختم کر سکیں اور باہر سے چاند کی بہت زیادہ قوت جاذبہ اور مد جزر کو بھی روکے رکھیں، اس طرح سے تزلزل اور دائمی زلزلون کو ختم کر سکیں اور کرہ زمین کو انسانی زندگی کے آرام و سکون کے لئے بر قرار رکھیں ۔

زمین کے پھیلانے اور بچھانے کے بعد پہاڑوں کا ذکر گویا اس طرف اشارہ ہے کہ زمین نہ اس طرح سے پھیلائی گئی ہے کہ اس میں کوئی پستی و بلندی نہ ہو کیونکہ اس صورت میں بارشیں اور پانی اس پر نہ ہوتے اور یا ہر جگہ ایک جوہڑ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی اور اس کی سطح پر دائمی طوفان جاری رہتے لیکن پہاڑوں کی پیدائش سے ان دونوں صورتوں میں امان مل گئی ہے اور نہ ساری زمین پہاڑوں اور دروں پر مشتمل ہے کہ زندگی کے قابل ہی نہ ہو یہ زمین مجموعی طور پر ہموار بھی ہے اور اس میں پہاڑ اور درے بھی ہیں جو نوع بشر اور دیگر زندہ موجودات کی زندگی کے لئے بہترین ترکیب ہے ۔

اس کے بعد ان پانیوں اور دریاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو روئے زمین پر چلتے ہیں ۔ فرمایا گیا یت: اور اس میں دریا جاری ہیں ﴿وَأَنْهَارًا﴾)۔

زمین کی آبیاری کا نظام پہاڑوں سے ارتباط کا دریاؤں سے تعلق بہت جاذب نظر ہے کیونکہ زمین کے بہت سے پہاڑوں کی چوٹیوں اور درّوں کے شگافوں میں برف کی صورت میں یہ دریا سٹور ہوتے ہیں جو تدریجاً پانی کی شکل اختیار کرتے ہیں اور قانون جاذبہ کے مطابق بلند ترین مقامات سے زیریں اور کشادہ علاقوں کی طرف سفر کرتے ہیں او ربغیر کسی قوت کی

احتیاج کے سال بھر طبیعی طور پر بہت وسیع زمینوں کی آبیاری کرتے ہیں اور انہیں سیراب کرتے ہیں اگر زمینون میں مناسب ڈھلوان نہ ہوتی اور پانی اس شکل میں پہاڑوں پر ذخیرہ نہ ہوتا تو زیادہ تر خشک علاقوں کی آبیاری کا امکان نہ ہوتا اور اگر آبیاری ممکن بھی ہوتی تو بہت زیادہ مخارج کی ضرورت پڑتی۔

اس کے بعد غذائی مواد اور ان پھلوں کا ذکر ہے کہ جو زمین، پانی اور سورج کی روشنی سے وجود میں آتے ہیں اور انسانی غذا کا بہترین وسیلہ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اور تمام پھلوں میں سے جوڑا جوڑا زمین پر قرار دیئے گئے ہیں ﴿وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پھل بھی زندہ موجودات ہیں اور ان میں بھی نر اور مادہ نطفے موجود ہوتے ہیں کہ جو تلقیح سے بار آور ہوتے ہیں۔ دانش مند "لینہ" اور مشہور ماہر نباتات "سوئنڈی" اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواسط میں یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ عالم نباتات میں زوجیت اور جفت کا معاملہ تقریباً عمومی اور کلی قانون ہے اور نباتات بھی حیوانات کی طرح نر اور مادہ کے نطفہ کی آمیزش سے بار آور ہوتے ہیں اور پھل دیتے ہیں جب کہ قرآن مجید نے اس سے گیارہ سو سال پہلے اس حقیقت کو فاش کردیا تھا۔ یہ خود قرآن مجید کا ایک علمی معجزہ ہے کہ جس سے اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لینہ سے پہلے بہت سے ماہرین اجمالی طور پر بعض نباتات میں نر اور مادہ کا وجود معلوم کر چکے تھے یہاں تک کہ عام لوگ بھی جانتے تھے کہ اگر کھجور کے درخت بور نہ دیں یعنی نر کا نطفہ مادہ حصوں پر نہ چھڑکا جائے تو وہ پھل نہیں دے گا لیکن کوئی شخص ٹھیک طرح سے یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قانون تقریباً سب کے لئے ہے یہاں تک کہ لینہ اسے معلوم کرنے میں کامیاب ہوا مگر جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن صدیوں پہلے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا چکا تھا۔

انسان اور دیگر تمام زندہ موجودات کی زندگی، بالخصوص نباتات، گیاہ پھلوں کی زندگی رات و دن کے دقیق نظام کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا آیت کے دوسرے حصے میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا رات کے ذریعے دن کو ڈھانپ دیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے ﴿يُغْشِي اللَّيْلَ النَهَارَ﴾)۔

کیونکہ اگر رات کا سکون بخش پردہ نہ ہوتو سورج کا دائمی نور تمام سبزوں اور نباتات کو جلا دے اور صفحہ زمین پر پھلوں کا بلکہ تمام زندہ موجودات کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔

کرہ مہتاب میں اگرچہ دن ہمیشہ نہیں رہتا لیکن وہاں دنوں کی لمبائی کرہ زمین کے پندرہ رات دن کے برابر اور دن کے وسط میں کرہ ماہتاب کا درجہ حرارت اتنا زیادہ ہوجاتا ہے کہ اگر پانی یا کوئی دوسری بہنے والی چیز ہو تو ابلنے لگے بلکہ اس کا درجہ حرارت اس سے بھی بڑھ جائے۔ کوئی زندہ موجود کہ جسے ہم زمین پرپہچانتے ہیں عام حالات میں یہ گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا: جو امور بیان کئے گئے ہیں ان میں آیات اور نشانیاں ہیں، ان کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾)۔

وہ لوگ جو اس بدیع اور تعجب خیز نظام میں سوچ بچار کرتے ہیں.... نور و ظلمت کے نظام میں، آسمانی کرات اور ان کی گردش کے نظام میں، آفتاب و مہتاب کی نورافشانی اور ان کی انسانوں کے لئے خدمت گزاری کے نظام میں، زمین بچھانے کے نظام میں، پہاڑوں اور دریاؤں کی پیدائش کے اسرار میں اور نباتات اور پھلوں کے نظام میں.... جی ہاں! جو لوگ اس نظام میں غور و فکر کرتے ہیں وہ ان میں قدرتِ لایزال کی آیات اور پروردگار کی حکمت ِبے پایاں واضح اور روشن طور پر دیکھتے ہیں۔

زیر بحث آخری آیت میں زمین شناسی اور نباتات شناسی کے جاذبِ نظر نکات کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک حساب شدہ نظامِ خلقت کی نشانی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ زمین میں مختلف قطعات اور ٹکڑے موجود ہیں کہ ایک دوسرے کے پاس ہمسائیگی میں ہیں ﴿وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ﴾۔

باوجودیکہ یہ سب قطعات ایک دوسرے سے متصل او رمربوط ہیں، ہر ایک کی ساخت اور استعداد خود اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض محکم ہیں اور بعض نرم، بعض نمکین ہیں اور بعض شرین اور ان میں سے ہر ایک خاص نباتات، درختوں، پھلوں اور زراعتوں کی پرورش کی استعداد رکھتا ہے۔

انسان او رزمین میں رہنے والے جانداروں کی ضروریات چونکہ بہت زیادہ اور مختلف ہیں لہٰذا زمین کا ہر قطعہ گویا ان میں سے ایک ضرورت کو پورا کرنے کی ماموریت رکھتا ہے اور اگر سب قطعات ایک ہی طرح کے ہوتے یا یہ استعدادیں ان میں صحیح طورپر تقسیم نہ ہوتیں تو انسان غذائی مواد، دواؤں اوردیگر ضروریات کے لحاظ سے کیسی کیسی کمیابیوں میں گرفتار ہوتا لیکن ماموریت کی اس حساب شدہ تقسیم کی وجہ سے مختلف قطعات زمین کو پرورش کی مختلف استعدادیں دئے جانے کے باعث یہ ضروریات مکمل طورپر پوری ہو جاتی ہیں۔

نیز یہ کہ " اسی زمین میں انواع و قسام کے انگوروں، اور زروعتوں اور کھجوروں کے باغات اورپودے موجود ہیں" ﴿وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ﴾(۷)

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ درخت اور ان کی مختلف انواع و اقسام کبھی تو ایک ہی پایہ و بنیاد پر اگتی ہیں اور کبھی مختلف پایوں اور بنیادوں پر﴿صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ﴾۔(۸)

" صنوان " جمع ہے "صنو" کی کہ جو دراصل شاخ کے معنی میں ہے کہ جو درخت کے اصلی تنے سے نکلتی ہے اس بناء پر " صنوان " کا معنی ہے " ایک تنے سے پھوٹنے والی مختلف شاخیں ۔

یہ جاذب نظر ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان شاخوں میں سے ہر ایک پھل کی ایک خاص قسم دیتی ہے ۔ یہ جملہ درختوں کی پیوند کی استعداد کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے ۔ کبھی ایک ہی پایہ اور شاخ پرچند مختلف پیوند لگائے جاتے ہیں اور ان پیوندوں میں سے ایک نشو و نما حاصل کرتا ہے اور اس سے پھل کی ایک خاص قسم حاصل ہوتی ہے... مٹی ایک، جڑ ایک اور شاخ ایک لیکن اس کا پھل اور محصول مختلف ہوتا ہے ۔

زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ " وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں ﴿يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ﴾)۔

ان تمام چیزوں کے باوجود " ہم ان میں سے بعض درختوں کو بعض دوسرے درختوں پر پھل کے لحاظ سے برتری اور فضیلت دیتے ہیں "﴿وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ﴾۔

یہاں تک کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک ہی درخت میں ای ایک ہی شاخ میں ایک ہی جنس کے پھل لگتے ہیں مگر ان کا ذائقہ اور رنگ مختلف ہوتا ہے ۔ اسی طرح پھلوں میں دنیا میں ہم نے بہت دیکھا کہ ایک ہی پودے میں بلکہ ایک ہی شاخ پر بالکل مختلف رنگوں والے پھل اگے ہوتے ہیں ۔

یہ کیسی تجربہ گاہ ہے اور کیسی اسرار آمیز لیبارٹری درختوں کی شاخوں میں لگائی جاتی ہے کہ جو بالکل ایک ہی مواد سے بالکل مختلف ترکیبات کو جنم دیتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک انسانی ضروریات کے ایک حصے کو پورا کرتی ہے ۔

کیا ان اسرار میں سے ہر ایک کسی ایک حکیم و عالم مبداء کے وجود کی دلیل نہیں کہ جو اس نظام کی رہبری کرتا ہے ۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ان امور میں عظمتِ خدا کی نشانیاں ہیں، ان کے لئے جو تعقل اور سوچ بچار رکھتے ہیں﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾)۔

۱۔جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا کہ "تلک" اسم اشارہ بعید ہے، اس کا انتخاب قریب کے اشارہ "ھذہ" کی بجائے قرآنی آیات کی عظمت و رفعت کے لئے کنایہ ہے۔

۲۔ "عمدہ " (بروزن " صمد ")اور "عمد " (بروزن "دھل ")دونوں عمود بمعنی "ستون " کی جمع ہیں اگرچہ ادبی لحاظ سے پہلے جمع اور دوسرے کو اسم جمع سمجھا جاتا ہے (مجمع البیان ۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

۳۔ یہ حدیث تفسیر برہان میں تفسیر علی بن ابراہیم اور تفسیر عیاشی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے ۔ (برہان جلد ۲ ص۲۷۸)

۴۔ سفینة البحار جلد ۲ ص ۵۷۴ منقول از تفسیر علی بن ابراہیم قمی۔

۵-مزید وضاحت کے لئے کتاب " قرآن و آخرین پیامبر " ص ۱۶۶ کے بعد کی طرف رجوع فرمائیں ۔

۶۔ تفسیر نمونہ جلد۶ ص۱۸۰ کی طرف رجوع فرمائیں ۔

۷۔ " اعناب" "عنب "کی جمع ہے اور " نخل " " نخل " کی جمع ہے اور شاید جمع کا صیغہ یہاں انگور اور کھجور کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان دو قسموں کے پھلوں میں سے ہر ایک کی شاہد مثال ہیں ذائقے اور رنگ کے اعتبار سے کئی سو اقسام ہیں ۔

۸۔ "صنو " کے لئے ایک اور معنی بھی ذکر ہوا ہے اور وہ ہے " شبیہ " لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی مذکورہ بالا معنی سے لیا گیا ہے ۔

آیات ۴،۳،۲،۱

﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔﴿المر تِلْکَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَالَّذِى أُنزِلَ إِلَيْکَ مِنْ رَبِّکَ الْحَقُّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَيُؤْمِنُونَ﴾۔

۲۔﴿اللهُ الَّذِى رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِى لِأَجَلٍ مُسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ﴾۔

۳۔﴿وَهُوَ الَّذِى مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِىَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِى اللَّيْلَ النَهَارَ إِنَّ فِى ذَلِکَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

۴۔﴿وَفِى الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِى الْأُكُلِ إِنَّ فِى ذَلِکَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۔ المرٰ یہ (آسمانی) کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

۲۔خدا وہی ہے جس نے آسمان کو قابل مشاہدہ ستون کے بغیر پیدا کیا پھر عرش کا کنٹرول سنبھالا (اور تدبیر عالم کی مہار اپنے ہاتھ میں لی) اور آفتاب و مہتاب کو مسخر کیا کہ ان میں سے ہر ایک معین زمانے تک حرکت رکھتے ہیں، وہی کاموں کی تدبیر کرتا ہے، (تمہارے لئے) آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین حاصل کرلو۔

۳۔ وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں اور اس میں تمام پھولوں کے دو جفت پیدا کئے۔ وہی دن کو رات (کا سیاہ پردہ) اوڑھاتا ہے۔ ان میں ان کے لئے آیات ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۴۔اور روئے زمین میں ایسے قطعات ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہونے کے باجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نیز انگور کے باغات، کھیتیاں اور نخلستان ہیں کہ جو کبھی ایک ہی پائے پر اگتے ہیں اور کبھی دوپایوں پر۔ وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض کو پھل لحاظ سے ایک دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ ان میں ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقل استعمال کرتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ توحید اور قیامت میں تعلق:

زیر بحث پہلی آیت کے آغاز میں اسرار خلقت اور توحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن آیت کے آخر میں ہے:

﴿یفصل الآیات لعلکم بلقاء ربکم توقنون﴾

خدا تمہارے لئے اپنی آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم قیامت او رمعادپر ایمان لے آؤ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مسئلہ توحید اور مسئلہ معاد کے درمیان کونسا تعلق ہے کہ جس کی بناء پر ان کا ذکر ایک دوسرے کے نتیجے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اعادہ کی بھی قدرت رکھتا ہے جیساکہ سورہ اعراف کی آیت ۲۹ میں ہے:﴿کما بدا ٔکم تعودون﴾

جیسے اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے ویسے ہیں پلٹائے گا۔

اور سورہ یٰس کے اواخر میں ہے:

کیا وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ان کی مثل ایجاد کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

ثانیاً جیسا کہ ہم معاد و قیامت می بحث میں کہا ہے کہ اگر عالم آخرت نہ ہوتو اس جہان کی خلقت فضول اور بیہودہ ہوگی کیونکہ یہ زندگی اس وسیع جہان کی خلقت کا مقصد نہیں ہوسکتی۔ قرآن مجید معاد سے مربوط آیات (مثلاً سورہ واقعہ آیہ ۶۲) میں کہتا ہے:﴿ولقد علمتم النشا ٔ ة الاولیٰ فلولا تذکرون﴾

تم نے جو اس جہان کو دیکھا تو پھر دھیان کیوں نہیں دیتے کہ یقینا اس کے بعد ایک اور جہان ہو گا۔ ۱

۲۔قرآن کی سائنسی معجزات:

قرآن مجید میں بہت سے آیات ایسی ہیں جو ایسے سائنسی اسرار کے ایک پہلو سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ جو اس زمانے کے ماہرین کی نظروں سے پوشیدہ تھے اور یہ امر خود قرآنی اعجاز اور عظمت کی نشانی ہے۔ وہ محققین کہ جنہوں نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں بحث کی ہے اکثر و بیشتر ان آیات کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ان میں سے ایک آیت سطور بالا میں ذکر ہوئی ہے کہ جو عالم نباتات میں زوجیت اور جفت ہونے کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ عالم نباتات میں زوجیت کا مسئلہ جزوی طور پر عرصہ قدیم سے جانا پہچانا تھا لیکن

ایک کلی اور عمومی قانون کے طور پر پہلی مرتبہ یورپ میں اٹھارھویں صدی کے وسط میں ایک اٹلی سائنسداں ”لینہ“ نے اس کا انکشاف کیا لیکن قرآن مسلمانوں کو ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی قبل اس کی خبر دے چکا تھا۔

یہ مسئلہ سورہ لقمان کی آیہ ۱۰ میں بھی بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿و انزلنا من السماء ماءً فانبتنا فیھا من کل زوج کریم﴾

ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین پر زوج اور جفت سے مفید گیاہ اُگایا۔

بعض دوسری آیات میں بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ سورج اور چاند کی تسخیر:

ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا کہ خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے ایسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ آسمانی کرات، زمینی موجودات اور رات دن وغیرہ سب انسان کے لئے مسخر ہیں، ایک موقع پر ہے:

﴿و سخر لکم الانھار﴾ خدا نے تمہارے لئے دریاؤں کو مسخر کیا ہے۔ (براہیم۔ ۳۲)

ایک اور موقع پر ہے: ﴿و سخر لکم الفلک﴾ تمہارے لئے کشتی کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم۔ ۳۲)

ایک اور جگہ ہے: ﴿وسخر لکم اللیل و النھار﴾ رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔ (نحل۔ ۱۲)

اور مقام پر ہے: ﴿سخر لکم الشمس و القمر﴾

سورج اور چاند تمہارے لئے مسخر کئے ہیں۔ (ابراہیم۔ ۳۲)

ایک اور جگہ پر ہے: ﴿وھو الذی سخر لبحر لتأکلو ا منہ لحماً طریاً﴾

تمہارے لئے دریا مسخر کیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ (نحل۔ ۱۴)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض﴾

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے ان تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے جو روئے زمین پر ہیں (حج۔ ۶۵)

ایک اور موقع پر ہے: ﴿وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعاً منہ﴾

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے لئے مسخر کیا ہے (جاثیہ۔ ۱۳)

ان تمام آیات سے مجموعی طور پر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ:

اولاً: انسان اس جہان کا اکمل اور ترقی یافتہ موجود ہے اور اسلام کی جہان بینی کی نظر سے اسے اس قدر مقام دیا گیا ہے کہ دوسرے تمام موجودات کو اس انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے کہ جو " خلیفۃ اللہ " ہے اور اس کا دل مقامِ نور خدا ہے۔

ثانیاً: ان آیات میں تسخیر ان معنی میں نہیں کہ یہ تمام چیزیں انسان کے تحت فرمان ہیں بلکہ اس قدر ہے کہ یہ اس کے فائدے اور منافع کے لئے اور اس کی خدمت کے لئے حرکت کر رہے ہیں۔

مثلاً آسمانی کرات اس کے لئے نور افشانی کرتے ہیں یا ان سے دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ اس کی تسخیر میں ہیں۔ کوئی مکتب و مذہب اس قدر بلند انسانی مقام کا قائل نہیں اور کسی فلسفہ میں انسان یہ حیثیت اور مقام نہیں رکھتا... اور یہ دین اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے انسانی وجود کی اہمیت اس حد تک بلند کر دی ہے کہ جس سے آگاہی انسانی تربیت اور ارتقاء کے لئے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے کیونکہ جب انسان یہ سوچے کہ خدا نے یہ تمام عظمتیں اسے بخشی ہیں اور۔

ابر و باد ماہ خورشید در کارند

یعنی .. بادل، ہوا، چاند، سورج سب محو کار ہیں اور سب اس کے فرمابردار اور خدمت گزار ہیں۔

ایسا انسان غفلت اور پستی کے لئے تیار نہیں ہوتا، اپنے آپ کو خواہشات و شہوات کا اسیر نہیں کرتا اور ثروت و مقام اور زر و زور کا غلام، نہیں بنات.... وہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آسمانوں کی اوج پر پرواز کرتا ہے۔

کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سورج اور چاند انسان کے مسخر نہیں ہیں حالانکہ وہ اپنی نورافشانی سے حیاتِ انسانی کو روشن اور گرم کئے ہوئے ہیں۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو کرہ ارض پر کوئی جنبش و حرکت نہ ہو۔

دوسری طرف سورج کی قوت جاذبہ زمین کی حرکت کو اس کے مدار میں منظم کرتی ہے۔

دریاؤں اور سمندروں کا مدو جزر چاند کی مدد سے پیدا ہوتا ہے کہ جو خود بہت سی برکات اور منافع کا سرچشمہ ہے۔

کشتیاں، دریا، نہریں اور دن رات ہر ایک کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے فائدے کے لئے رواں دواں ہیں۔

ان تسخیرات اور ان کے حساب شدہ نظام میں غور و فکر کیا جائے تو یہ خالق کی عظمت، قدرت اور حکمت کی واضح دلیل ہیں۔

آیات ۵،٦

۵۔﴿وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَئِذَا كُنَّا تُرَابًا أَئِنَّا لَفِی خَلْقٍ جَدِيدٍ أُوْلَئِکَ الَّذِينَ کَفَرُوا بِرَبِّهِمْ وَأُوْلَئِکَ الْأَغْلَالُ فِی أَعْنَاقِهِمْ وَأُوْلَئِکَ أَصْحَابُ النَّارِهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾۔

٦۔﴿وَيَسْتَعْجِلُونَکَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ الْمَثُلَاتُ وَإِنَّ رَبَّکَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَإِنَّ رَبَّکَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ﴾۔

ترجمہ

۵۔اور اگر تو (کسی چیز پر) تعجب کرنا چاہتا ہے تو ان کی گفتگو عجیب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم مٹی لوگئے تو ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور کیا)ہم نئی خلقت کے ساتھ پلٹ آئیں گے۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو اپنے پر وردگار سے کافر ہو گئے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی گردن میں زنجیریں اور یہ اہل نارہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

٦۔ وہ تجھ سے حسنہ (اور رحمت) سے پہلے جلدی سے سیئہ (اور عذاب) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے عبرت انگیز بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اور اگر چہ لوگ ظلم کرتے ہیں تیرا پروردگار ان کے لئے صاحبِ مغفرت ہے اور تیرا پر وردگار عذابِ شدید بھی رکھتا ہے۔

---

۱ -مزید وضاحت کے لئے کتاب " معاد و جہان پس از مرگ "کی طرف رجوع کریں۔

قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب

عظمت الٰہی کی نشانیوں کے بارے میں جو آیات گزری ہیں ان کے بعد زیر بحث پہلی آیت میں مسئلہ معاد پیش کیا گیا ہے اور مسئلہ مبداء و معاد میں جو خاص ربط اور تعلق ہے اس کی بنیاد پر اس بحثکو پختگی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اگر تم کسی چیز پر تعجب کرنا چاہتے ہو تو ان کی اس بات پر تعجب کرو کہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں نئی خلقت دی جائے گی ﴿وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَئِذَا كُنَّا تُرَابًا أَئِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾۔[1]

یہ وہی تعجب ہے جو تمام جاہل قوموں کو مسئلہ معاد کے بارے میں تھا۔ وہ موت کے بعد حیات ِنو اور خلقت ِجدید کو محال سمجھتے تھے حالانکہ گزشتہ آیات میں اور دیگر قرآنی آیات میں اس مسئلے کا اچھی طرح سے جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ آغاز خلقت اور تجدید خلقت میں کیا فرق ہے وہ ذات جو آغاز خلقت میں انہیں پیدا کرنے پر قادر تھی وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کے بدن کو حیات نو عطا کرے۔ گویا یہ اپنی خلقت کی ابتدا کو بھول چکے ہیں تبھی تو اس کی تجدید کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

پہلے کہتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے کافر ہو گئے ہیں ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ﴾۔ کیونکہ اگر یہ لوگ خدا کو اور اس کی ربوبیت کو قبول کرتے تو پھر معاد اور تجدید حیاتِ انسانی کے بارے میں شک نہ کرتے لہٰذا مسئلہ معاد میں ان کی خرابی مسئلہ توحید و ربوبیت ِالٰہی کے بارے میں ان کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

دوسرا یہ کہ کفر اور بے ایمانی اختیار کرنے کی وجہ سے اور توحید کے پرچم آزادی کے سائے سے نکل جانے کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو طوق و زنجیر میں گرفتار کر لیا ہے۔ انہوں نے بت پرستی، ہوسپرستی، مادہ پرستی اور جہالت و خرافات کے طوق اپنے ہاتھوں اپنی گردن میں ڈالے ہیں "اور ان کی گردن میں یہ طوق ہیں" ﴿وَأُولَئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ﴾۔

"اور اس کیفیت اور کردار کی وجہ سے ایسے لوگ یقینا اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے" اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی نتیجہ اور توقع نہیں ہے ﴿وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾)۔

بعد والی آیت میں مشرکین کی ایک اور غیر منطقی بات پیش کی گئی ہے ۔ فرمایا: بجائے اس کے کہ وہ تیرے ذریعے خدا سے رحمت کا تقاضا کرتے عذاب، کیفرکردار اور سزا میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں ﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾۔

یہ قوم اس قدر ہٹ دھرم اور جاہل کیوں ہے ۔ لوگ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اگر تو سچ کہتا تو ہم اس طرح یاس رحمتِ خدا نازل کر، الٹا کہتے ہیں کہ اگر تیری بات سچی ہے تو ہم پر عذابِ خدا نازل کر۔

کیا ان کا خیال ہے کہ خدا کی سزا اور عذاب کی بات غلط ہے " حالانکہ گزشتہ زمانوں میں سرکش امتوں پر عذاب نازل ہوئے " جن کی خبریں صفحاتِ تاریخ پر اور زمین کے دل پر ثبت ہیں ﴿وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ الْمَثُلَاتُ﴾)۔[2]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: لوگوں کی برائیوں، قباحتوں اور ظلم و ستم کے مقابلے میں خدا صاحبِ مغفرت ہے اور شدید العقاب بھی ہے ﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ﴾۔

اس کی شدت عقاب و سزا اس کی رحمتِ عام کے لئے ہرگز رکاوٹ نہیں جیسا کہ اس کی رحمتِ عام شدت عقاب و سزا کا وٹ نہیں ہے ۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہئیے کہ وہ ظالموں کو موقع دیتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں کریں کیونکہ ایسے مواقع پر تو وہ شدید العقاب ہے ۔ پروردگار کی یہ دو صفات یعنی "ذو مغفرۃ" اور " شدید العقاب" کے آثار کا تعلق خود انسان کے وجود سے ہے ۔

۱۔"ان تعجب فعجب قولھم" ۔ اس جملے کا در حقیقت یہ معنی ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں تعجب کرے تو ان کی بات پر تعجب کرو کیونکہ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے اور "فعجب قولھم" دراصل جملہ شرطیہ کی جزا ہے ۔

۲۔"مثلات" "مثلۃ" کی جمع ہے ۔ یہ بلاؤں اور سزاؤں کے معنی میں ہے جو گزشتہ امتوں پر اس طرح سے نازل ہوئیں کہ ضرب المثل ہوگئیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ خلقتِ نو کے بارے میں تعجب کیوں ؟ قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی مشکلات میں سے ایک مشرک قوموں کے سامنے معادِ جسمانی کے اثبات کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ لوگ ہمیشہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کس طرح انسان مٹی ہونے کے بعد دوبارہ حیات کی طرف پلٹ آئے گا ۔ یہ جو محل بحث آیات میں ہے :

﴿ء اذا کنا تراباً ء انّا لفی خلق جدید﴾

کیا جب ہم مٹی ہو جائیں تو دوبارہ حیاتِ نو پائیں گے۔

ایسی تعبیرات تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قرآن کی سات دیگر آیات میں موجود ہیں ، جو یہ ہیں :

مومنون ۔۳۵۔ مومنون ۸۲ نمل ۔۶۷ صافات ۔۵۳ ق ۳ اور واقعہ ۔۴۷

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اعتراض ان کی نگاہ میں بہت ہی اہم تھا ۔ تبھی تو ہر جگہ اسی کا سہارا لیتے تھے لیکن قرآن مجید بہت ہی مختصر عبارتوں میں انہیں دو ٹوک اور قاطع جواب دیتا ہے ۔ مثلاً سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں :

﴿کمابداء کما تعودون﴾

جیسا کہ ابتداء میں تمہیں پیدا کیا گیا ہے اسی طرح پھر لوٹائے جاؤ گے۔

چند الفاظ میں یہ ایک دندان شکن جواب ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے :﴿وھو اھوان علیه﴾

تمہاری بازگشت تو تمہارے آغاز سے بھی سادہ اور آسان ہے ۔ (روم ۔۲۷)

کیونکہ ابتداء میں تم کچھ بھی نہیں تھے لیکن اب کم از کم بوسیدہ ہڈی یا مٹی کی صورت میں تو تم موجود ہو۔

بعض مقامات پر قرآن لوگوں کو ہاتھ پکڑ کر وسیع کائنات زمین و آسمان میں عظمت قدرتِ خدا کا مشاہدہ کرواتا ہے او رکہتا ہے : کیا وہ ذات جو یہ سب کرات ، کہکشائیں ، ثوابت اور سیارے پیدا کر سکتی ہے اس کے اعادہ پر قادر نہیں ہے ۔(یٰس ۔۸)

۲۔کیا خدا ستمگروں کو بخش دیتا ہے :مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ پروردگار لوگوں کے ظلم کے باوجود صاحبِ مغفرت و بخشش ہے۔ مسلم ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا اپنی عفو و بخشش ان ظالموں کے شامل حال کرتا

ہے جو اپنے ظلم پر اصرار کرتے ہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ظالموں کو بھی اس وسیلے سے بازگشت اور اپنی اصلاح کا امکان فراہم کرے ورنہ دوسرے جملے میں ان کے انجام کی طرف اشارہ موجود ہے کہ "تیرا پروردگار شدید العقاب ہے"۔

ضمناً اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہانِ کبیرہ (کہ جن میں سے ایک ظلم ہے) بھی قابل بخشش ہیں (تمام تر شرائط کے ساتھ) یہ آیت اور اس جیسی دیگر آیات اس غلط بات کا دوٹوک اور قاطع جواب دیتی ہے جو قدیم زمانے سے معتزلہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ گناہاں کبیرہ کبھی بھی نہیں بخشے جائیں گے۔

بہر حال پروردگار کی "وسیع مغفرت" اور اس کے "شدید عقاب" کا ذکر در حقیقت سب کو میانہ راہ پر اور خوف و رجا کے درمیان لے آتا ہے کہ جس کا اہم عامل انسان کی تربیت ہے کہ نہ بالکل رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جائے چاہے اس کا جرم سنگین بھی ہو اور نہ ہی کبھی اپنے آپ کو اس کی سزا سے مامون سمجھے چاہے اس کا گناہ خفیف ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے روایت ہے:

لولا عفو اللہ وتجا وزہ ما ھنا احد العیش ، ولولا وعید اللہ و عقابہ لاتکل کل واحد

اگر خدا کی عفو و بخشش نہ ہوتی تو زندگی ہرگز کسی کے حلق میں گوارا نہ ہوتی اور اگر خدائی تہدیدیں اور سزائیں نہ ہوتیں تو ہر شخص اس کی رحمت کے نام پر جو چاہتا انجام دیتا۔[۱]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ گناہ انجام دیتے ہوئے بڑے غرور سے کہتے ہیں کہ "خدا کریم ہے" در حقیقت انہوں نے خدا کے کرم پر بھروسہ نہیں کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں اور اصل میں وہ پروردگار کی سزا اور عذاب سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

۱۔ مجمع البیان ص ۲۷۸ جلد ۵ و ۶ زیر بحث آیت کے ذیل میں، تفسیر قرطبی جلد ۶ ص ۳۱۴۔

آیت ۷

۷۔﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلاَأُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾۔

ترجمہ

۷۔ اور وہ جو کافر ہو گئے کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر آیت (اور معجزہ) کیوں نازل نہیں ہوا۔ تُوتو صرف ڈرانے والاہے اور ہر گروہ کے لئے ہدایت کرنے والا ہوتا ہے (اور یہ تو سب بہانے ہیں نہ کہ حقیقت کی جستجو)۔

پھر بہانہ سازی

گزشتہ آیات میں کچھ اشارہ مسئلہ توحید کے متعلق کئے گئے ہیں اور ایک اشارہ مسئلہ " معاد کی طرف کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد زیر بحث آیت میں ہٹ دھرم مشرکین کی طرف سے " نبوت " کے بارے میں ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : کفار کہتے ہیں : اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں کوئی معجزہ او رنشانی نازل نہیں ہوئی﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلاَأُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ﴾)۔

واضح ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی حقانیت کی سند کے طور پر اور وحی الٰہی سے اپنے تعلق کے ثبوت میں معجزات پیش کرے اور متلاشیانِ حق نبوت کی دعوت میں شک و تردید کے موقع پر حق رکھتے ہیں کہ معجزے کا مطالبہ کریں لیکن اگر نبوت کے دلائل دوسرے طریقے سے آشکار اور واضح ہوں تو پھر وہ حق نہیں رکھتے لیکن ایک نکتہ کی طرف بھرپور توجہ کرنا چاہئیے کہ مخالفینِ انبیاء ہمیشہ حسنِ نیت کے حامل نہیں ہوتے تھے معجزات حق معلوم کرنے کے لئے طلب نہیں کرتے تھے بلکہ ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے لئے بھی ہر وقت معجزے اور عجیب و غریب خارق ِعادت کا تقاضا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کہ جنہیں " معجزاتِ اقتراحی" کہا جاتا ہے ہر گز کشفِ حقیقت کے لئے نہیں تھے ۔ اسی لئے انبیاء ان کا تقا ضا تسلیم نہیں کر تے تھے ۔ در حقیقت ان ہٹ دھرم کفار کا یہ خیال تھا کہ پیغمبر (ص) کا دعویٰ ہے کہ میں ہر چیز انجام دینے پر قادر ہوں اور معجزہ گر ہوں اور یہاں بیٹھا ہوں جو شخص بھی کسی معجزے کا تقاضا کرے گا وہ پیش کرودوں گا ۔

لیکن انبیاء یہ حقیقت بیان کرکے ایسے لوگوں کی خواہشات ٹھکرادیتے تھے کہ معجزات خدا کے ہاتھ میں ہیں اوراس کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور ہماری ذمہ داری لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے ۔

اسی لئے زیر بحث آیت میں ہے کہ خدا تعالیٰ اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے: اے پیغمبر تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم و ملت کے لئے ہادی و رہنما ہوتا ہے﴿إِ نَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾۔

دو سوال اور ان کے جواب

۱۔ کافروں کا جواب کیسے ہوا؟

سوال پیدا ہوا کہ ﴿إِ نَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾کس طرح کافروں کی معجزہ طلبی کا جواب ہو سکتا ہے۔

جو بات مندرجہ بالا سطور میں کہی گئی ہے اس کی طرف توجہ دینے سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر ایک ایسی شخصیت نہیں کہ ہر تقاضے، ہر مقصد اور ہر مراد کے لئے معجزہ ایجاد کردے۔ پہلے تو اس کی ذمہ دای ہے "انذار" اور انہیں ڈرانا جو بے راہ چلتے ہیں اور صراط مستقیم کی دعوت دینا۔ البتہ جس مقام پر انذار اور ڈرانے کی تکمیل کے لئے اور گمراہوں کی صراط مستقیم پر لانے کے لئے معجزے کی ضرورت ہو مسلم ہے کہ پیغمبر کوتاہی نہیں کرے گا۔ البتہ ان ہٹ دھرم لوگوں کے جواب میں ہرگز اس کی ایسی کوئی ذمہ داری نہیں جو بالکل راستے پر نہیں آتے۔

در اصل قرآن کہتا ہے کہ یہ کفار پیغمبر کی اصلی ذمہ داری بھول چکے ہیں اور وہ ہے انذار، ڈرانا اور خدا کی طرف دعوت دینا اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی بنیادی ذمہ داری معجزہ دکھانا ہے۔

۲۔ "لکل قوم ھاد" سے کیا مراد ہے؟

کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ دونوں صفات "منذر" ہادی" اور پیغمبر اکرم کی طرف لوٹتی ہیں۔ ان کے خیال میں در اصل یہ جملہ یوں ہے: ﴿انت منذر و هاد لكل قوم﴾

تو ہر قوم اور ہر گروہ کے لئے ڈرانے والا او رہادی ہے۔

لیکن یہی تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ واؤ نے "﴿لكل قوم هاد﴾" کو "﴿انما انت منذر﴾" سے جدا کردیا ہے۔ ہاں البتہ اگر لفظ "هاد" "لكل قوم" سے پہلے ہوتا تو یہ معنی پورے طور پر قابلِ قبول تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں مقصد یہ تھا حق کی طرف دعوت کرن ے والوں کی دو قسمیں بیان کی جائیں۔ پہلی قسم ان کے دعوت کرنے والوں کی جو انذار کریں اور ڈرائیں اور دوسری قسم ان دعوت کرنے والوں کی جو ہدایت کریں۔

حتماً آپ سوال کریں گے کہ "انذار" اور "ہدایت" میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "انذار" اس لئے کہ گمراہی اور بے راہ روی سے راستے کی طرف پلٹایا جائے اور صراطِ مستقیم پر پہنچایا جائے لیکن "ہدایت" اس لئے ہے کہ لوگوں کو راستے پر آجانے کے بعد آگے لے جایا جائے۔

حقیقت میں "منذر" "علت محدثۃ" یعنی ایجاد کرنے والے سبب" کی طرح ہے اور "ہادی" "علت مبقیۃ" یعنی باقی رکھنے والے اور آگے لے جانے والے سبب" کی مانند ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم "رسول" اور "امام" سے تعبیر کرتے ہیں۔ رسولِ شریعت کی بنیاد رکھتا ہے اور امام شریعت کا محافظ اور نگہبان ہے (اس میں شک نہیں کہ دیگر مواقع پر خود ذاتِ پیغمبر پر لفظ "ہادی" کا اطلاق ہوا ہے لیکن زیر بحث آیت میں "منذر" کے ذکر کے قرینے سے ہم سمجھتے ہیں کہ "ہادی" سے یہاں مراد وہ شخص ہے جو راہ پیغمبر کو جاری وساری رکھے اور اس کی شریعت کا محافظ و نگہبان ہو)۔

متعدد روایات کہ جو پیغمبر اسلام سے مروی ہیں اور شیعہ سنی کتب میں موجود ہیں ان میں آپ نے فرمایا ہے کہ: میں منذر ہوں اور علی ہادی ہیں۔

یہ روایات مندرجہ بالا تفسری کی مکمل طور پر تائید کرتی ہیں۔ چند ایک روایات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱) اسی آیت کے ذل میں فخر الدین رازی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

وضع رسول اللہ یدہ علی صدرہ فقال انا المنذر، ثم اومأ الی منکب علی علیہ السلام و قال انت الھادی بک یھتدی المھتدون من بعدی

رسول اللہ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر مارا اور فرمایا: میں منذر ہوں۔ پھر علی کے کندھے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا تو ہادی ہے اور تیرے ذریعے میرے بعد ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔[۱]

یہ روایت اہل سنت کے مشہور عالم علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسی طرح علامہ ابن صباغ مالکی نے "فصول المہمہ" میں، گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، طبری نے اپنے تفسیر میں، ابو حیان اندلسی نے اپنی تفسیر "بحر المحیط" میں، علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح دیگر بہت سے علماء نے نقل کی ہے

۲) حموینی جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں اپنی کتاب "فرائد السمطین" میں ابو ہریرہ اسلمی سے اس طرح نقل کرتے ہیں: ان المراد بالھادی علی (ع)

ہادی سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں

۳) "حبیب السیر" کے مولف میر غیاث الدین اپنی کتاب کی دوسری جلد ص ۱۲ پر اس طرح لکھتے ہیں:

قد ثبت بطرق متعددہ انه لما نزل قوله تعالیٰ " انما انت منذر و لکل قوم هاد" قال لعلی " انا المنذر و انت الهادی بک یا علی یهتدی المهتدون من بعدی"۔

متعدد طریق سے نقل ہوا ہے کہ جب آیت "﴿انما انت منذر و لکل قوم هاد﴾" نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: "میں منذر ہوں اور تو ہادی ہے اور میرے بعد ہدایت پانے والوں کی تیرے ذریعے ہدایت ہوگی"۔

آلوسی نے "روح المعانی" میں، شبلنجی نے "نور الابصار" میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے "ینابیع المودة" میں یہی حدیث انہیں الفاظ میں یا اس کے قریب قریب الفاظ میں نقل کی ہے۔

اکثر روایات میں اس حدیث کے راوی اگرچہ ابن عباس ہیں تا ہم یہ روایت ابن عباس میں منحصر نہیں ہے بلکہ حموینی کی نقل کے مطابق خود حضرت علی علیہ السلام سے بھی مروی ہے، آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

المنذر النبی و الهادی رجل من بنی هاشم یعنی نفسه

منذر پیغمبر ہیں ہادی بنی ہاشم میں سے ایک شخص ہے کہ اس سے مراد خود آپ کی ذات ہے۔ ۲

۱۔ تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۹ ص ۱۴۔

۲۔ اس حدیث میں اگرچہ مسئلہ ولایت اور خلافتِ بلا فصل کی تصریح نہیں کی گئی تا ہم اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہدایت اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے حضرت علی علیہ السلام میں منحصر نہ تھی بلکہ تمام سچے علماء اور رسول اللہ کے خاص اصحاب یہ کام انجام دیتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ "ہادی" کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کی تعارف آپ کے خاص امتیاز اور خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ آپ علیہ السلام بہترین اور افضل ترین ہادی کے مصداق ہیں اور اس قسم کا مطلب ولایت اور خلافتِ پیغمبر سے جدا نہیں ہو سکتا۔

آیات ۸،۹،۱۰

۸۔ ﴿اللهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَى وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ﴾۔

۹۔ ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِى﴾۔

۱۰۔ ﴿سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ﴾۔

ترجمہ

۸۔خدا ان تمام جنیوں سے آگاہ ہے جن کا ہر مادہ انسان یا مادہ جانور حامل ہے اور جسے رحم کرتے ہیں (اور مقررہ مدت سے پہلے جنتے ہیں) اور جسے زیادہ کرتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز کی مقدار معین ہے ۔

۹۔ وہ غیب و شہود سے آگاہ ہے او ربزرگ و متعال ہے ۔

۱۰ ۔ اسے فرق نہیں پڑتا کہ تم میں سے کچھ پنہاں گفتگو کرتے ہیں یا آشکار اور وہ جو رات کو خفیہ حرکت کرتے ہیں یا دن کی روشنی میں ۔

خدا کا بے پایاں علم

ان آیات میں پر وردگار کی کچھ صفات بھی ہیں اور یہ آیات توحید اور معاد کی بحث کی تکمیل بھی کرتی ہیں ۔یہاں پر وردگار کے وسیع علم اور ہر چیز کے بارے میں اس کی آگاہی کے متعلق گفتگو ہے۔ وہی علم جو نظام آفرینش ، عجائبات ِ خلقت اور دلائل ِتوحید کا سر چشمہ ہے ۔ وہی علم جو قیامت اور اس کی عظیم عدالت کی بیاد ہے ۔ ان آیات میں علم کے دونوں پہلوؤں (نظام آفرینش کا علم اوربندوں کے اعمال کا علم) کے بارے میں بات کی گئی ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : خدا ان جنینوں (جو بچے شکم مادر میں ہوتے ہیں) سے آگاہ ہے کہ جنہیں ہر عورت اور ہر مادہ جانور (اپنے شکم میں) اٹھائے ہوتا ہے ﴿اللهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَى﴾)۔

اور اسی طرح انہیں بھی جانتا ہے جنہیں رحم وقت مقرہ سے پہلے جن دیتے ہیں ﴿وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ ﴾۔[1]

اوریونہی ان سے باخبر ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے زیادہ روک رکھتے ہیں ﴿وَمَا تَزْدَادُ ﴾۔

مندرجہ بالا تین جملوں کی تفسیر کے بارے میں مفسیرن میں بہت اختلاف ہے ۔

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے بعض مفسرین حمل کی تین قسموں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں ۔یعنی کبھی وقت مقررہ پر پیدا ہوتا ہے ، کبھی وقت مقررہ سے پہلے (گویا درکار وقت کو اپنے اندر جذ ب کرلیتا ہے) اور کبھی وقت مقررہ کے بعد

۔ خدا ان تمام کو جانتا ہے ۔ وہ جنین کی تاریخ تولد اور لمحہ ولادت سے بے کم و کاست آگاہ ہے اور یہ ایسے امور میں سے ہے جسے کوئی شخص اورکوئی مشینری حتماً معین نہیں کرسکتی ۔ یہ علم پروردگار کی ذات پاک سے مخصوص ہے اور اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ رحمتوں اور جنینوں کی استعداد بالکل مختلف ہوتی ہے اور کوئی شخص بھی ان اختلافات سے حتماً اور کاملا آگاہ نہیں ہے ۔

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تین جملے حمل کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ ہیں ۔ پہلا جملہ خود جنین کی طرف اشارہ ہے کہ رحم اسے محفوظ کرلیتا ہے ۔ دوسرا جملہ خونِ حَض کی طرف اشارہ ہے جو رحم میں گرتا ہے اور جنین اسے جذب کرلیتا ہے، اسے چوستا ہے اور اسے نگل لیتا ہے اور تیسرا جملہ اضافی خون کی طرف اشارہ ہے جو حمل کے دنوں میں کبھی کبھار باہر گرتا ہے یا ولادت کے وقت یا س کے بعد رحم سے الگ ہوتا ہے ۔ (۲)

لیکن جو روایات تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی پہلے منعی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو ہم متن میں ذکر کرچکے ہیں.

اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں دیگر احتمالات بھی ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی مختلف ہونے کے باوجود دوسرے سے متضاد نہیں ہے اور ہوسکتا ہے یہ آیت ان تمام تفاسیر کی طرف اشارہ ہو ارگ چہ ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلی تفسیر کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے ۔ کیونکہ لفظ "تحمل" جنین کے اٹھانے کا معنی دیتا ہے اور اس کے قرینہ سے " تغیض" اور "تزداد" کے الفاظ دورانِ حمل کی کمی اور بیشی کی طرف اشارہ ہیں ۔

ایک حدیث جو امام محمد باقرعلیہ السلام یا امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، اس طرح ہے :الغیض کل حمل دون تسعة اشهر ، وما تزداد کل شیء یزداد علی تسعة اشهر

"غیض" ہر اس حمل کو کہتے ہیں جس کی مدت ۹ ماہ سے کم ہو اور " ماتزداد" ہر وہ چیز ہے جو ۹ ماہ سے زیادہ ہو ۔

اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں: کلمارأت المراة الدم الخالص فی حملها فانها تزداد و بعدد الایام التی زاد فیها فی حملها من الدم

جب عورت حمل کی حالت میں خالص خون دیکھے تو اس خون کے ایام کی تعداد کے برابر حمل کی مدت میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ (۳)

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ہر چیز خدا کے ہاں معین مقدار کی حامل ہے (وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ)۔ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ مدت حمل کی یہ کمی بیشی بغیر کسی حساب کتاب کے اور بغیر کسی سبب کے ہے بلکہ اس مدت کی ہر گھڑی اور ہر لحظہ نپا تُلا ہے۔

بعد والی آیت در حقیقت گذشتہ آیت میں بیان کی گئی بات کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا غیب و شہود (اور پنہاں و آشکار) سب کو جانتا ہے ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾۔

غیب و شہود کے بارے میں اس کی آگاہی اس بناء پر کہ "وہ بزرگ و برتر ہے، ہر چیز کے لئے متعال ہے اور ہر چیز پر مسلط ہے" اسی بناء پر وہ ہر جگہ حاضر ہے اور کوئی چیز اس کی نگاہِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے ﴿الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ﴾)۔

اس بحث کی تکمیل کے لئے اور اس کے علم بے پایاں کے بارے میں تاکید کے لئے مزید فرمایا گیا ہے "خدا کے لئے ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں کہ جو اپنی بات چھپاتے ہیں اور وہ جو آشکار کرتے ہیں وہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے ﴿سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ﴾۔

نیز اس کے لئے ان لوگوں میں کچھ فرق نہیں کہ جو خفیہ طور پر رات کی تاریکی میں اور ظلمت کے پردوں میں قدم اٹھاتے ہیں اور وہ کہ جو آشکارا روزِ روشن میں اپنے کاروبار کے لئے نکلتے ہیں ﴿وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ﴾)۔(۴)

چند اہم نکات

۱۔ قرآن اور جنین شناسی:

قرآن مجید میں بارہا جنین، اس کے عجائب و غرائب اور نظام کی طرف توحید، خدا شناسی اور حضرتِ حق کے علم بے پایاں کی ایک دلیل کے طور پر اشارہ ہوا ہے۔ البتہ جنین شناسی ایک بالکل نیا علم ہے۔ گزشتہ زمانے میں علماء اور سائنسداں جنین اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں بہت محدود اطلاعات رکھتے تھے لیکن علم اور سائنس کی پیش رفت کے ساتھ اس علم میں تیزی سے غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور اس خاموش اور بے آواز دنیا کے بہت سے اسرار و عجائب منکشف ہوئے ہیں اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ جنین کی خلقت، اس کے تحول اور تکامل میں خدا شناسی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

اس موجودہ کی کو نخبر پا سکتا ہے کہ جو ہر کسی کی دسترس سے باہر ہو قرآنی الفاظ میں جو " ظلمات ثلاث " (تین تاریکیوں) میں موجود ہو اور جس کی زندگی انتہائی ظریف اور دقیق ہو ۔ کون اسے ضروری مقدار میں غذا بہم پہنچا سکتا ہے اور کون تمام مراحل میں اس کی ہدایت کر سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا آیات میں جب خدا فرماتا ہے کہ " خدا جانتا ہے کہ ہر مادہ جانور کے رحم میں کیا ہے " تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ صرف اس کی جنسیت (یعنی نر یا مادہ ہونے) کے بارے میں آگاہ ہے بلکہ اس کی تمام مشخصات ، استعداد، ذوق اور طاقت کہ جو بالقوہ اس میں پوشیدہ ہے کے متعلق آگاہ ہے اور یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص کسی بھی ذریعے سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا ۔

اس بناء جنین میں حساب شدہ نظاموں کی موجودگی اور دقیق و پیچیدہ ارتقاء میں اس کی راہبری ایک عالم و قدار مبداء کے بغیر ممکن نہیں ۔

سورہ طلاق آیہ ۳ میں ہے :﴿قد جعل الله لکل شیء قدراً﴾

خدا انے ہر چیز کے لئے ایک مقدار معین کی ہے

سورہ حجر آیہ ۲۱ میں ہے :﴿و ان کان من شیء عنده نا خزائنه و ما ننزله الا بقدر معلوم﴾

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معین مقدار کے سوا نازل نہیں کرتے ۔

زیر بحث آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے :﴿وکل شیء عنده بمقدار﴾

اور تمام چیزوں کی اس کے یہاں مقدار ہے ۔

یہ سب آیات اس امر کی طرف اشارہ ہیں کہ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے یہاں تک کہ طبیعی دنیا میں جن موجودات کو ہم بغیر حساب کتاب کے فرض کرتے ہیں وہ سب دقیق او ر جچا تلا حساب رکھتی ہیں چاہے ہم اس سے جانیں یا نہ جانیں ۔ اصولی طور پر خدا کے حکیم ہونے کا بھی اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ ہر چیز کی خلقت میں ایک پروگرام ، حد اور مقدار معین ہوتی ہے ۔ جن اسرار خلقت کو ہم نے آج علوم کے ذریعے معلوم کیا ہے وہ اس حقیقت کو پورے طور پر تاکید کرتے ہیں ۔ مثلاً انسان کا خون کہ جو اس کے وجود کی زندگی کا سب سے اہم مادہ ہے اور جو تمام ضروری مواد کو انسانی بدن کے تمام خلیوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے ، بیس سے زیادہ عناصر کا مرکب ہے ان عناصر کا تناسب اور کیفیت اس قدر مہم دقیق اور جچی تلی ہے کہ اس میں تھوڑے سے تغیر سے بھی انسانی سلامتی خطرے میں

پڑجاتی ہے ۔یہی وجہ ہے بدن کی خرابیوں کو پہچاننے کے لئے فوراً خون ٹیسٹ کرتے ہیں اور شوگر، چربی اور اورہ، آئرن اور دیگر اجزائے ترکیبی کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور ان اجزاکی کمی بیشی سے فوراً بدن کی بیماریوں کے علل و اسباب معلوم کرلئے جاتے ہیں ۔

ان کا خون ہی ایسی دقیق ترکیب نہیں رکھتا بلکہ یہی صورت تمام عالم ہستی کی ہے ۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھار وہ چیزیں ہم عالم ہستی کی بے نظمیاں خیال کرتے ہیں اور دراصل ہمارے علم کی نارسائی اور ناپختگی سے مربوط ہیں ۔ ایک موحد اور سچا خدا پرست عالم کے بارے میں کبھی بھی ایسا تصور نہیں کرسکتا اور علوم کی تدریجی پیش رفت اسی حقیقت کی گواہ ہے ۔

اس گفتگو سے ہم یہ سبق بھی سیکھ سکتے کہ انسانی معاشرہ جو پورے نظام ہستی کا ایک حصہ ہے اگر صحیح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئیے کہ "شیء عندہ بمقدار" کا اصول اس کے سارے وجود پر حکمران ہو وہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے بچے اور ہر اس کام سے پرہیز کرے جو بغیر کسی حساب کتاب کے ہو اور اسکے تمام اجتماعی اصول چچے تلے ہونے چاہئیں ۔

۳۔ خدا کے لئے غیب و شہود برابر ہیں:

زیر بحث آیات میں یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ غیب و شہود بارگاہ خداوندی میں واضح اور روشن ہے ۔ بنیادی طور پر غیب و شہود دو نسبتی مفہوم ہیں کہ جو ایسے موجود کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں جس کا علم اور ہستی محدود ہوں ۔

مثلاً ہم جو حواس خمسہ کے حامل ہیں تو جو کچھ ہماری آنکھوں ، قوتِ سماعت اور دیگر حواس کی پہنچ کے اندر ہے وہ ہمارے "شہود" ہے اور جو کچھ ہماری دید و شنید سے باہر ہے ہمارے لئے وہ "غیب ہے"۔ فرض کیا اگر ہماری نگاہ کی قدرت لامحدود ہوتی، ہم اشیاء کے ظاہر و باطن کو دیکھ سکتے اور ذرات عالم کے اندے ہماری نظر اتر جاتی تو تمام چیزیں ہمارے لئے شہود" ہو جاتیں ۔ خدا کی ذات پاک کے علاوہ باقی تمام چیزیں چونکہ محدود ہیں لہذا ان تمام چیزوں کے لئے غُب و شہود موجود ہے لیکن ذات الٰہی چونکہ لامحدود ہے اور ہر جگہ موجود ہے لہذا اس کے لئے تمام چیزیں شہود ہیں اور اس کی ذاتِ پاک کے برے میں "غیب "کوئی مفہوم نہیں رکھتا ۔

اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا "﴿عالم الغیب و الشهادة﴾" ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے لئے غیب یا شہود ہے اس کے لئے یکساں اور شہود ہے ۔

اگر ہم روشنی میں اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھیں تو کیا ممکن ہے کہ جو کچھ اس میں ہو ہم اس سے بے خبر رہ جائیں۔ عالم ہستی علم خدا کے سامنے اس بھی کئی درجے زیادہ واضح و آشکار ہے۔

۴۔ علم خدا کی طرف کے تربیتی آثار:

یہ جو ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا پنہاں و آشکار چیزوں کو، رات اور دن کی آمد و رفت کو تمہاری تمام حرکات کو یکساں طور پر جانتا ہے اور اس کے علم کی بارگاہ میں یہ سب آشکار ہیں۔ اس حقیقت پر اگر ہم حقیقی ایمان رکھتے ہوں اور یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ہمارے اوپر ہر وقت نگران ہے تو اس سے ہماری روح، فکر، گفتار اور کردار میں ایک بہت گہرا انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام ایک سوال کیا: آپ کی زندگی کا پروگرام کیا ہے؟

آپ نے چند امور بیان فرمانے کے بعد فرمایا: علمت ان اللہ مطلع علی فاستحییت

میرا ایک پروگرام یہ ہے کہ میں نے جان لیا ہے کہ خدا میرے تمام کاموں سے آگاہ ہے اور ان کے بارے میں باخبر ہے لہٰذا میں اس کی نافرمانی سے حیا کرتا ہوں۔

تاریخ اسلام میں اور حقیقی مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں ہم اس حقیقت کے بہت سے جلوہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک باپ بیٹا ایک باغ میں پہنچے۔ باپ باغ کے مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑنے کے لئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کا بیٹا جو با معرفت نوجوان تھا کہنے لگا: ابا! نیچے اتر آؤ۔

باپ پریشان ہوا اور ڈرا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے فوراً نیچے اتر آیا۔ اس نے پوچھا: مجھے نظر نہیں آیا، کو تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا؟ لڑکے نے کہا تمہارے اوپر سے۔

اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

بیٹے نے کہا، میری مراد خدا ہے، جو ہم سب سے مافوق اور ہم سب پر محیط ہے، کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے دیکھنے سے تو تمہیں خوف آتا ہے لیکن خدا جو تمہیں ہر حالت میں دیکھ رہا ہے اس سے تجھے کوئی خوف نہیں آتا۔ یہ کیا ایمان ہے۔

۱۔ "تغیض" "غیض" کے مادہ سے ہے ۔ یہ اصل میں بہنے والی چیز کا نگل جانے اور اسے ٹھہرالینے کے معنی میں ہے اسی لئے یہ لفظ نقصان اور فساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔"غیض" ایسے مکان اور جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی کھڑا ہو جائے اور اسے نگل جائے " لیلۃ غائضۃ"تاریک رات کے معنی میں ہے (یعنی ایسی رات جو سارا نور نگل گئی ہو)۔

۲۔ تفسیر المیزان میں آیت کی اس تفسیر کی تائید کے ضمن میں صاحبِ تفسیر فرماتے ہیں کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں اور جو کچھ ابن عباس سے نقل ہوا ہے وہ بھی حتماً اسی معنی پر منطبق ہوتا ہے ۔

۳۔ نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۸۵۔

۴"سارب" اصل میں "سرب" (بروزن "ضرر") کے مادہ سے "جاری پانی" کے معنی میں ہے ۔ بعد از اں لفظ اس انسان کے بارے میں استعمال ہونے لگا جو کسی کام کے پیچھے چل رہا ہو۔ اصولی طور پر اس شخص کے لئے نور و ظلمت ، تاریکی و روشنی اور غیب و شہود کوئی مفہوم نہیں رکھتے جو ہر جگہ حاضر و ناضر ہے ۔ وہ یکساں طور پر ان سب سے آگاہ اور با خبر ہے ۔

آیت ۱۱

۱۱۔ ﴿لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللهِ إِنَّ اللهَ لَايُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللهُ بِقَوْمٍ سُوئًا فَلَامَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ﴾۔

ترجمہ

۱۱۔انسان کے لئے کچھ مامورین ہیں کہ جو پے درپے سامنے اور اس کے پیچھے سے اسے (غیر حتمی) حوادث سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن خدا کسی قوم (اور ملت) کی سرنوشت کو نہیں بدلتا مگر یہ کہ وہ خود اسے تبدیل کریں اور جب خدا کسی قوم کے بارے میں (ان کے اعمال کی وجہ سے) بُرا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کے لئے رکاوٹ نہیں ہوتی اور خدا کے علاوہ ان کا کوئی سرپرست نہیں ہوگا۔

غیبی محافظ

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا علم الغیب و الشهادة ہونے کی بناء پر لوگوں کے پنہاں اور آشکار سے باخبر ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

زیر بحث آیت میں مزید اشاد فرمایا گیا ہے: اس کے علاوہ کہ خدا اپنے بندوں کا محافظ اور نگہبان ہے "کچھ مامورین ہیں کہ جو پے در پے آگے اور پیچھے سے حوادث سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں" ﴿لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللهِ﴾۔(۱)

لیکن کوئی اس بناء پر کہ کوئی یہ اشتباہ نہ کرے کہ یہ حفاظت و نگہبانی بلا مشروط ہے اور انسان کہیں اپنے آپ کو ہر گڑھے میں نہ گرادے یا کہیں انسان ہر طرح کے گناہ کا مرتکب نہ ہونے لگے اور اس طرح اپنے آپ کو عذاب کا سزا وار بنا کر بھی توقع رکھے کہ خدا اور اس کے ماموِ محافظین اس کی حفاظت کریں، مزید فرمایا گیا ہے: خدا کسی قوم و ملت کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہ کرے ﴿إِنَّ اللهَ لَايُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾)۔دوبارہ اس لئے کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ انسانی حفاظت کے مامورین ہونے کے باوجود مجازات و سزا اور خدائی امتحانات کا کیا معنی ہے، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جس وقت خدا کسی قوم کے لئے برائی کا رادہ کرتا ہے تو پھر دفاع اور بازگشت کی کوئی بازگشت کی کوئی صورت نہیں ہے ﴿وَإِذَا أَرَادَ اللهُ بِقَوْمٍ سُوئًا فَلَامَرَدَّ لَهُ﴾۔

"اور خدا کے علاوہ ان کو کوئی والی و ناصر اور یار و مددگار نہیں ہو سکتا" ﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ﴾۔

اسی بناء پر جب کسی قوم کے لئے خدا کی طرف سے عذاب، سزا اور نابودی کا فرمان صادر ہوجاتا ہے تو محافظین اور نگہبان الگ ہو جاتے ہیں اور انسان کو حوادث کے سپرد کردیتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ "معقبات" کیا ہیں ؟

جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں اور بعض دوسرے بزرگ مفسرین نے کہا ہے " معقبات " جمع ہے " معقبہ " کی جب خود " معقبہ " بھی " معقب " کی جمع ہے اور یہ اس گروہ کو کہتے ہیں جس کے افراد پے درپے ایک دوسرے کی نیابت میں کسی کا کے لئے نکلیں ۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے کچھ فرشتوں کی یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ رات دن باری انسان کے پاس آئیں اور آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت کریں ۔

بیشک انسان اپنی زندگی میں بہت سی آفات و بلیات سے دوچار ہے ۔ اندرونی و بیرونی حوادث ، طرح طرح کی بیماریاں ، جرائم اور مختلف قسم کے حادثات و خطرات کہ جو زمین و آسمان سے ابھرتے ہیں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ خصوصاً بچپن کے زمانے میں جب گردو پیش کی کیفیتوں سے انسان بہت کم آگاہ ہوتا ہے ، اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا، ہر قدم پر اسے کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے اور کبھی تو انسان تعجب کرتا ہے کہ ان تمام حوادث سے بچہ کس طرح بچ نکلتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے گھرانوں میں جہاں ماں باپ مسائل سے بالکل آگاہ بھی نہیں ہوتے یا ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے ۔ خاص طور پر دیہات میں پلنے بڑھنے والے وہ بچے جو محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں اور بیماری اور خطرات کے عوامل میں گھرے ہوتے ہیں ۔

اگر ان مسائل پر ہم حقیقی طور پر غور وفکر کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ ایک محافظ طاقت ہے کہ جو ان حوادث سے ہماری حفاظت کرتی ہے اور سپر اور ڈھال کی طرح آگے اور پیچھے سے ہماری محافظ و نگہبان ہے ۔

بہت سے مواقع پر انسان کو خطرناک حادثات پیش آتے ہیں اور وہ معجزانہ طور پر ان سے بچ نکلتا ہے اس طرح سے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب چیزیں اتفاقی نہیں ہیں کہ بلکہ ایک محافظ طاقت اس کی نگہبانی کررہی ہے ۔

پیشوایان ِ اسلام سے مروی بہت سی روایات بھی اس پر تاکید کرتی ہیں ۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ زیر بحث آیت کی تفسیر میں آپ علیہ السلام نے فرمایا :

بحفظ بامر اللہ من ان یقع فی رکی علیه حائط او یصیبه شیء حتی اذاجاء القدر خلو بینه و بین یدفعونه الیٰ المقادیر و هما ملکان یحفظانه باللیل و ملکان من نهار یتعاقبانه

حکم خدا سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے، کنویں میں گرنے سے یا دیوار پر آپڑنے سے یا کوئی اور حادثہ سے مگر جب حتمی مقدرات آپہنچیں تو محافظین ایک طرف ہا جاتے ہیں اور اسے حوادث کے سپرد کردیتے ہیں ۔ اور دو فرشتے انسان کی رات کو حفاظت کرتے ہیں اور (ان کے علاوہ) فرشتے دن کے وقت باری باری ذمہ داری پوری کرتے ہیں ۔ ۲

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

مامن عبد الا و معه ملکان یحفظانه فاذا جاء الامر من عند اللہ خلیا بینه و بین امر اللہِ

کوئی بھی ایسا بندہ نہیں کہ جس کے ساتھ دو فرشتے نہ ہوں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہوں لیکن جب خدا کا قطعی فرمان آپہنچا ہے تو وہ اسے حوادث کے سپرد کردیتے ہیں ۔ (۳)

(اس بناء پر وہ انسان کی حفاظت صرف ان حوادث سے کرتے ہیں جن کے بارے میں خدا کا قطعی حکم نہیں ہوتا)۔

نہج البلاغہ میں بھی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

ان مع کل انسان ملکین یحفظانه فاذا جاء القدر خلیا بینه و بینه

یعنی ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہیں لیکن جب حتمی مقدرات آپہنچے تو وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں ۔ (۴)

اسی طرح نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں فرشتوں کی تعریف اور ان کے مختلف گروہوں کے بارے میں ہے :

و منهم الحفظة لعباده

ان میں سے ایک گروہ خدا کے بندوں کا محافظ ہے ۔

البتہ حسّی ذرائع سے یا طبعی علوم کے ذریعے ان فرشتوں کے وجود کے بارے میں عدم آگاہی ان کے وجود کی نفی کی دلیل نہیں ہو سکتی اور یہ بات زیر بحث آیت میں منحصر نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور اسی طرح دیگر مذاہب بہت سے ایسے امور کی خبر دیتے ہیں جو حس ّانسانی سے ماوراء ہیں کہ جن کے بارے میں انسان عام ذرائع سے آگاہی حاصل نہیں کرسکتا ۔

اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے کہ ہماری روز مرہ کی زندگی میں ہمیں اس محافظ قوت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ بہت سے تباہ کن حوادث سے ہم معجزانہ طور پر نجات حاصل کرتے ہیں کہ جن کی تفسیر عام طریقے سے نہیں ہو سکتی یا جنہیں اتفاق قرار دینا مشکل ہے۔

خود راقم نے اپنی زندگی میں اس کے نمونے دیکھے ہیں کہ جو یقینا حیرت انگیز ہیں کہ جو مجھ جیسے جلدی یقین نہ کرنے والے شخص کے لئے بھی غیر مرئی محافظ کے وجود کے لئے دلیل تھے۔

۲۔ تبدیلی ہمیشہ خود ہمارے ہاتھو سے آتی ہے:

"﴿ان الله لایغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسهم﴾" یہ جمہ قرآن میں دو مواقع پر مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے اس میں ایک عمومی اور کلی قانون بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک حیات ساز، انقلاب آفریں، اور خبر دار اور ہوشیار کرنے والا قانون ہے۔

یہ قانون اسلام میں جہاں بینی او رمعاشرہ شناسی کی بنیاد ہے..... یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ تمہاری تقدیر ہر چیز اور ہر شخص سے پہلے خود تمہارے ہاتھ میں ہے اور قوموں کی خوش بختی و بد بختی کے سلسلے میں تبدیلی اور تغیر پہلے درجے میں خود انہی سے وابستہ ہے۔ قسمت، اقبال اتفاقات اور اوضاعِ فلکی کی تاثیر و غیرہ کوئی بھی بنیاد نہیں رکھتی۔ اساس و بیادیہی ہے کہ ہر شخص خود چاہے تو سر بلند اور کامیاب ہو یا اس کے علاوہ خود چاہے تو اپنے آپ کو ذلت، زبوں حالی اور شکست کے سپرد کردے۔ یہاں تک کہ لطف الٰہی کسی ملت پر بغیر کسی مقدمہ اور تمہید کے نہیں آتا۔

بلکہ یہ ملتوں کا اپنا ارادہ، خواہش اور ان کے اندرونی تغیرات ہیں کہ جو انہیں لطفِ خدا یا عذابِ خدا کا مستحق بناتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اسلام اجتماعی پرگرام کے ایک اہم ترین گوشے سے آگاہ کرنے والا یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ ہر قسم کے بیرانی تغیرات اور تبدیلیاں ملتوں اور قوموں کے اندرونی تغیرات پر منحصر ہوتی ہیں اور کسی قوم کو پیش آنے ہر قسم کی فتح و شکست کا سرچشمہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ کہ جو اپنا دامن بچانے کے لئے ہر وقت "بیرونی عوامل" کے پیچھے پھرتے ہیں اور ہمیشہ اقتدار پرست اور استعماری طاقتوں کو اپنی بد بختی کا عامل شمار کرتے ہیں بہت بڑی غلط فہمی میں بتلا ہیں کیونکہ اگر کسی معاشرے کے اندر ان جہنمی طاقتوں کو کوئی مرکز حاصل نہ ہو تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان توسیع پسندوں، استعماری قوتوں اور سپر طاقتوں کی چھاؤنیاں او رمراکز اپنے معاشرے سے در ہم برہم کردیں اور ان کی سرکوبی کریں تاکہ ان کے لئے نفوذ کی کوئی راہ ہی باقی نہ رہے۔

یہ طاقتیں شیطان کی مانند ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے بقول شیطان ان لوگوں پر دسترس حاصل نہیں کرسکتا جو" عباد مخلصین" ہیں۔ وہ صرف ان لوگوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے جنہوں نے اپنے وجود کے اندر شیطان کے لئے کوئی جگہ بنا رکھی ہے۔

قرآن کی اس بنیادی تعلیم کا تقاضا ہے کہ بدبختیوں او رناکامیوں کو ختم کرنے کے لئے اندرونی انقلاب کی طرف بڑھیں۔ ایک فکری اور ثقافتی انقلاب کی طرف، ایک ایمانی اور اخلاقی انقلاب کی طرف۔ بدبختیوں کے چنگل میں گرفتاری کے وقت اپنے کمزور پہلوؤں کو فوراً تلاش کرنا چاہئیے۔ ہمیں اپنی روح سے کمزوری کے داغ توبہ او رحق کی طرف باز گشت کے پانی سے دھونے چاہئیں۔ اس طرح ہم ایک نیا جنم لیں گے، نیا نور بصیرت ملے گا اور نئی طاقت حرکت پیدا ہوگی اور اس کے ذریعے ہم اپنی ناکامیوں اور شکستوں کو کامیابی میں بدل سکتے ہیں۔ یہ کامیابی اس طرح سے ممکن نہیں کہ ہم اپنے کمزور پہلوؤں کو خود خواہی اور خود غرضی کے پردوں میں چھپادیں اور عوامل شکست کو اپنے معاشرے کے باہر سے تلاش کرتے پھریں۔

پہلے مسلمانوں کی فتح و کامرانی او ربعد والے مسلمانوں کی شکست کے عوامل پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی مباحث سنگلاخ زمین پر ہل چلانے اور بے سمت چلنے کے مترادف ہیں۔ ہمیں چاہئیے کہ کامیابی اور ناکامی کے عوامل خود مسلمانوں کے فکری، اعتقادی اور اخلاقی تغیرات میں تلاش کریں۔ خود مسلمانوں کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں نہ کہ اس سے ہٹ کر۔

دور حاضر کے انقلابات کہ جن میں سے ایک ہماری ملت کا انقلاب ہے اسی طرح اگر ہم الجزائر، افغانستان اور دیگر مقامات کی انقلابی جد و جہد کا مطالعہ کریں تو ہم ان میں واضح طور پر اس قرآنی اصل کی حاکمیت کا مشاہدہ کریں گے۔

یعنی ... سامراجی حکومتوں اورتوسیع پسند طاقتوں نے تو اپنی روش نہیں بدلی لیکن جب ہم اندر سے تبدیل ہو گئے تو ہر چیز بدل گئی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ صرف وہی رہبر اور قائد کامیاب ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اس بنیادی قانون کے مطابق اپنی ملت کی رہبری کی ہے اور اس میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے۔

تاریخ اسلام اور دورِ حاضر کی تاریخ اس اساسی و بنیادی اور جاو دانی و دائمی قانون کی صداقت کے شواہد سے بھری پڑی ہے کہ جن کے تفصیلی ذکر سے ہماری بحث ہمیں اس تفسیر کی روش سے دور لے جائے گی ۔

۱۔ مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ "لہ" کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے ۔ مشہور تفسیر یہی ہے کہ یہ انسان کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف قبل کی آیت میں اشارہ ہوا ہے ۔ بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ پیغمبر یا خدا کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہ احتمال ذیل کی آیت سے مناسبت نہیں رکھتا (غور کیجئے گا)

۲۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۸۳۔

۳۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۸۳۔

۴۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۲۰۱۔

آیات ۱۲،۱۳،۱۴،۱۵

۱۲۔ ﴿هُوَ الَّذِی یُرِیکُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾۔

۱۳۔ ﴿وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلاَئِكَةُ مِنْ خِیفَتِهِ وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیبُ بِهَا مَنْ یَشَاءُ وَهُمْ یُجَادِلُونَ فِی اللهِ وَهوَ شَدِیدُ الْمِحَالِ﴾۔

۱۴۔ ﴿لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِینَ یَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لاَیَسْتَجِیبُونَ لَهُمْ بِشَیْءٍ إِلاَّ كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ إِلَی الْمَاءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِینَ إِلاَّ فِی ضَلَالٍ﴾۔

۱۵۔ ﴿وَلِلَّهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾۔

ترجمہ

۱۲۔ وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے کہ جو خوف کا بھی باعث ہے اور امید کا بھی نیزہ وہ بوجھل بادہ پیدا کرتا ہے۔

۱۳۔ اور گرج اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے اور فرشتر (بھی) اس کے خوف سے (مشغول تسبیح ہیں) اور ویہ صاعقہ بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس میں گرفتار کرتا ہے حالانکہ وہ (خدا کی ان آیات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود) خدا کے بارے میں مجادلہ میں مشغول ہیں اوراس کی قدرت لامتناہی (اور عذاب درناک) ہے۔

۱۴۔ حق کی دعوت اس کی طرف سے ہے اور جو (مشرک) لوگ غیر خدا کوپکارتے ہیں ان کی پکار کا وہ کوئی جواب نہیں دیتے یہ لوگ اس شخص کی طرح ہیں جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلیاں کھولتا ہے تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ کبھی نہیں پہنچے گا اور کافروں کا پکار ضلالت (اور گمراہی) کے سوال کچھ نہیں

۱۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً یا کرھاً خدا کے لئے سجدہ ریز ہے۔ اسی طرح دن رات ان کے سائے بھی (سجدہ گزار ہیں)۔

عظمت الٰہی کی کچھ نشانیاں

قرآن یہاں ایک مرتبہ پھر آیاتِ توحید، عظمت پروردگار کی نشانیاں اور اسرار آفرینش بیان کررہا ہے۔ عالم طبیعت میں نمودار ہونے والی مختلف قدرتوں کی نشاندہی کی گئی ہے نیز ان کے اسرار کی طرف مختصر اورپر معنی اشارے کرتے ہوئے خدا سے بندوں کو زیادہ قریب کرکے ان دلوں پر ایمان و معرفت کی نورپاشی کی گئی ہے۔

پہلے (بادلوں میں پیدا ہونے والی) بجلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جو تمہیں وہ بجلی دکھاتا ہے جو خوف اور امید کا باعث ہے ﴿هُوَ الَّذِى يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾۔

ایک طرف تو اس کی شعاعِ درخشاں آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور رعددار آواز جو اس سے اٹھتی ہے بعض اوقات تمہیں وحشت زدہ کردیتی ہے۔ اس سے جو آتش سوزی کے خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ خوف و اضطراب پیدا کردیتا ہے خصوصاً جو لوگ بیابانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں بیابانوں سے گزرہے ہوتے ہیں انہیں اس سے بہت وحشت آتی ہے۔

دوسری طرف عموماً چونکہ ساتھ ساتھ موٹے قطروں کی بارش بھی ہوتی ہے جو بیابانوں کے تشنہ کاموں اور پیاسوں کو خوشگوار پانی بخشتی ہے اور اس سے درخت اور زراعت سیراب ہوتے ہیں لہٰذا اس سے ان کے دل میں ایک امید بھی پیدا ہوتی ہے اور یوں وہ خوف و امید کے حساس لمحے گزارتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: وہ وہی ہے جو بوجھل اور پربار بادل پیدا کرتا ہے کہ جو پیاسی زمینوں کی آبیاری کرسکتے ہیں ﴿وَيُنْشِىءُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾۔

رعد و برق کی برکتیں

ہم جانتے ہیں کہ سائنسی لحاظ سے برق اس طرح سے پیدا ہوتی ہے کہ بادل کے دو ٹکڑے مختلف بجلی کے لحاظ سے (مثبت اور منفی پول کی صورت میں) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ان سے بالکل اس طرح سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے جیسے بجلی کے دو تار جن میں مختلف (مثبت اور منفی فیز (Phase) کی بجلی آرہی ہو جب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور اصطلاح کے مطابق ہو جاتے ہیں۔

تاروں کے دو سرے جب آپس میں ملتے ہیں تو ہمارے سامنے معمولی سا کرنٹ اور شعلہ پیدا ہوتا ہے اور ایک ہلکی سے آواز بھی پیدا ہوتی ہے جب کہ آسمانی بجلی کے ساتھ بادلوں کی وسعت کے اعتبار سے الیکٹرک ڈسچارج شدید ہوتا ہے کہ اس سے "رعد" اور گرج پیدا ہوتی ہے۔

بادل کا ٹکڑا جو مثبت رو ہوتی ہے جب زمین کے نزدیک ہو جائے کہ جس میں ہمیشہ منفی رو ہوتی تو زمین اور بادل کے درمیان کرنٹ پیدا ہو جاتا ہے جسے "صاعقہ" کہتے ہیں۔ یہ برقی رو اس لئے خطرناک ہوتی ہے کہ اس کا ایک سر زمین کے بلند مقامات ہوتے ہیں۔ اصطلاح کے مطابق یہ بلند جگہیں منفی رو کی حامل تار کے سرے یا نوک میں بدل جاتی ہیں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ کسی بیابان میں ایک انسان عملی طور پر اس منفی تار کی نوک میں بدل جائے اور بہت وحشت ناک

کرنٹ اس کے سرپر آگرے اور مختصر سے لمحہ میں وہ خاکستر ہو جائے ۔ لہٰذا بیا بانوں میں رعد اور برق کے موقع پر فوراً درخت ، دیوار یا پہاڑ کے دامن میں یا کسی اونچی جگہ کی اوٹ میں پناہ لے لینا چاہئیے یا کسی گرھے میں لیٹ جانا چاہئیے ۔

بہر حال برق جو شاید بعض کی نگاہ میں عالم طبیعت کی شوخی ہے موجودہ سائنسی انکشافات سے ثابت ہوا ہے کہ اس کے بہت سے فوائد و برکات ہیں ۔ ذیل میں ہم ان فوائد کے تین پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

۱۔ آبیاری :

بجلیاں عموماً بہت زیادہ حرارت پید اکرتی ہیں جو بعض اوقات تقریباً ۱۵ /ہزار سنتی گریڈ ہوتی ہے ۔ یہ حرارت اس مقصد کے لئے کافی ہوتی ہے کہ اطراف کی زیادہ تر ہوا کو جلادے اور اس کے نتیجہ میں فوراً ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کم دباؤ کی صورت میں ہی بادل برستے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بجلی چمکنے اور گرنے کے بعد ہی اولے پڑنے شروع ہوجاتے ہیں اور بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگتے ہیں ۔ اس بناء پر در حقیقت بجلی کی ایک ذمہ داری آبیاری ہے ۔

۲۔ جراثم پر سم پاشی :

جس وقت برجلی اپنی اس حرارت کے ساتھ چمکتی ہے تو بارش کے قطرات اضافی آکسیجن کی مقدار میں ترکیب ہوتے ہیں اور یہ بھاری پانی یعنی ہائیڈروجن پر آکسائیڈ پیدا کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ بھاری پانی کے آثار میں سے ایک یہ ہے وہ جراثیم کش ہوتا ہے ۔ اسی بناء پر طبی مصارف میں اسے زخموں کو دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ بھاری پانی کے یہ قطرات جس وقت زمین پر برستے ہیں تو بناتاتی بیماریوں کے جراثم ختم کردیتے ہیں ۔ گویا پانی جراثیم پر خوب سم پاشی کرتا ہے ۔ اسی بنا ء پر ماہرین نے کہا ہے کہ جس سال رعد و برکم ہو بناتاتی آفات اور بیماریاں زیاد ہوتی ہیں ۔

۳۔ تغذیہ اور کھادرسائی :

بجلی ، شدید حرارت اور کیمیائی ترکیب سے بارش کے قطرے کاربانک اسیڈ ا

(H2CO3 CARBONIC ACID) بے رنگ وبو بھاپ جو کچھ ترش مزہ ہوتی ہے طب مین ہاضمے کی تقویت کے لئے استعمال ہوتی ہے ۔ (مترجم)

کی حالت اختیار کرلیتے ہیں یہ جب زمینوں پر چھڑکے جاتے ہیں، تو کیمیائی اثرات کی بدولت نباتات کے لئے ایک موثر کھاد کا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح سے نباتات کو غذا ملتی ہے۔

بعض ماہرین کے مطابق آسمانی بجلیوں کے ذریعے کرہ زمین کو سال بھر میں ملنے والی کھاد سینکڑوں لاکھ ٹن ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پاؤں کے نیچے روندی جانے والی بظاہر ایک بے خاصیت چیز کس قدر پر بار اور پر برکت ہے آبیاری بھی کرتی ہے، جراثم پر رسم پاشی بھی کرتی ہے اور غذا بھی بنتی ہے۔ یہ عالمِ ہستی کے عجیب و غریب اور وسیع و عریض اسرار میں خدا شناسی کی طرف واضح راہنمائی کرنے والا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

یہ سب ایک طرف بجلی کی برکات ہیں اور دوسری طرف یہ آتش سوزاں کو بھی وجود دیتی ہے کہ جس کی ایک قسم "صاعقہ" ہے۔ یہ بجلی ہوسکتا ہے ایک یا کئی انسانوں کو یا درکتوں کو جلا ڈالے۔ یہ چیز اگر کم اور نادر رہے اور اس سے بچا بھی جا سکتا ہے تا ہم خوف و ہراس کا عامل بن سکتی ہے۔

اس طرح سے یہ جو ہم نے آیت بالا میں پڑھا کہ برق خوف کا سبب بھی ہے اور امید کا بھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ "﴿وَيُنْشِىءُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾" جو مندرجہ بالا آیت کے آخر میں آیا ہے وہ بجلی کی اسی خاصیت کے ساتھ مربوط ہو کہ جو بادلوں کی بارش کے انہی بھری ہوئی پشت والے قطروں سے بوجھل کرتی ہے۔

بعد والی آیت میں "رعد" کی آواز کا ذکر ہے کہ جو برق سے جدا نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: رعد خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے "﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ﴾"۔

جی ہاں! عالم طبیعت کی یہ سخت آواز کہ جو بڑی آواز کے لئے ضرب المثل ہے چونکہ بجلی سے منسلک ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کو پورا کرتی ہیں اور بہت اہم اور سوچی سمجھی خدمات انجام دیتی ہیں کہ جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے عملی طور پر خدا کی تسبیح کرتی ہیں دوسری طرف "رعد" "برق" کی زبانِ گویا ہے جو نظام آفرینش اور عظمت خلق کی ترجمانی کرتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے "زبان حال" کہتے ہیں۔ ایک جامع کتاب، ایک قصید ہغرا، ایک خوبصورت اور دل انگیز مصوری کا نمونہ اور ایک مستحکم و منظم عمارت سب اپنی زبان حل سے اپنے لکھنے والے، کہنے والے، نقاش اور معمار کے علم و دانش اور ذوق و مہارت کی بات کرتے ہیں اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

اس عالم ہستی کا ہر ذرہ اسرار آمیز ہے اور بہت ہی دقیق اور حساب شدہ نظام رکھتا ہے ۔ سب ذرات ِکائنات خدا پاکیزگی اور ہر قسم کے نقص و عیب سے اس کے منزہ ہونے کی حکایت کرتے ہیں (کیا " تسبیح "تنزیہ اور پاک جانتے کے علاوہ کچھ اور ہے ؟)اور سب کے سب اس کی قدرت اور علم و حکمت کی خبر دیتے ہیں (کیا "حمد " صفات ِکمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے ؟)[1]

فلاسفہ کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس جہان کے تمام ذرات میں سے ہر ایک ایک قسم کا عقل و شعور رکھتا ہے اور اسی عقل و شعور کی بناء پر خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے نہ صرف زبان حال سے اور اپنے وجود سے کہ وجود خدا کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ زبان قال سے بھی اس کی تعریف کرتا ہے ۔

نہ صرف یہ کہ صدائے رعد اور عالم مادہ کے دیگر اجراء اس کی تسبیح کرتے ہیں بلکہ "تمام فرشتے بھی خدا کے خوف و خشیت سے اس کی تسبیح میں مشغول ہیں "﴿وَالْمَلاَئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ﴾ ۔[2]

وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں فرمان ، خدا پر عمل کرنے میں اور نظام ہستی کے بارے میں عائد شدہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے اور اس طرح کہیں وہ عذاب ِالٰہی میں گرفتار نہ ہوجائیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ جو احساس ِمسئولیت رکھتے ہیں ان کے لئے ذمہ داریاں خوف کا باعث ہوتی ہیں ایک اصلاحی خوف کو جو انسان کو سعی و کاوش اور تحریک پر آمادہ کرتا اور ابھارتا ہے ۔

"رعد و برق " کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے "صواعق "کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : خد اصواعق کو بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان کے ذریعے تکلیف پہنچاتا ہے ﴿وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ﴾۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود عالم آفرینش ، وسیع آسمان و زمین ، نباتات ، رعد و برق اور اس طرح کی دیگر چیزوں مین عظمت ِالٰہی کی آیات دیکھنے کے باوجود حوادث یہاں تک کہ ایک آسمانی شعلے کے سامنے انسانی طاقت بے بسی کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بے خبروں کا ایک گروہ خدا کے بارے میں مجادلہ او رجنگ کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے ﴿ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللهِ ﴾ ۔

حالانکہ خدا کی قدرت لامتناہی ہے ، اس کا عذاب دردناک ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہے ﴿وَهوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ﴾ ۔

"محال " اصل میں " حیلہ " سے ہے اور " حیلہ " ہر قسم کی مخفی اورپنہان چارہ اندیشی کے معنی میں ہے (غلط کو ششوں اورچارہ جوئیوں کے معنی میں نہیں کہ جس میں یہ لفظ فارسی زبان میں مشہور ہو چکا ہے) ۔ یہ بات مسلم ہے ہے

کہ جو چارہ جوئی پر بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے وہ وہی ہے جو قدرت کے لحاظ سے بھی غیر معمولی ہے اور علم و حکمت کے لحاظ سے بھی اور اس بناء پر وہ اپنے دشمنوں پر مسلط اور کامیاب ہوتا ہے اور کسی کو اس کے مرکزِ قدرت سے نکل بھاگنے کا یارا نہیں ہے اسی لئے مفسرین نے ہر ایک نے " شدید المحال "کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ سب نے اس کے مفہوم کی بنیاد مذکورہ معنی کو قرار دیا ہے ۔ بعض نے اسے "شدید القوة"، بعض نے "شدید العذاب"، بعض نے "شدید القدرة" اور بعض نے " شدید الاخذ" کے معنی میں اور اس جیسے الفاظ میں اس کی تفسیر کی ہے ۔ (۳)

زیر بحث آخری آیت دو مطالب کی طرف اشارہ کرتی ہے :۔

پہلا یہ کہ "دعوتِ حق (اور حقیقی دعا)" ﴿لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ﴾۔ یعنی جس وقت ہم اسے پکاریں تو وہ سنتا ہے اور ہماری پکار کا جواب دیتا ہے اور وہ بندوں کی دعا سے آگاہی بھی رکھتا ہے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے ۔ اس لئے اسے پکارنا اور اس کی مقدس ذات سے تقاضا کرنا حق ہے نہ کہ باطل اور بے اساس و بے بنیاد ۔

دوسرا یہ ہے کہ بتوں کو پکارنا اور ان سے درخواست اور دعا کرنا دعائے باطل ہے کیونکہ "جن لوگوں کو مشرکین خدا کے علاوہ پکارتے ہیں اور اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے حق کا سہارا لیتے ہیں وہ ہرگز انہیں جواب نہیں دیں گے اور ان کی دعا قبول نہیں کریں گے " ﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لاَيَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ﴾۔

جی ہاں باطل کو پکارنا ایسا ہی ہے کیونکہ وہ خیالی تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور بتوں کے لئے وہ جیسے بھی علم و قدرت کے قائل ہوں سب موہوم ، بے پایہ اور بے اساس ہے ۔

کیا عینیت ، واقعیت اور مایہ خیر و برکت کے سوا "حق" کچھ اور ہے اور خیال ، توہم اور مایہ شر و فساد کے سوا "باطل" کچھ اور ہے ۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآن کی روش ہے اس عقلی بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ ایک خوبصورت حسی اور رسا مثال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے : وہ کہ جو غیر خدا کو پکارتے ہیں ، اس شخص کی طرح ہیں جو ایسے پانی کے کنارے بیٹھا ہو جس کی سطح اس کے دسترس میں نہ ہو اور وہ اس امید سے پانی کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ وہ اس کے دہن میں پہنچ جائے حالانکہ وہ ہرگز نہیں پہنچے گا ۔ یہ کیسا بے ہودہ اور فضول خواب و خیال ہے ﴿إِلاَّ كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ﴾۔

کیا کنویں کے کنارے بیٹھ کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر، اشارہ سے پانی منہ تک پہنچایا جا سکتا ہے؟ ایسا کام کسی دیوانے اور سادہ لوح شخص کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

مذکورہ جملہ کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بت پرستوں کو ایک شخص سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پوری طرح کھول کر افقی شکل میں پانی داخل کرتا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ پانی اس کے ہاتھ میں ٹھہر جائے حالانکہ پانی سے نکلتے ہی پانی کے قطرے انگلیوں کی طرف سے نکل جائیں گے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔

مفسرین نے اس جملے کے لئے ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی ہے اور وہ یہ کہ بت پرست جو اپنی مشکلات کے حل کے لئے بتوں کے پاس جاتے ہیں اس شخص کی طرح ہیں جو چاہتا ہے کہ پانی اپنی مٹھی میں بند رکھے۔ کیا کبھی پانی کو مٹھی میں بند رکھا جا سکتا ہے، یہ بات عربوں میں مشہور ضرب المثل سے لی گئی ہے کہ جب وہ اس شخص کے لئے کوئی مثال ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ جو بے ہودہ اور فضول کوشش کرتا ہے تو کہتے ہیں: "هو کقابض الماء بالید"

وہ اس شخص کی طرح ہے جو پانی کو ہاتھ سے پکڑنا چاہتا ہے۔

ایک عرب شاعر کہتا ہے: فاصبحت فیماکان بینی و بینها من الود مثل قابضِ الماء بالید

میری حالت تو یہ ہو گئی کہ میں اپنے اور اس کے درمیان محبت برقرار رکھنے کے لئے اس شخص کو طرح ہو گیا کہ جو پانی کو ہاتھ میں روک رکھے۔[۴]

آیت کے آخر میں اس بات کی تاکید کے لئے قرآن کہتا ہے: کافروں کا بتوں سے دعا اور درخواست کرنا گمراہی میں قدم اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں ﴿وَمَا دُعَاءُ الْکَافِرِینَ إِلاَّ فِی ضَلَالٍ﴾۔

اس سے بڑھ کر کیا گمراہی ہو سکتی ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی کاوشیں صرف کرے کہ جو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا اور اس راستے میں وہ اپنے آپ کو خستہ و بے حال کر دے لیکن اسے کوئی نتیجہ اور فائدہ حاصل نہ ہو۔

زیر بحث آخری آیت میں یہ نشاندہی کرنے کے لئے کہ بت پرست عالم ہستی کے کارواں سے کس طرح الگ ہو گئے ہیں اور تنہا بے راہ روی میں سرگرداں ہیں فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین کے تمام رہنے والے اطاعت و تسلیم سے یا کراہت و ناپسندیدگی سے سر بسجود ہیں اور اسی طرح ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ ریز ہیں ﴿وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَکَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ﴾۔

۱۔"تسبیح و تقدیس" کہ جو موودات کرتی ہیں کے بارے میں مزید وضاحت انشا اللہ "وان من شیء الا یسبح بحمده لکن لاتفقهون تسبیحهم" (بنی اسرائیل ۴۴) کے ذیل میں آئے گی۔

۲۔ شیخ طوسی تبیان میں فرماتے ہیں:

"خفیۃ" اور "خوف" کے درمیان فرق یہ ہے کہ "خفیۃ" حالت کو بیان کرتا ہے اور "خوف" مصدر ہے۔ یعنی پہلا حالت خوف کے معنی میں ہے اور دوسرا ڈرنے کے معنی میں ہے۔

۳۔ بعض "محال" کو "حیلۃ" کے مادہ سے نہیں سمجھتے بلکہ "محل" اور "ماحل" کے مادہ سے قرار دیتے ہیں کہ جو مکر و جدال اور عذاب دینے اور سزا دینے کے لئے عزم و صمیم کرنے کے معنی سے لیا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے تین میں کہا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ دونوں معانی قریب الافق ہیں۔

۴۔ تفسیر قرطبی جلد ۵۔ ص ۳۵۲۹۔

چند اہم نکات

۱۔ موجودات کے سجدہ کرنے سے کیا مرد ہے:

ایسے مواقع پر سجدہ خضوع و خشوع، انتہائی قسم کی تواضع و انکساری اور سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے یعنی تمام فرشتے، انسان اور سب صاحبان عقل و فکر خدا کے سامنے متواضع ہیں لیکن کچھ مخلوقات سجود، تکوینی کے علاوہ سجود تشریعی کی بھی حامل ہیں۔

سجود تشریعی یعنی اپنے ارادے اور رضاو رغبت سے کئے جانے والے سجدے۔

جب سجود تکوینی کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی مخلوق موت و حیات، نشو وتکامل اور سلامتی و بیماری وغیرہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے تو تسلیم و خضوع کی یہ حالت در حقیقت قوانین آفرینش کے لئے ان کی طرف سے ایک قسم کا سجدہ تکوینی ہے۔

۲۔ طوعاً و کرھاً سے کیا مراد:

ہو سکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ مومنین بارگاہ پروردگار میں رضاو رغبت سے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کے سامنے خضوع کرتے ہیں لیکن غیر مومنین اگرچہ ایسے سجدے کے لئے تیار نہیں ہیں تا ہم ان کے وجود کے تمام ذرات قوانینِ آفرینش کے پیش نظر فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں، وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ "کرہ" (بروزن "جرم") اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا سرچشمہ انسان کا اندر اور باطن ہے اور"کرہ" (بروزن " شرح ") اس کراہت کے معنی میں ہے جس عامل بیرونی اور خارجی ہو۔ زیر بحث مقام پرچونکہ غیر مومنین خارج از ذات عوامل کے زیر اثر قوانینِ آفرینش کے مقہور و مغلوب ہیں اس لئے "کرہ" (بروزن "شرح") استعمال ہوا ہے۔

"طوعاً و کرھاً" کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ " طوعاً" سے مراد عالم خلقت کے وہ واقعات ہیں جو ایک موجود کی فطری اور طبیعی رضا و رغبت کے موافق ہیں (مثلاً زندہ رہنے کے لئے موجودِ زندہ کی رغبت) اور "کرھاً" سے مراد وہ میلان ہے جو ایک وجود کو خارج سے لاحق ہو۔ مثلاً جراثیم کے حملے سے ایک زندہ موجود کی موت۔

۳۔ "ظلال" کا مفہوم: "ظلال" جمع "ظل" کی، جو "سایہ" کے معنی میں ہے

۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ ”سجود“ سے مراد صرف تشریعی سجدہ نہیں کیونکہ موجودات کے سایہ تو اپنا کوئی ارادہ و اختیار نہیں رکھتے بلکہ وہ تو روشنی کہ چمک کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، اس بناء پر ان کا سجدہ تکوینی ہے یعنی وہ قوانینِ آفرینش کے سامنے سر تسلیم کم کئے ہوئے ہیں ۔

البتہ لفظ ”ظلال“ کے ذکر کا یہ مطلب نہیں کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات کا وجود مادی ہے اور ان سب کا سایہ ہوتا ہے بلکہ یہ صرف ان موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا سایہ ہوتا ہے ۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ شہر کے علماء اور ان کے فرزندوں نے فلاں مجلس میں شرکت کی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے فرزندوں نے شرکت کی کہ جن کے فرزند تھے ۔ اس جملے سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شہر کے تمام علماء صاحبِ اولاد ہیں (غور کیجئے گا

بہرحال سایہ اگرچہ ایک عدی چیز کے علاوہ کچھ نہیں کہ جو روشنی کا فقدان اور نہ ہونا ہی ہے لیکن چونکہ ہر طرف سے نو رکا وجود اس کا احاطہ کئے ہوتا ہے لہٰذا اس کی بھی ایک موجودیت ہے اور وہ بھی آثار رکھتا ہے ۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کی تصریح شاید تاکید کے لئے ہے کہ موجودات کے سائے تک بارگاہ خداوندی میں سر خمیدہ ہیں ۔

۴۔ ”آصال“ اور ”غدو“ کا مطلب :

یہ ”اصل“ (بروزن ”دھل“) جمع ہے اور ”اصل“ بھی اور اصیل“ جمع ہے کہ جو ”اصل“ کے مادہ سے لی گئی ہے اور یہ دن کے آخری حصے کو کہتے ہیں اس لئے کہ دن کا یہ حصہ رات کی اصل اور بنیاد شمار ہوتا ہے ۔

نیز ”غدو“ جمع ہے ”غداۃ“ کی کہ جو دن کے پہلے حصے کے معنی میں ہے (اور بعض اوقات یہ مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے) ۔

اگرچہ حکم خدا کے سامنے عالمِ ہستی کی موجودات کا سجدہ اور خضوع صبح اور عصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت ہے پھر بھی ان دو مواقع کا ذکر یا تو اس امر کے دوام کے لئے کنایہ ہے مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح و شام تحصیلِ علم میں مشغول ہے یعنی ہمیشہ تحصیل علم میں محو ہے اور یا اس بناء پر ہے کہ گزشتہ جملے میں موجودات کے سایوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور سائے دن کے آغاز اور اختتام پر دیگر اوقات کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں ۔

آیت ۱۶

۱۶۔﴿ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلْ اللهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لاَيَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلاَضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلْ اللهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾۔

ترجمہ

کہو آسمان اور زمین کا پروردگار کون ہے ؟ کہہ دو : تم نے اپنے لئے اس کے علاوہ اولیاء (اور خدا) بنالئے ہیں ، کہ جو اپنے سودو زیاں کے (بھی) مالک نہیں ہیں (چہ جائیکہ تمہارے) ۔ کہو : کیا بینا اور نابینا برابر ہیں یا ظلمتیں اورنور برابر ہیں ؟ کیا انہوں نے انہیں خدا کا اس لئے شریک قرار دیا ہے کہ وہ خدا کا طرح خلقت رکھتے ہیں اور یہ خلقتیں ان کے لئے مشتبہ ہو گئی ہیں ؟ کہہ دو : خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب ۔

بت پرستی کیوں ؟

گزشتہ آیات میں وجودِ خدا کی معرفت کے بارے میں بہت سی بحثیں تھیں ۔ اس آیت میں بت پرستوں کے اشتباہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے ۔

پہلے پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور مدبر کون ہے ﴿قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ۔

اس کے بعد بغیر اس کے کہ پیغمبر ان کے جواب کے انتظار میں رہے حکم دیا گیا ہے کہاس سوال کا جواب خوددو، کہو : "اللہ "﴿قل اللہ﴾۔

پھر انھیں یوں ملامت کی گئی ہے : ان سے کہو : کیا تم نے غیر خدا کو اپنے لئے اولیاء ، سہارا اور معبود قرار دے لیا ہے حالانکہ یہ بت تو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں ﴿ قُلْ اللهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لاَيَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلاَضَرًّا ﴾ ۔

در حقیقت پہلے " خدا کی ربوبیت " کے حوالے سے بحث کی گئی ہے نیز یہ کہ وہی عالم ک امالک و مدبر ہے ہر خیر و نیکی اسی کی جانب سے ہے اور وہی ہر شر کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے یعنی جب کہ تم یہ بات قبول کرتے ہو کہ خالق اور پروردگار وہ ہے تو اب جو مانگنا ہے اسی سے مانگو نہ کہ بتوں سے کہ جہ جو تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کرسکتے۔ پھر اس سے

بھی پڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ وہ تو اپنے نفع و نقصان تک کے مالک نہیں ہیں چہ جائیکہ تمہارے ۔ ان حالات میں وہ تمہاری کونسی مشکل آسان کرسکتے ہیں جس کی بناء پر تم ان کی پرستش کرتے ہو جب وہ اپنے لئے بے بس ہیں تو تم ان سے کیا توقع رکھتے ہو۔

اس کے بعد دو واضح اور صریح مثالوں کے ذریعے " موحد" اور "شرک" کی کیفیت بیان کی گئی ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : کہو: کیا نابینا اور بینا برابر ہیں﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ﴾۔

جس طرح بینا اور نابینا برابر نہیں ہیں اسی طرح کافر اور مومن بھی برابر نہیں ہیں اور بتوں کو "الله "کا شریک قرار نہیں دیا جاسکتا ۔

دوسرا یہ کہ : کیا ظلمات اور نور برابر ہیں﴿أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ﴾۔

وہ ظلمت کہ جو انحراف ، گمراہی ، اشتباہ اور خوف و خطر کا مرکز ہے اسے اس نور کے برابر کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو رہنما اور حیات بخش ہے ۔ کس طرح سے بتون کو کہ جو محض ظلمات ہیں خدا کے ساتھ شریک کیا جا سکتا ہے کہ جو عالم ہستی کا نور مطلق ہے ۔ ایمان اور توحید کہ جو روحِ نور ہے اسے شرک و بت پرستی سے کیا نسبت کہ جو ظلمت کہ روحِ رواں ہے ۔

اس کے بعد ایک طریقے سے مشرکین کے عقیدے کا بطلان ثابت کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : وہ کہ جنہوں نے خدا کے لئے شریک قرار دئے ہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی خدا کی طرح خلق کیا ہے اور یہ خلق کیا ہے اور یہ خلقت اس کے لئے مشتبہ ہوگئی اور انہیں یہ گمان ہوگیا ہے کہ بت بھی خدا کی طرح عبادت کے مستحق ہیں کیونکہ ان کی نظر میں بت بھی وہی کام کرتے ہیں کہ جو خدا کرتا ہے﴿أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ﴾۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔یہاں تک کہ بت پرست بھی بتوں کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتے ۔ وہ بھی خدا کو تمام چیزوں کا خالق سمجھتے ہیں اور عالم خلقت کو فقط اس سے مربوط شمار کرتے ہیں ۔

اسی لئے فوراً فرمایا گیاہے : کہہ دو خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب﴿قُلْ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ خالقیت و ربوبیت معبودیت سے مربوط ہے:

زیر نظر آیت سے پہلے تو یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خالق ہے وہ رب اور مدبر ہے بھی ہے کیونکہ خلقت ایک دائمی اور مسلسل امر ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ خداوند عالم موجودات کو پیدا کرکے ایک طرف بیٹھ جائے بلکہ فیضِ ہستی خدا کی طرف سے دائمی طور پر ہوتا ہے اور ہر موجود اس کی پاک ذات سے ہستی اور وجود حاصل کرتا رہتا ہے ۔ اس بناء پر آفرینش کا پروگرام اور عالم ہستی خدا کی تدبیر ابتدائے خلقت کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہے ۔یہی وجہ ہے کہ سودزیاں اور نفع و نقصان کا مالک وہی ہے اور اس کے علاوہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے ۔ اس کے باوجود کیا خدا کے علاوہ کوئی عبودیت کا اہل ہے۔

۲۔ خود ہی سوال اور خود ہی جواب:

محل بحث آیت سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو کیونکر حکم دیتا ہے کہ مشرکین سے سوال کریں کہ آسمان و زمین کا پروردگار اور مالک کون ہے اور اسکے بعد بغیر جواب کا انتظار کئے اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دیں اور اس کے بعد بلا فاصلہ ان مشرکین کو سرزنش کی گئی ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں ۔

یہ سوال و جواب کا کیسا طریقہ ہے؟ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ایک سوال کا جواب اس درواضح ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ مدمقابل کے جواب کا انتظار کیا جائے ۔ مثلاًیہ کہ ہم کسی سے سوال کرتے ہیں کہ اس وقت رات یا دن اور پھر بلا فاصلہ ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یقینارات ہے ۔ یہ دراصل اس امر کے لئے ایک لطیف کنایہ ہے کہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ جواب کے انتظار کرنے کی محتاج نہیں ہے ۔

علاوہ ازیں مشرکین خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے اور وہ ہرگز یہ بات نہیں کہتے تھے کہ بت پرست زمین و آسمان کے خالق ہیں بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ شفیع ہیں اور انسان کو نفع و نقصان پہونچانے پر قادر ہیں اور اسی بناء پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی عبادت کرنا چاہئیے ۔ لیکن چونکہ "خالقیت" اور "ربوبیت" (عالم ہستی کی تدبیر اور اس کے نظام کو چلانا)ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے لہذا مشرکین پر یہ اعتراج کیا جا سکتا ہے اور انہیں کہا جا سکتا ہے کہ تم خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہو تو ربوبیت کو بھی اس کے ساتھ مخصوص سمجھو اور اس کے ساتھ عبادت بھی اسی سے مخصوص ہو گئی ہے ۔

۳۔چشم بینا اور روشنی لازم و ملزوم ہیں:

آیت میں "نابینا و بینا" اور "ظلمات و نور" دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک حقیقتِ عینی کے مشاہدہ کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ۔ چشم بینا کی بھی اور نور کی شعاعوں کی بھی ۔ ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو مشاہدہ ممکن نہیں ۔ لہٰذا سوچنا چاہیئے کہ ان لوگوں کی کیا حالت ہو گی کہ جو ان دونوں سے محروم ہوں ، بینائی سے بھی اور نور سے بھی ۔ اس کا حقیقی مقصداق مشرکین ہیں کہ جن کی چشم بصیرت بھی اندھی ہے اور جن کی زندگی کو بھی کفر و بت پرستی کی تاریکی نے گھیر لیا رکھا ہے اسی لئے وہ تاریک گھاٹیوں اور گڑھوں میں سرگرداں ہیں ۔ جب ان کے برعکس مومنین نگاہِ بینا رکھتے ہیں ۔ ان کا پروگرام واضح ہے اور انہوں نے نورِ وحی اور تعلیماتِ انبیاء کی مدد سے اپنی زندگی صحیح راستے پر ڈال لیا ہے ۔

۴۔کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے؟

زیر نظر جبر کی بعض طرفداروں نے محل بحث آیت کے جملے "﴿الله خالق كل شيء﴾" سے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لئے استدلال کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ کاموں کا خالق بھی خدا ہے یعنی ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے ۔

اس بات کو دو طریقوں سے جواب دیا جا سکتا ہے :

پہلا یہ کہ اس آیت کے دوسرے جملے اس بات کی پورے طور پر نفی کرتے ہیں کیونکہ ان میں بت پرستوں کی جڑی ملامت کی گئی ہے اگر واقعاً ہم اپنے اعمال میں کوئی اختیار نہیں رکھتے تو پر تنبیہ اور سرزنش کس بناء پر ؟ اگر خدا چاہتا کہ ہم بت پرست رہین تو پھر وہ کیون سرزنش کرتا ہے اور رکیوں ہدایت کے لئے اور راہ بدلنے کے لئے استدلال کرتا ہے ۔ یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ لوگ اپنی راہ انتخاب کرنے میں آزاد اور مختار ہیں ۔

دوسرا یہ کہ ہر چیز میں خالقیت بالذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن پھر بھی یہ چیز اپنے افعال میں ہمارے مختار ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہماری طاقت اور ہماری عقل بلکہ ہمارے ارادے کی آزادی سب کے سب اسی کی جانب سے ہیں ۔ اس بناء پر ایک لحاظ سے وہ بھی خالق ہے (تمام چیزوں کا خالق حتی کہ ہمارے افعال و اعمال کا خالق) اور ہم بھی فاعل مختار ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے طول میں ہیں کہ کہ عرض میں ۔ وہ فعل کے تمام وسائل اور ذرائع پیدا کرنے والا ہے اور ہم خیر و شر کے راستے پر ان وسائل سے استفادہ کرنے والے ہیں ۔

یہ بالکل اس طرح ہے جس طرح سے کوئی شخص بجلی گھر یا پانی پلائی کا مرکز تیار کر کے ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے ۔ مسلم ہے کہ ہم اس بجلی سے کسی قریب المرگ بیمار کے لئے آپریشن تھیٹر کو روشن کریں یا ایک برائی کے مرکز کو ۔ اسی طرح پانی سے کسی تشنہ لب کو سیراب کریں اور پھولوں کے پودوں کی آبیاری کریں یا کسی بے گناہ کے گھر کی بنیادوں میں پانی ڈال کر اسے تباہ کردیں ۔

آیت ۱۷

۱۷۔ ﴿أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللهُ الْأَمْثَالَ﴾۔

ترجمہ

۱۷۔ خدا نے آسمان سے پانی بھیجا اور ہر درّہ اور دریا سے ان کی مقدار کے مطابق سیلاب امنڈ پڑا پھر پانی کے ریلوں پر جھگ پیدا ہو گئی اور جن (بھٹیوں) میں زیرات یا اسباب زندگی تیار کرنے کے لئے آگ روشن کرتے ہیں ان سے بھی جھاگ نکلنے لگی۔ اس طرح خدا حق او رباطل کے لئے مثال بیان کرتا ہے۔ لیکن جھگ ایک طرف ہو جاتی ہے او رلوگوں کے لئے فائدہ رساں چیز (پانی یا خالص دھات) زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ خدا اسی سے مثال بیان کرتا ہے۔

حق و باطل کی منظر کشی

قرآن کے جو تعلیم وتربیت کی کتاب ہے اس کی روش ہے کہ وہ مسائل عینی کی بنیا دپر گفتگو کرتا ہے لہٰذا اس میں پیچیدہ مسائل کو ذھن نشین کروالے کے لئے لوگوں کی روزمرہ زندگی سے عمدہ، خوبصورت اور حسی مثالیں پیش کی گئی ہیں زیر نظر آیت میں بھی توحید و شرک، ایمان و کفر اور حق و باطل کے بارے میں گزشتہ آیات میں ذکر کئے گئے حقائق کو مجسم کرنے کے لئے ایک بہت ہی رسا اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے﴿أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾۔زندگی کی بخش اور حیات آفرین پانی نشو ونما اور حرکت کا سرچشمہ پانی۔

اس وقت یہ پانی زمین کے دروں، گڑھوں، دریاؤں اور نہروں میں ان کی وسعت کے مطابق سما جاتا ہے﴿فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا ﴾۔

چھوٹی چھوٹی ندیاں ایک دوسرے گلے ملتی ہیں۔ تو دریا وجود میں آتے ہیں دریا باہم مل مل جائیں تو دامن کہساز سے سیلابِ عظیم امنڈپڑتا ہے پانی کندھوں اور سروں سے بلند ہو جاتا ہے او رجو کچھ اس کی راہ میں آتا ہے اسے بہالے جاتا ہے۔ ایسے میں پانی کی موجیں اور لہریں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: سیلاب کے اوپر جھاگ اٹھتی ہے﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا﴾۔

"رابی" کا مادہ "ربو" (بروزن "غلو") ہے۔ یہ بلندی و برتری کے معنی میں ہے۔ "ربا" کہ جو سود یا اضافی رقم یا اضافی جنس کے معنی میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے اسی معنی میں ہے چونکہ یہ اضافے اور زیادتی کا معنی دیتا ہے۔

جھاگ صرف بارش برسنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ جو دھاتیں آگ کے ذریعے پگھلتی ہیں تاکہ ان سے زیوارات یا دیگر اسباب ِزندگی تیار کئے جائیں ان سے بھی پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ نکلتی ہے ﴿وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ﴾۔[1]

یہ تعبیر ان کٹھالیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں دھاتیں پگھلانے کے لئے ان کے نیچے بھی آگ ہوتی ہے اور اوپر بھی ۔ اس طرح سے نیچے آگ ہوتی ہے پھر اس کے اوپر ایسے پتھر کہ جن میں سا مواد ہوتا ہے ڈالے جاتے ہیں اور پھر اس کے اوپر بھی آگ ڈالتے ہیں ۔ یہ بہترین قسم کی کٹھالی ہے کہ جن میں آگ نے پگھلنے کے قابل مواد کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہوتا ہے ۔

یہ ایک ایسی وسیع مثال بیان کی گئی ہے جو صرف پانی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دھاتوں کے بارے میں بھی ہے چاہے وہ دھاتیں زیورات بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہوں یا دیگر اسباب ِحیات تیار کرنے کے کام میں آتی ہوں ۔

اس کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا حق او رباطل کے لئے مثال بیان کرتا ہے ﴿كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ﴾ ۔

پھر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور وہ پانی کہ جو لوگوں کے لئے مفید اور سود مند ہوتا ہوتا ہے زمین میں باقی رہ جاتا ہے ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ ۔

فضول شوریلی اور اندر سے خالی جھاگ کہ جو ہمیشہ اوپر ہوتی ہے لیکن کوئی فائدہ بخش نہیں ہوتی اسے ایک طرف پھینک دینا چاہئیے لیکن خاموش، بے صدا، متواضع، مفید اور سود مند پانی باقی رہ جاتا ہے اور اگر زمین کے اوپر نہ ہو تو زمین کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور زیادہ وقت نہیں گذرتا کہ رواں چشموں اور کنوؤں کی صورت میں زمین سے نکل آتا ہے اور تشنہ کاموں کو سیراب کرتا ہے ۔ درختوں کو بار آور، گلو کو شگفتہ اور پھلوں کو تیار کرتا ہے اور ہر چیز کو سروسامان ِحیات عطا کرتا ہے ۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے طور پر اور اس آیت میں زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے﴿کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْأَمْثَالَ﴾۔

چند اہم نکات

اس معنی خیز مثال میں نہایت موزوں الفاظ اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ حق و باطل کی منظرکشی نہایت عمدہ گی سے کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ حق و باطل کی شناخت کے لئے علامتیں:

حق و باطل کی پہچان کہ جو در حقیقت واقعیت اور حقیقت کو خالی اور جعلی باتوں سے الگ کرنے کا نام ہے بعض اوقات انسان کے لئے اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ کسی حتمی اور یقینی علامت کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور علامتوں کے ذریعے حقائق کو اوہام سے اور حق کو باطل سے جدا کرکے پہچاننا پڑتا ہے۔ قرآن نے مذکورہ مثال میں ان علامتوں کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

الف: حق ہمیشہ مفید اور سود مند ہوتا ہے آب شیریں کی طرح کہ جو باعث حیات ہے لیکن باطل بے فائدہ اور فضول ہوتا ہے پانی کے اوپر والی جھاگ کسی کو سیراب کرتی ہے نہ درخت اگاتی ہے۔ کٹھالی میں پگھلنے والی دھاتوں سے نکلنے والی جھاگ بھی نہ زیور بنانے کے کام آتی ہے نہ زندگی کا کوئی اور ساز و سامان۔ اگر اس جھاگ کا کوئی مصرف ہے تو پست اور بے وقعت جو کسی حساب و شمار میں نہیں آتا۔ جیسے خس و خاشاک کو جلانے کے کام لایا جائے۔

ب: باطل ہمیشہ مستکبر، بالا نشین اور قال و قیل اور شور و غوغا سے پر لیکن اند سے خالی اور کھوکھلا ہوتا ہے لیکن حق متواضع، کم صدا، باعمل، با مقصد اور وزنی ہوتا ہے۔[۲]

۲۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے متعلق اور اپنے دشمنوں، جیسے اصحاب جمل تھے، کے بارے میں فرماتے ہیں

وقد ارعدوا و برقوا و مع ھٰذین الامرین الفشل ولسنا نر عد حتی نو قع ولانسیل حتی نمطر

وہ رعد برق کی سی گرج دکھاتے ہیں لیکن انجام کار سکتی اور ناتوانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس ہم جب تک کوئی اکام انجام نہ دے لیں گرج چمک نہیں دکھاے۔ ہم نہ برسیں تو سیلاب خروشاں نہیں اٹھاتے (ہمارا پر گرام عمل ہے نہ کہ باتیں کرنا)۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۹۔

ج: حق ہمیشہ اپنے اوپر تکیہ کرتا ہے لیکن باطل حق کی آبرو کا سہارا لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو حق کے لباس میں پیش کرے اور اس کے مقام سے استفادہ کرے ۔ جیسے کہا جاتا ہے:

"ہر دروغی از راست فروغ می گیرد"

یعنی ہر دروغ اور جھوٹ سچ سے فروغ حاصل کرتا ہے ۔ کیونکہ اگر سچ بات دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی شخص کبھی جھوٹ کا اعتبار نہیں کرتا اور اگر خالص جنس دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی ملاوٹی اور جعلی چیز سے فریب نہ کھاتا ۔ اس بناء پر باطل کا کم عمر فروغ اور وقتی آبرو بھی حق کی وجہ سے ہے لیکن حق ہر جگہ اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی آبرو کا سہارا لیتا ہے ۔

اسی امر کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لو ان الباطل خلص من مزاج الحق لم یخف علی المرتادین ولو ان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنه السن المعاندین

اگر اگر باطل حق سے مل نہ جائے تو حق متلاشیوں کے لئے مخفی نہ رہے اور اگر حق باطل سے جدا ہو جائے تو بد لوگوں کی زبان اس سے منقطع ہو جائے گی ۔ [۳]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں در حقیقت تین تشبیہیں ہیں ۔

۱۔ آسمان وحی سے آیاتِ قرآن کا نزول جیسے بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے ۔

۲۔ انسانوں کے دلوں کو ایسی زمینوں، دروں اور گہرائیوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی وسعت اور ظرف کے لحاظ سے استفادہ کرتے ہیں ۔

۳۔ "شیطانی وسوسوں" کو پانی پر پیدا ہونے والی ایسی گندی جھاگ سے تشبیہ دی گئی ہے جو پانی سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ پانی کے گرنے کی جگہ کی گندگی سے پیدا ہوئی ہے ۔ اسی بناء پر نفس اور شیطان کے وسوسے مومنین کے دلوں سے بر طرف ہو جاتے ہیں اور وحی کا آپ شیریں باقی رہ جاتا ہے جو انسانوں کی ہدایت اور حیات کا موجب ہے ۔

۳۔ فائدہ ہمیشہ اہلیت کے اعتبار سے ہوتا ہے:

اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدائی فیض کے مبداء میں کسی قسم کا کوئی بخل، محدودیت اور ممنوعیت نہیں ہے ۔ جیساکہ آسمانی بادل ہر جگہ بغیر کسی قید کے برستے ہیں اور زمین کے مختلف حصے اور درّے اپنے وجود کی وسعت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ جو زمین چھوٹی ہے اس کا حصہ کم ہے اور جو بڑی ہے اس کا حصہ زیادہ ہے ۔ انسانوں کے دل اور روحیں بھی خدائی فیض سے اسی اعتبار سے مستفید ہوتی ہیں ۔

۴۔ باطل سرگرداں ہے:

جس وقت سیلِ آب کسی صاف صحرا میں پہنچا ہے اور پانی کا جوش و ضروش مدہم پڑجاتا ہے تو جو چیزیں پانی سے مخلوط ہوئی ہوتی ہیں آہستہ آہستہ تی نشین ہو جاتی ہیں اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے۔ صاف و شیریں پانی نمایاں ہو جاتا ہے۔ باطل بھی اسی طرح پریشاں حال ہے وہ مفاد اٹھانے کے چکر میں ہے لیکن جس وقت سکون آتا ہے اور ہر شخص اپنے مقام پر بیٹھ جاتا ہے حقیقی معیار اور ضابطے معاشرے میں ظاہر ہوتے ہیں تو پھر باطل کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور وہ جلدی ہی رفو چکر ہو جاتا ہے۔

۵۔ باطل صرف ایک لبادہ میں نہیں ہوتا:

باطل کی خصوصیت میں سے ہے کہ لحہ بہ لحہ شکلیں اور لباس بدلتا رہتا ہے۔ تاکہ اگر اسے ایک بھروپ میں پہچان لیا جائے تو وہ دوسرے میں اپنے تئیں چھپا لے۔

مندرجہ بالا آیت میں بھی اس معالے کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جھاگ نہ صرف پانی پر ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہر بھٹی، ہر کٹھالی اور سانچے میں سے کہ جس میں دھاتوں کو پگلایا جاتا ہے نئی جھاگ نئی شکل میں اور نئے لباس میں آشکار ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حق و باطل ہر جگہ موجود ہوتا ہے جیسا کہ ہر بہنے والی چیزیں جھاگ نئی اپنی خاص شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم شکلیں بدلنے سے دھوکا نہ کھائیں اور ہر جگہ باطل کو اس کی مخصوص صفات سے پہچان لیں کیونکہ اس کی صفات ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان صفات کے حوالے سے باطل کو پہچان کر اسے حق سے الگ کردینا چاہئیے۔

۶۔ ہر موجود کی بقا اس کے فائدے سے وابستہ ہے:

اس سلسلے میں زیر بحث آیت میں ہے کہ جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے باقی رہ جاتی ہے ﴿واماما ینفع الناس فیمکث فی الارض﴾۔

یعنی پانی کہ جو صرف باعث حیات ہے باقی رہ جاتا ہے اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے بلکہ دھات بھی چاہے وہ زیور کے لئے ہو چاہے اسباب زندگی تیار کرنے کے لئے اس میں سے بھی خالص دھات جو مفید، سودمند یا صاف و شفاف اور خوبصورت و زیبا ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے اور جھاگ کو دور پھینک دیتی ہے۔

اسی طرح سے انسان، گروہ، مکاتب فکر اور پروگرام جس قدر سود مند ہیں اس قدر بقا و حیات کا حق رکھتے ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان یا باطل مکتب و مذہب ایک مدت تک باقی رہ جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی حق کی وہ مقدار ہے جو اس میں ملا ہوا ہے اور وہ اتنی مقدار کے لئے حقِ حیات پیدا کر چکا ہے۔

۷۔ حق باطل کو کس طرح باہر نکال پھینکتا ہے:

لفظ "جفاء" جو گر جانے اور باہر کی طرف جا پڑنے کے معنی میں ہے اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لئے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ باطل اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور ہمہ وقت معاشرے سے باہر جا گرنا چاہتا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب حق جوش میں آتا ہے اور جس وقت حق میں حرکت اور جوش و خروش پیدا ہوتا ہے تو باطل کسی برتن کی جھاگ کی طرح اچھل کر باہر جا پڑتا ہے اور یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ حق کو ہمیشہ جوش اور جنبش و خروش میں رہنا چاہیئے تاکہ باطل کو اپنے سے دور رکھے۔

۸۔ باطل اپنی بقا میں حق کا مقروض ہے:

جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر پانی نہ ہو تو جھاگ کبھی بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اسی طرح اگر حق نہ ہو تو باطل کے لئے فروغ و ظہور ممکن نہیں۔ اگر صالح اور اچھے لوگ نہ ہوتے تو کوئی شخص خائن اور دھوکا باز افراد سے متاثر نہ ہوتا اور ان کے فریب میں نہ آتا لہٰذا باطل کا یہ جھوٹا جولان اور فروغ بھی فروغِ حق سے بہرہ وری ہے:

کان دروغ از راست می گیرد فروغ جھوٹ سچ سے فروغ پاتا ہے۔

۹۔ حق اور باطل میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے:

قرآن نے یہاں حق و باطل کو مجسم کرنے کے لئے ایک ایسی مثال دی ہے جو کسی مکان و زمان سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں میں انسانوں کے سامنے آتا رہتا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حق و باطل کے مابین جنگ کوئی وقتی اور مقامی جنگ نہیں ہے۔ صاف اور آلودہ پانی کی یہ ندیاں مخلوق پر صور پھونکے جانے تک اسی طرح جاری رہیں گی مگر یہ کہ ایک آئیڈیل معاشرے وجود میں آجائے (مثلاً حضرت مہدی علیہ السلام کے دورِ قیام کا معاشرہ)۔ کو اس مبارزہ کے اختتام کا اعلان ہو گا۔ حق کا لشکر کامیاب ہو جائے گا۔ باطل کی بساط الٹ جائے گی۔ بشریت اپنی تاریخ کے نئے مرحلے میں داخل ہو گی اور جب تک یہ تاریخی مرحلہ نہ آجائے ہر جگہ حق و باطل کے تصادم کی انتظار میں رہنا چاہیئے اور باطل کے مقابلے کے لئے ضروری اہتمام کرنا چاہیئے۔

۱۰۔ زندگی جہاد و جستجو کے سائے میں:

زیر بحث آیت میں دی گئی خوبصورت مثال زندگی کی اس بنیادی حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ زندگی بغیرِ جہاد کے بقا و سربلندی بغیر سعی و کوشش کے ممکن نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ لوگ وسائل زندگی یا زیور کی تیاری کے لئے جو کچھ بھٹیوں اور کٹھالیوں میں ڈالتے ہیں اس میں سے ہمیشہ غیر ضروری مواد نکلتا ہے اور جھاگ پیدا ہوتی ہے اور یہ دو قسم کے وسائل یعنی ضروری اور رفاہی وسائل (ابتغاء حلية او متاع) حاصل کرنے کے لئے اصلی مواد کو جو عالمِ طبیعت میں اصلی شکل میں نہیں مل سکتا اور ہمیشہ دوسری چیزوں میں ملا ہوتا ہے اسے اآگ کی کٹھالی میں ڈالنا پڑتا ہے اور اسے پاک صاف کرنا پڑتا ہے تاکہ خالص دھات میسر آسکے اور یہ کام سعی و جستجو کے بغیر ممکن نہیں۔

اصولی طور پر دنیا وی زندگی کا مزاج یہ ہے کہ گلوں کے ساتھ خار م نوش کے ساتھ نیش، اور کامیابیوں کے ساتھ مشکلات ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کی کہاوت ہے کہ:

خزانے ویرانوں میں ہوتے ہیں اور ہر خزانے کے اوپر ایک اژدھا سویا ہوا ہے۔

کیا یہ ویرانے اور اژدھا سوائے مشکلات کے کسی اور چیز کا نام ہے کہ جو کامیابی کے راستے میں موجود ہیں۔

ایرانی داستانوں میں بھی رستم کی داستان میں ہے کہ وہ کامیابی تک پہنچنے کے لئے مجبور تھا کہ سات خوان سے گزرے کہ جن میں سے ہر ایک انبوہِ مشکلات کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر مثبت کام کے راستے میں درپیش ہوتی ہیں۔

بہر حال قرآن نے یہ حقیقت با رہا بیان فرمائی ہے کہ انسان کوئی کامیابی مشکلات اور تکالیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے قراان میں مختلف عبارتیں ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ میں ہے:

"﴿ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما يأتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم البأساء و الضراء و زلزلوا حتى يقول الرسول و الذين أمنوا معه متى نصر الله قريب﴾"

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ کہ تمام آسانی سے جنت میں جا پہنچو گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں اائیں گے جو گزشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے، وہی لوگ کہ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے کہ خدا کی مدد کہاں ہے تو ان بہت ہی سخت اور دردناک لمحات میں خدائی نصرت ان کے پاس آپہنچی اور ان سے کہا گیا کہ خدائی مدد قریب ہے۔

۱۔ اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے

اس معنی خیز زیور اور متاع حاصل کرنے کے لئے آگ روشن کرتے ہیں اس سے پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ حاصل ہوتی ہے ۔

۲۔ "زبد" کیا ہے ؟ "زبد" پانی کے اوپر والی یا ہر قسم کی جھاگ کو کہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آبِ شیریں پر بہت کم جھاگ آتی ہے کیونکہ پانی کے خارجی اجسال سے آلودہ ہونے کی وجہ سے جھاگ پیدا ہوتی ہے ۔یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر حق اپنی اصل صفائی اور پاکیزگی پر رہے تو اس کے اطراف میں باطل کی جھاگ کبھی پیدا نہ ہوگی لیکن جب حق آلودہ گندے ماحول میں ہو اور حقیقت خرافات میں کھو جائے ، درستی نادرستی سے مل جائے اور پاکیزگی ناپاکی سے خلط ملط ہو جائے تو باطل کی جھاگ اس کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے ۔

۳۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۔۵۰۔

قرآنی مثالیں

مباحث کی توضیح و تفسیر میں مثال کی تاثیر ناقابل انکار ہے ۔ اسی بناء پر کسی بھی علم میں حقائق کے اثبات اور توضیح کے لئے انہیں ذہن کے قریب لانے کے لئے ہم مثال پیش کرنے سے بے نیاز نہیں ہیں ۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بر محل مثال کو جو مقصود سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور اس پر منطبق ہو مطلب کو آسمان سے زمین پر لے آتی ہے اور اسے سب کے لئے قابل فہم بنادیتی ہے ۔

بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ مختلف علمی، ترتیبی، اجتماعی اور اخلاقی مباحث میں مثال مندرجہ ذیل موثر اثرات رکھتی ہے ۔

۱۔ مثال مسائل کو حسّی بنا دیتی ہے :

انسان چونکہ زیادہ تر محسوسات سے مانوس ہے اور پیچیدہ عقلی حقائق نسبتاً افکار کی دسترس سے دور ہوتے ہیں لہٰذا حسّی مثالیں ان دور دراز فاصلوں کو سمیٹ دیتی ہیں اور انہیں محسوسات کے آستانے پر لاکھڑا کرتی ہیں اور ان کے ادراک کو دل چسپ، شیریں اور اطمینان بخش بنادیتی ہیں ۔

۲۔ مثال راستے کو مختصر کردیتی ہے :

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک گہرا، منطقی اور عقلی مسئلہ ثابت کرنے کے لئے انسان کو مختلف استدلالات کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر پھر بھی اس کے گرد ابہام موجود رہتا ہے لیکن ایک واضح اور مقصد سے ہم آہنگ مثال راستہ اس قدر مختصر کردیتی ہے کہ استدلال کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور متعدد استدلالات کی ضرورت بھی نہیں رہتی ۔

۳۔ مثال مسائل کو سب کے لئے یکساں بنا دیتی ہے :

بہت سے علمی مسائل کہ جو اپنی اصل صورت میں صرف خواص کے لئے قابل فہم ہیں اور عامۃ الناس اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے لیکن جب ساتھ مثال موجود ہو اور اس کے ذریعے وہ قابل فہم ہوجائیں تو ان سے سب لوگ مستفید ہوں گے چاہے وہ علم و دانش کی عمومیت دینے کے اعتبار سے ناقابل انکار کارآمد چیزیں ہیں ۔

۴۔ مثال مسائل کو زیادہ قابل اطمینان بنا دیتی ہے :

کلیاتِ عقلی جس قدر بھی مستدل او ر منطقی ہوں جب تک ذہن تک رہتے ہیں ان کے بارے مین کافی اطمینان پیدا نہیں ہوتاکیونکہ انسان ہمیشہ اطمینان کو عینیت اور ظاہری وجود میں ڈھونڈتا ہے او رمثال ذہنی مسائل کو عینیت بخشتی ہے اور انہیں عالمِ خارج میں واضح کردیتی ہے ۔ اسی لئے باور کرنے ، قبول کرنے اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے مثال بہت موثر ہوتی ہے ۔

۵۔ مثال ہٹ دھرموں کو خاموش کردیتی ہے :

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسائل کلیات مستدل اور منطقی صورت میں پیش کیے جائیں تو ایک ہٹ دھرم شخص ان پر خاموش نہیں ہوتا اور اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے لیکن جب مسئلہ مثال کے قالب میں ڈھالا جائے تو اس کے لئے راستہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں بہانہ جوئی کی مجال نہیں رہتی ۔

نامناسب نہیں ہوگا اگر ہم اس موضوع کے لئے چند مثالیں پیش کریں تاکہ واضح ہو جائے کہ مثال میں کس قدر اثر ہے ۔

جو لوگ یہ اعتراض کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ صرف ماں سے کس طرح پیدا ہو گئے اور کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بغیرباپ کے پیدا ہو جائے ، قرآن ان کے جواب میں فرماتا ہے :﴿ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل أدم خلقه من تراب﴾

عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا ۔ (آل عمران ۵۹)

صحیح طرح سے غور کریں کہ ہم جس قدر بھی ہٹ دھرم لوگوں کے سامنے کہیں کہ یہ کام خدا کی لامتناہی قدرت کے سامنے نہایت معمولی ہے پھر بھی ممکن ہے وہ بہانے ڈھونڈیں لیکن جب ان سے یہ کہیں کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ حضرت آدم کو جو پہلے انسان تھے مٹی سے پیدا ہوئے تھے تو جو خدا ایسی قدرت رکھتا ہے وہ کسی بشر کو بغیرباپ کے پیدا کیوں نہیں کرسکتا ۔

جن منافقوں نے اپنے نفاق کے زیر سایہ چندن دن ظاہراً سکون و آرام سے بسر کیے ہیں قرآن مجید ان کے بارے میں ایک خوبصورت مثال پیش کرتا ہے ۔ قرآن انہیں ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہے جو تاریک بیابان سے گزرہا ہے ۔ رات اندھیری ہے ۔ بادل گرج رہے ہیں ۔ مسافر آندھی، طوفان او ربارش میں گرفتار ہو جاتا ہے ۔ وہ اس طرح سے سر گر دان ہے کہ اسے کسی طرف کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں جب آسمانی بجلی چمکتی ہے تو بیابان کی فضا چند لمحوں

کے لئے روشن ہو جاتی ہے اور وہ ارادہ کرتا ہے کہ کسی طرف جائے تاکہ اسے راستہ مل جائے لیکن جلدی ہی وہ بجلی خاموش ہوتی ہے اور وہ اسی طرح بیابان میں سرگرداں رہ جاتا ہے۔ (بقرہ۔ ۲۰)

کیا سرگرداں منافق کی حالت کی تصویر کشی کے لئے کہ جو اپنی روحِ نفاق او رمنافقانہ عمل سے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہتا ہو اس سے زیادہ جاذبِ نظر مثال ہو سکتی ہے؟ یا یہ کہ جب ہم کچھ لوگوں سے کہتے ہیں کہ راہِ خدا میں خرچ کرو تو خدا تمہیں کئی گنازیادہ اجر دے گا تو ہو سکتا ہے کہ عام لوگ اس بات کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن جب یہ کہا جائے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا اس بیج کی مانند ہے جسے زمین میں ڈالا جائے کہ جس سے سات خوشے اگتے ہیں اور ہر خوشے میں ہو سکتا ہے ایک سو دانے ہوں تو پھر یہ مسئلہ پوری طرح سے قابل فہم ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے

﴿مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة﴾ (بقرہ ۲۶۱)

عام طور پر ہم کہتے ہیں کہ ریا کاری والے اعمال فضول او ربیکار ہیں اور انسان کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہوسکتا ہے یہ بات کچھ لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہو کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک فائدہ مند عمل مثلاً ایک ہسپتال یا ایک مدرسہ اگرچہ دکھاوے اور ریاکاری کے ارادہ سے ہو بارگاہ قدرت میں بے وقعت ہو لیکن قرآن ایک مثال کے ذریعے اس بات کو پوری طرح قابلِ فہم اور دلچسپ بنا دیتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ﴿فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلداً﴾

ایسے اشخاص کا عمل پتھر کے ایک ٹکڑے کی مانند ہے کہ جس پر کچھ مٹی ڈال دی گئی ہو او راس پر کچھ بیج چھڑک دیا جائے۔ تو جس وقت بارش برستی ہے تو بجائے کہ یہ بیج بار آور ہو بارش اسے پتھر پر پڑی ہوئی سطحی مٹی کے ساتھ دھو ڈالتی ہے اور اسے ایک طرف پھینک دیتی ہے۔ (بقرہ۔ ۲۶۴)

ریا کاری اور بے بنیاد اعمال کی بھی یہی حالت ہے۔ ہم دور نہ نکل جائیں اسی زیر بحث مثال میں کہ جو حق و باطل کے مابین مقابلے کے بارے میں اس میں معاملے کی کیسی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور اسے دقیق طور پر مجسم کیا گیا ہے۔ تمہید، نتائج اور حق و باطل کی مخصوص صفات اور آثار میں سے ہر ایک کو اس مثال میں اس طرح سے منعکس کیا گیا ہے کہ مسئلہ سب لوگوں کے لئے قابل فہم او راطمینان بخش ہو گیا ہے۔ اس کے پیش کئے گئے حقائق ہٹ دھرم افراد کو خاموش کردینے والے ہیں نیز تمام چیزوں سے قطع نظر یہ مثال طولانی مباحث کی زحمت سے بچا دیتی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ مادہ پرست امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا: قرآن میں ہے کہ جس وقت دوزخیوں کے جسم کا چمڑا آگ کی شدت سے جل جائے گا تو ہم اسے دوسرا چمڑا پہنادیں گے تاکہ وہ عذاب کا ذائقہ اچھی طرح سے چکھیں ۔ اس دوسرے چمڑے کا کیا گناہ ہے کہ اسے سزا اور عذاب دیا جائے ۔

اس کے جواب میں امام نے فرمایا:

وہ چمڑا بعینہ پہلا وا چمڑا بھی ہے اور اس کا غیر بھی ہے ۔

سوال کرنے والے اس جواب سے مطمئن نہ ہو اور اس جواب سے کچھ نہ سمجھ سکا لیکن امام نے ایک ناطق مثال کے ذریعے معاملہ اس طرح سے واضح کردیا کہ گفتگو کی گنجائش باقی نہ رہی ۔ آپ نے فرمایا:

دیکھو! تم ایک پرانی اور خراب اینٹ کو ریزہ ریزہ کردیتے ہو پھر اسی خاک کو بھگو کر سانچے میں ڈالتے ہو اور اس سے ایک نئی اینٹ بناتے ہو ۔ یہ وہی پہلے والی اینٹ ہے اور ایک لحاظ سے اس کی غیر بھی ہے ۔ [1]

یہاں ایک نکتہ کا ذکر بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مثال اپنے ان تمام مفید اور موثر اثرات کے باوجود اپنا بنیادی تقاضا بھی پورا کرسکتی ہے جب وہ اس مطلب سے ہم آہنگ ہو جس کے لئے اسے پیش کیا جا رہا ہے ورنہ مثال خود گمراہ ہو گی یعنی جیسے ایک صحیح اور ہم آہنگ مثال مفید اور مؤثر ہے اسی طرح ایک انحرافی اور غلط مثال گمراہی اور تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے ۔

اسی بناء پر منافقین اور بداندیش افراد ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے اور سادہ لوح افراد کو غافل کرنے کے لئے غلط مثالوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے جھوٹ کے لئے مثال سے مدد لیتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ ہم انحرافی اور غلط مثالوں سے فائدہ اٹھانے والے ایسے افراد پر پوری توجہ سے نظر رکھیں ۔

۱۔ اس حدیث کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۲ ص۳۰۸ (اردو ترجمہ) میں ملاحظہ فرمائیں ۔ وہاں یہ حدیث مجالس شیخ اور احتجاج طبرسی کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے ۔

آیت ۱۸

۱۸۔ ﴿لِلَّذِینَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْحُسْنَى وَالَّذِینَ لَمْ یَسْتَجِیبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِی الْأَرْضِ جَمِیعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ أُوْلَئِکَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾۔

ترجمہ

۱۸۔ ان لوگوں کے لئے کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کیا ہے نیک (انجام، جزا اور) نتیجہ ہے اور وہ کہ جنہوں نے اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا (وہ عذاب الٰہی کی وحشت میں اس طرح غرق ہوں گے کہ) اگر وہ سب کچھ جو زمین پر ہے اور اس کی مثل ان کی ملکیت ہو اور وہ یہ سب کچھ عذاب سے نجات کے لئے دے دیں (لیکن وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا) ان کے لئے برا حساب اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کس قدر برا ٹھکانا ہے۔

جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا

گشتہ آیت میں حق و باطل کا چہرہ نمایاں کرنے کے لئے ایک رسا اور فصیح و بلیغ مثال پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد اب اس مقام پر ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کرلیا اور اس کے گرویدہو گئے نیز ان افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے حق سے روگردانی کرتے ہوئے باطل کی طرف رخ کیا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کے لئے، جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کرلیا ہے نیک جزا، سود مند نتیجہ اور عاقبتِ محمود ہے ﴿لِلَّذِینَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْحُسْنَى﴾۔

"حسنیٰ" (نیکی) کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ہر خیر و سعادت شامل ہے۔ نیک خصائل اور اخلاقی فضائل سے لے کر پاک و پاکیزہ اجتماعی زندگی، دشمن کا پر کامیابی اور بہشتِ جاوداں تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور وہ یہ جنہوں نے پروردگار کی یہ دعوت قبول نہیں کی ان کا انجام اس قدر برا اور رقت بار ہے کہ اگر تمام روئے زمین اور حتیٰ کہ اس کی مثل بھی ان کی ملکیت میں ہو اور وہ یہ سب کچھ اسے برے انجام سے نجات کے لئے دینے پر آمادہ ہوں تو بھی "ان سے یہ سب کچھ قبول نہیں کیا جائے گا ﴿وَالَّذِینَ لَمْ یَسْتَجِیبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِی الْأَرْضِ جَمِیعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ﴾۔

ان کے لئے عذاب اور سزا کے عظیم ہونے کی تصویر کشی کے لئے اس سے بڑھ کر رسا اور عمدہ تعبیر نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان تمام روئے زمین بلکہ اس کے دوگنا کا مالک ہو اور وہ سب کچھ اپنے آپ کو بچانے کے لئے دے دے مگر وہ اس کے لئے فائدہ مند نہ ہو۔

یہ جملہ در حقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ ایک انسان کی آخری آرزو کہ جس سے برتر تصور نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ وہ تمام روئے زمین کا مالک ہو لیکن ستمگروں اور دعوت ِحق کے مخالفوں کو دئے جانے والے عذاب کی شدت اس حد تک ہے کہ وہ اس بات پر تیار ہوں کہ یہ آخری دنیاوی ہدف بلکہ اس سے بھی بر تر و بالاتر کو فدیہ کے طور پر دے کر آزاد ہو جائیں اور بالفرض اگر ان سے یہ قبول کر بھی لیا جاتا تو یہ صرف عذاب سے نجات ہوتی۔ لیکن دعوتِ حق کو قبول کرنے والوں کے لئے جو انتہائی عظیم اجر ہیں ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "مثلہ معہ" صرف اسی معنی میں نہیں کہ پورے کرہ زمین کی مانند ان کے پاس مزید ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بڑھ کر جتنی زیادہ دولت ِو سلطنت کے مالک ہو جائیں اور وہ اپنی نجات کے لئے سب کچھ دینے پر تیار ہوں گے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ انسان چونکہ ہر چیز اپنے لئے چاہتا ہے اور جب وہ خود عذاب میں غرق ہو تو پھر تمام دنیا کی مالکیت کا اسے کیا فائدہ۔

اس بد بختی (ساری دنیا دے کر بھی نجات حاصل نہ ہونا) کے بعد ایک اور بد بختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کا حساب کتاب سخت اور برا ہو گا ﴿أُوْلَئِکَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ﴾۔

"سوء الحساب" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے اس سے مراد ایسا حساب ہے جو بہت دقیق اور باریک بین ہو اور جس میں کوئی در گزر نہ ہو کیونکہ "سوء الحساب" ظلم و ستم کے معنی میں خدائے عادل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ امام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: فلاں شخص کو تجھ سے کیوں شکایت ہے۔

اسے یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنا حق اس سے آخر تک لیا ہے۔

جب امام نے یہ بات سنی تو غضب ناک ہو کر بیٹھ گئے، پھر فرمایا:

کانک اذا استقضیت حقک لم تسبیٔ ارایت ماحکی اللہ عزوجل: و یخا فون السوء الحساب، تراهم یخافون اللہ ان یجور علیهم لاو اللہ ماخافوا الا الاستقصاء فسماه اللہ عزو جل سوء الحساب فمن استقصی فقد اسائه۔

گویا تیرا گمان ہے کہ اگر تو آخری مرحلہ تک اپنا حق لے لے تو تُو نے کوئی برا نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے۔ کیا تو نے خدا کا یہ ارشاد نہیں دیکھا کہ جس میں اس نے فرمایا ہے:و یخاف فون سوء الحساب (اور بدکار برے حساب سے ڈرتے ہیں)۔

کیا تیرا خیال ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان پر ظلم کرے گا؟ بخدا ایسا نہیں وہ تو اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان کا حساب دقیق طور پر لے اور آخری مرحلے تک پہنچائے۔ خدا نے اس کا نام "سوء الحساب" رکھا ہے لہٰذا جس شخص نے حساب کرنے میں سخت گیری کی اس نے برا حساب کیا ہے۔ [1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد یہ ہے کہ ان کا محاسبہ سرزنش کے ساتھ ہو گا۔ اس سے ایک تو اصل حساب کی وحشت ہوگی اور اس کے علاوہ بھی وہ سرزنش کی تکلیف سے گزریں گے۔

بعض دیگر مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد "سوء الجزاء" (برا بدلہ) ہے یعنی ان کے لئے بری سزا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب پاک ہے یا فلاں شخص کا حساب تاریک ہے یعنی ان کے حساب کا نتیجہ اچھا یا برا ہے یا یہ کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب اس کے ہاتھ میں دے دو یعنی اس کے کام کے مطابق اسے سزا یا بدلہ دو۔

یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں اور ہوسکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کی مراد ہوں یعنی ایسے سخت حساب سے گزرنا ہو گا اور محاسبہ کے ساتھ ساتھ انہیں سرزنش بھی ہوگی اور حساب کے بعد انہیں بے کم وکاست سزا بھی دی جائے گی۔ آیت کے آخر میں ان کے لئے تیسرے عذاب یا سزا کے آخری نتیجے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ کیسا برا ٹھکانا ہے ﴿وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾۔

"مھاد" اصل میں "مھد" کے مادہ سے تیار اور مہیا کرنے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ بستر کے معنی میں بھی آیا ہے کہ جس سے انسان آرام اور استراحت کے موقع پر استفادہ کرتا ہے کیونکہ وہ اسے استراحت کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

یہ لفظ اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے سرکش افراد بجائے بسترِ استراحت پر آرام کرنے کے آگ کے جلادینے والے شعلوں پر رہیں گے۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۲۸۸ (یہ حدیث اگرچہ اس سورہ کی آیہ ۲۱ کی تفسیر کے متن میں آئی ہے لیکن واضح ہے کہ یہ لفظ "سوء الحساب" کا عمومی مفہوم بیان کررہی ہے)۔

ایک نکتہ

آیات الٰہی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے ۔ ایک وہ گروہ ہے خدا کی بارگاہ میں جن کا حساب اور سہولت آسانی سے ہو گا اور اللہ تعالی ان کے بارے میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں کرے گا ۔ ارشاد الٰہی ہے :﴿اما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حساباً یسیراً﴾

اس دن جسے نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے آسان حساب لیا جائے گا ۔ (انشقاق ۔ ۸۔۷)

اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ ہیں جن سے " شدت " کے ساتھ حساب لیا جائے گا ۔ ان سے ذرہ اور مثقال بھر کا حساب نہایت باریک بینی سے لیا جائے گا ۔ جیسا کہ بعض شہر جن کے لوگ سرکش اور گنہگار تھے ، ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے :﴿فحاسبنا حساباً شدیداً و عذابنا ها عذاباً نکراً﴾

پس ہم نے ان کا بڑی سختی سے حساب لیا اور انہیں برے عذاب کی سزا دی ۔

اسی طرح زیر بحث آیت میں ہے جس میں " سوء الحساب "کی تعبیر استعمال ہوئی ہے ۔

یہ اس بناء پر کہ کچھ لوگ دنیا وی زندگی میں دوسروں سے حساب لینے میں بہت زیادہ سختی کرتے ہیں یعنی بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنے حق کا آخری پیسہ تک وصول کرلیں او رجب دوسرے سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو آخری حد امکان تک اسے سزا دیتے ہیں ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی بیوی ، اولاد ، بھائیوں اور دوستوں تک سے ذرہ بھر در گزر نہیں کرتے اور چونکہ دوسرے جہان کی زندگی اس جہان کا رد عمل ہے لہٰذا خدا بھی ان کے حساب کتاب میں ایسی سخت گیری کرے گا تاکہ انہوں نے جو کام بھی کیا ہے اس کے جواب دہ ہوں اور ان کے بارے میں کچھ بھی درگزر اور چشم پوشی نہیں کی جائے گی ۔ اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو آسان گیر ہیں بہت زیادہ درگزر کرنے والے ہیں اور نہایت شفیق و مہربان ہیں ۔ خصوصاًدوستوں اور جان پہچان والے افراد یا جن پر ان کا کوئی حق ہے یا جو افراد ضعیف اور کمزور ہیں ان کے لئے ایسے مہربان اور بزرگوار ہیں کہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بہت سے مواقع پر اپنے آپ کو غافل ظاہر کریں اور بعض کی غلطیوں اور گناہوں سے چشم پوشی کرلیتے ہیں البتہ یہاں گناہوں سے مراد ایسے گناہ ہیں جو شخصی اور انفرادی پہلو رکھتے ہیں ۔

خدا ایسے افراد کے لئے آسانی فراہم کرتا ہے ۔ انہیں اپنی عفوِ بے پایاں اور رحمت ِ وسیع سے نوازتا ہے اور انہیں آسانی سے حساب کی منزل سے گزار دیتا ہے ۔

یہ بات تمام انسانوں کے لئے ، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو کسی امر کے سر براہ یا نگران ہوتے ہیں اور لوگوں سے ان کا رابطہ اور تعلق ہوتا ہے ان کے لئے ایک عظیم درس ہے ۔

آیات ۲۴،۲۳،۲۲،۲۱،۲۰،۱۹

۱۹ ۔﴿أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ﴾۔

۲۰۔﴿الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَلاَيَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ﴾۔

۲۱۔﴿وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ﴾۔

۲۲۔﴿وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلاَةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلاَنِيَةً وَيَدْرَئُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُوْلَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾۔

۲۳۔﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالْمَلاَئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ﴾۔

۲۴۔﴿سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾۔

ترجمہ

۱۹۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اس شخص کی طرح ہے جو نابینا ہے بس سمجھدار لوگ ہیں نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

۲۰۔ وہی کہ جو عہد الٰہی کو وفا کرتے ہیں اور پیمان شکنی نہیں کرتے۔

۲۱۔ وہی کہ جو وہ پیوند بر قرار رکھتے ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے حکم دیا ہے اور جو اپنے پروگار سے ڈرتے ہیں اور (روز قیامت کے) حساب کی برائی سے ڈرتے ہیں۔

۲۲۔ اور وہ کہ جو اپنے پروردگار کی (پاک) ذات کے لئے صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو روزی دی ہے اس میں سے پنہاں اور آشکار خرچ کرتے ہیں اور حسنات کے ذریعے سیئات کو ختم کرتے ہیں۔ ان کے لئے آخرت میں اچھا گھر ہے۔

۲۳۔وہ جنت کے سدا بہار باغوں میں داخل ہوں گے اسی طرح ان کے آباء، ازواج اور اولاد میں سے صالح افراد بھی (داخل بہشت ہوں گے) اور ہر دروازے سے ان کے لئے فرشتے داخل ہوں گے۔

۲۴۔ (اور ان سے کہیں گے) سلام ہو تم پر، صبر و استقامت کی بناء پر۔ تمہیں یہ آخری گھر کیسا اچھا نصیب ہوا ہے ۔

اہل شعور کا طرز عمل جنت کے آٹھ دروازے

زیر نظر آیات میں حق کے طرفداروں کے اصلاحی طرز عمل کے جزئیات کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ یہ آیات گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں ۔

زیر نظر پہلی آیت میں استفہامِ انکاری کی صورت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اس شخص جیسا ہے جو نابینا ہے ﴿أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْکَ مِنْ رَبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ هُوَ أَعْمَى﴾ ۔

یہ کیسی عمدہ تعبیر ہے ۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص جانتا ہے کہ یہ قرآن بر حق ہے کیا وہ اس کی مانند ہے کہ جو نہیں جانتا بلکہ فرمایا کیا جو جانتا ہے وہ اندھے کی طرح ہے ؟ یہ تعبیر ایک اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اس حقیقت کو نہ جاننا کسی بھی طرح ممکن نہیں سوائے اس کے کہ انسان کے دل کی آنکھ بالکل بے کار ہوچکی ہو ورنہ کیسے ممکن ہے کہ چشم بینا رکھنے والا رخ آفتاب نہ دیکھ سکے اور اس قرآن کی عظمت بالکل نورِ آفتاب کی مانند ہے ۔

اسی لئے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: صرف وہی لوگ نصیحت پاتے ہیں جو اولو الالباب ہیں اور صاحبانِ فکر و نظر ہیں ﴿إِنَّمَا يَتَذَکَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ﴾ ۔

"الباب" جمع ہے "لب" کی جو ہر چیز کے "مغز" کے معنی میں ہے ۔ اسی بناء پر" اولو الالباب" کا متضاد بے مغز، کھوکھلے اور وہ افراد ہیں جن کے اندر کچھ نہ ہو۔

بعض عظیم مفسرین کے بقول یہ آیت لوگوں کو حصولِ علم اور جہالت کا زیادہ سے زیادہ مقابلہ کرنے کی تاکید کرتی ہے کیونکہ اس میں بے علم اور دانش سے محروم افراد کو نابینا قرار دیا گیا ہے ۔

اس کے بعد " اولو الالباب "کی تفسیر کے طور پر صاحبانِ حق کے طرز عمل کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں سب سے پہلے ایفائے عہد کرتے ہیں اور پیمان شکنی نہیں کرتے ﴿الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَلاَيَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ﴾ ۔

اس میں شخص نہیں کہ " عہد اللہ "(عہد الٰہی) کا ایک وسیع مفہوم ہے ۔ اس میں فطری عہد و پیمان کہ جو خدا نے تضاجائے فطرت کے مطابق انسان سے لئے ہیں وہ بھی شامل ہیں ۔ مثلاً توحید اور حق عدالت سے انسان کی فطری محبت کا عہد ۔ اسی طرح عقلی عہدپیمان یعنی وہ عہد کہ جو غور و فکر سوچ بچار اور قوتِ عقل کے نتیجے میں ناگزیر ہو جاتے ہیں جیسے عالم ہستی اور مبداء و معاد کے حقائق کا ادراک انہیں غور و فکر کے نتیجے میں کرلیتا ہے ۔

اسی طرح اس میں شرعی پیمان شامل ہیں یعنی وہ پیمان جو پیغمبر نے مومنین سے لیا ہے کہ وہ احکامِ خدا وندی کی اطاعت کریں گے اور اس کی نا فرمانی اور گانہ ترک کردیں گے ۔

یونہی وہ پیمان کہ جو انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے عہد الٰہی کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ خدا ہی کا حکم ہے کہ یہ پیمان بھی پورے کئے جائیں بلکہ ایسے پیمان تشریعی بھی ہیں اور عقلی بھی ۔

اہل شعور کے لائحہ عمل کا دوسرا حصہ رشتہ ناتوں کی حفاظت اور پاسداری ہے ، جیسا کہ فرمایا گیا ہے : یہ وہی لوگ ہیں جو ان رشتوں اور رابطوں کو قائم کھتے ہیں جن کی حفاظت کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے ﴿وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ ﴾ ۔

اس سلسلے میں اس سے زیادہ وسیع تعبیر نہیں مل سکتی کیونکہ انسان کا تعلق خدا سے بھی ہے ، انبیاء سے بھی ہے ، اوررہبروں سے بھی ہے ۔ انسان کا رابطہ باقی تمام انسانوں کے ساتھ بھی ہے چاہے وہ دوست ہوں ، ہمسائے ہیں ، رشتہ دار ہوں ، دینی بھائی ہوں یا ہم نوع ہوں ۔

اس کا تعلق خود اپنے ساتھ ہے ۔ مندرجہ بالا حکم میں تمام رشتہ ناتوں کو محترم شمار کیا گیا ہے ۔ سب کا حق ادا کرنا چاہئیے اور ایسا کام انجام نہیں دینا چاہئیے جس سے ان میں سے کسی ایک سے تعلق منقطع ہونے تک جا پہنچے ۔

درحقیقت انسان ایک ایسا موجود نہیں جو دوسرے سے کٹ کر او رجدا ہو کر رہ سکے بلکہ اس ک اوجود سرتا پا رشتے ناتوں ، تعلق اور رابطوں سے تشکیل پاتا ہے ۔

ایک طرف سے اس کا تعلق پیدا کرنے والے کی بارگاہ سے ایسا ہے کہ اگر یہ اسے منقطع کرلے تو نابود ہو جائے ۔ جیسے ایک بلب کا رابطہ اگر بجلی پیدا کرنے والے مبداء سے کٹ جائے ۔ لہٰذا جیسے تکوینی لحاظ سے انسان اس عظیم مبداء سے تعلق رکھتا ہے چاہیئے کہ تشریعی اعتبار سے بھی اس کے ساتھ اطاعت کا رشتہ برقرار رکھے ۔

دوسری طرف اس کا رشتہ پیغمبر اور امام سے رہبر ، راہنما اور پیشوا کے حوالے سے ہے اور ارگ یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو انسان بے راہ رو اور سرگرداں ہو جائے گا ۔ تیسری طرف انسان کا ایک رشتہ پورے انسانی معاشرے سے بھی ہے خصوصاً ان افراد سے جو اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں جیسے ماں ، باپ ، رشتہ دار ، دوستاور مربی ۔

چوتھی طرف اپنی ذات سے بھی اس کا ایک تعلق ہے اس لحاظ سے وہ اپنے مصالح کی حفاظت اور اپنی ترقی اور کمال تک پہنچنے کا ذمہ دار ہے ۔

در حقیقت ان تمام رشتوں اور رابطوں کو بر قرار رکھنا "یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل" کا مصداق ہے اور ان میں سے کسی کو منقطع کرنا" ما امر اللہ بہ ان یوصل" کو منقطع کرنا ہے کیونکہ خدا نے ان تمام کے "وصل" کا حکم دیا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ اس سے ان احادیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو آیت کی تفسیر میں کبھی خاندان اور رشتہ داروں سے تعلق کو قائم رکھنے کا کہتی ہیں، کبھی امام اور پیشوائے دین سے مربوط رہنے کا کہتی ہیں، کبھی آل محمد سے رابطے کا حکم دیتی ہیں اور کبھی تمام اہل ایمان سے تعلق کو کہتی ہیں۔

مثلاً ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے " الذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل" کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو۔فقال قرابتک

فرمایا: تیرے اپنے قریبی مراد ہیں۔ (نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۹۴)۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام ہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

نزلت فی رحم اٰل محمد و قد یکون فی قرابتک

یہ جملہ آل محمد کے رشتے کے بارے میں ہے نیز تیرے اپنے قریبوں کے بارے میں بھی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ امام نے فرمایا:

فلاتکونن ممن یقول للشیء انه فی شیءً واحد

تو ایسا شخص نہ ہو جا کہ جو آیت کے معنی کو ایک ہی مصداق میں منحصر کردے۔ (نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۹۴)۔

نیز ایک تیسری حدیث بھی اسی عظیم راہنما سے مروی ہے جس میں آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هو صله الامام فی کل سنة بما قل او کثر ثم قال وما ارید بذٰلک الا تزکیتکم

اس سے مراد مسلمانوں کے امام اور پیشوا سے ہر سال مالی امداد کے ذریعے رشتہ بر قرار رکھنا ہے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ ۔اس کے بعد آپ نے فرمایا:

اس کام سے میری مراد صرف یہ ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ کروں۔ (نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۹۵)۔

حامیان حق کا تیسرا اور چوتھا طرز عمل یہ ہے کہ " وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور قیامت کی عدالت کے حساب کی برائی سے خوف کھاتے ہیں﴿وَيَخْشو نَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ﴾۔

اس سلسلے میں کہ "خشیت" اور "خوف" میں کیا فرق ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں، بعض نے کہا ہے کہ "خشیت" وہ خوف ہے جو دوسرے کے احترام اور علم ویقین کی بنیاد پر ہو۔ لہٰذا قرآن میں یہ حالت علماء سے مخصوص شمار کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿انما یخشی اللہ من عبادہ العلمائ﴾

بندگان خدا سے صرف علماء اس سے خشیت رکھتے ہیں۔ (فاطر۔ ۲۸)۔

لیکن قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے ان بہت سے مواقع کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ بالکل "خوف" کے مترادف کے طور پر آیا ہے اور اس کا ہم معنی ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا پروردگار سے ڈرنا اس کے حساب و کتاب اور عذاب و سزا سے ڈرنے کے علاوہ کوئی اور خوف ہے، اور اگر ایسا ہے تو پھر "یخشون ربھم" اور "یخافون سوء الحساب" کے درمیان کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا سے ڈرنا ہمیشہ اور لازماً اس کے عذاب اور حساب کتاب سے ڈرنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ خوف اس کے مقام کی عظمت کا احساس ہے اور بندگی کی ذمہ داری کے سنگین ہونے کے خیال سے (یہاں تک کہ سزا اور عذاب کی طرف توجہ کے بغیر بھی یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے) اہل ایمان کے دلوں میں یہ احساس خود بخود ایک خوف اور وحشت کی حالت پیدا کردیتا ہے۔ وہ خوف جو ایمان کی پیداوار ہے، عظمت الٰہی سے آگہی کا نتیجہ ہے اور اس کی بارگاہ میں احساسِ مسئولیت کی بدولت ہے (سورہ فاطر کی آیہ ۲۸ ممکن ہے اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا)۔

ایک اور سوال یہاں "سوء الحساب" کے حوالے سے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا قیامت میں واقعاً محاسبہ اعمال کے موقع پر بعض افراد کو "بدحسابی" کا سامنا کرنا پڑے گا۔

گزشتہ چند آیات کے ذیل میں ہم اس سوال کا جواب ذکر کر چکے ہیں۔ وہاں بھی بالکل یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی درگزر کے بغیر تمام جزئیات کا باریک بینی سے حساب لیا جانا ہے۔ اصطلاحاً جسے بال کی کھال اتارنا کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جاذب نظر حدیث بھی وارد ہوئی ہے جو وہاں بیان کی جاچکی ہے۔

نیز جیسا کہ ہم نے وہاں کہا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد ایسا محاسبہ ہو کہ جس میں سرزنش بھی شامل ہو۔ بعض نے "سوء الحساب" کی تفسیر "سوء الجزاء" یعنی بری سزا کے طور پر کی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کا حساب چکا دو یعنی اسے سزا دو۔

ہم نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "سوء الحساب" کا ایک جامع مفہوم ہے اور اس میں یہ تمام معانی شامل ہیں ۔

ان کا پانچواں طرزِ عمل تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت ہے ، وہ مشکلات کہ جو اطاعت ، ترکِ گناہ دشمن کے خلاف جہاد اور ظلم و سرکشی کے مقابلے کے راستے میں پیش آتی ہیں ۔ (۱)

وہ صبر و استقامت بھی پروردگار کی رضا اور خوشنودی کی خاطر ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے : وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی رضا اور کوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں ﴿وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ﴾۔

ہم بارہا صبر کے معنی کہ جو استقامت کے وسیع مفہوم کا حامل ہے ، کے بارے میں وضاحت کر چکے ہیں ۔ رہا "وجہ ربھم" تو اس کے دو میں سے ایک معنی ہیں ۔

پہلا یہ کہ "وجہ" ایسا مواقع پر "عظمت" کے معمنی میں ہے جیسے کسی اہم نظرے اور رائے کے بارے میں کہا جاتا ہے :﴿ھٰذا وجه الرأی ﴾یعنی یہ اہم رائے ہے ۔

اور یہ شاید اس بناء پر ہے کہ اصل میں "وجہ" کا معنی ہے "چہرہ" اور انسان کا چہرہ ظاہری بدن کا اہم ترین حصہ ہے کیونکہ بینائی ، شنوائی اور گویائی جیسے اہم اعجاز اس میں موجود ہیں ۔

دوسرا یہ کہ "وجہ رب" یہاں "پروردگار کی رضا" کے معنی میں ہے ۔ یعنی وہ لوگ حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں ۔ اس معنی میں "وجہ" استعمال اس بناء پر ہے کہ جب انسان کسی کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے چہرے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے (اس بناء پر "وجہ" یہاں کنایتاً آیا ہے) ۔

بہر صورت یہ جملہ اس مر کے لئے واضح دلیل ہے کہ صبر و شکیبائی بلکہ کلیۃ ہر عمل خیر اسی صورت میں قدر و قیمت رکھتا ہے جب "ابتغاء وجہ اللہ " اور خدا کے لئے ہو اور اگر اس کے کوئی اور اسباب ہوں مثلاً ریا کاری اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنا کہ وہ سمجھیں کہ یہ بڑا صابر اور نیکو کار شخص ہے یا حتیٰ اپنے غرور کے پیش نظر کوئی کام انجام دے تو پھر اس کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں ہے ۔

بعض مفسرین کے بقول کبھی انسان ناگوار حوادث پر صبر کرتا ہے تاکہ لوگ کہیں کہ یہ کس قدر صابر اور صاحبِ استقامت ہے ، کبھی اس خوف سے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ کیسا کم ظرف آدمی ہے، کبھی اس لئے کہ دشمن اسے طعنہ نہ دیں ، کبھی اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ بے تابی اور داد فریاد یہاں فضول ہے کبھی اس لئے کہ لوگوں کے سامنے اپنی

مظلومیت پیش کرے تاکہ لوگ اس کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں ان امور میں سے کوئی بھی نفس انسانی کے کمال کی دلیل نہیں ہے ۔ لیکن جس وق حکم ِ خدا کی اطاعت کی بناء پر اور اس لئے کہ زندگی میں رونما ہونے والے ہر حادثے کی کوئی وجہ ، حکمت اور مصلحت ہوتی ہے کوئی شخص صبر و استقامت سے کام لیتا ہے اور اس طرح وہ اس حادثے کی عظمت کو ختم کردیتا ہے، کفر ان میں زبان نہیں کھولتا اور ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو جزع و فزع کی دلیل بنے تو یہی وہ صبر ہے کہ جس کی طرف آیت بالا میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی صبر " ابتغا وجه الله " شمار ہوتا ہے ۔

ان کا چھٹا طرز عمل یہ ہے کہ " وہ نماز قائم کرتے ہیں " ﴿وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾۔

نماز قائم کرنا اگرچہ عہد الٰہی کے وفا کرنے کے مصادیق میں سے ہے بلکہ خدائی رشتوں کی حفاظت کا ایک زندہ مصداق ہے اور ایک لحاظ سے صبر و استقامت کے مصادق میں سے ہے لیکن ان کلی مفاہیم کے بعض مصادیق بہت اہم ہیں جو انسانی سرنوشت میں بہت زیادہ موثر ہیں لہذا ان کی خصوصی طور پر نشاندہی کی گئی ہے۔

اس سے بڑھ کر اہم کیا بات ہوگی کہ انسان ہر صبح شام خدا سے اپنے رابطے اور تعلق کی تجدید کرے ، اس کے ساتھ راز و نیاز کے لئے کھڑا ہو ، اس کی عظمت اور اپنی ذمہ داریوں کو یاد رکھے اور اس عمل کے ذریعے اپنے قلب و روح سے گناہ کا غبار اور زنگ دھوڈالے اور پانے قطرہ وجود کے ہستی حق کے بیکراں سمندر سے ملحق ہونے کا شرف حاصل کرے ،جی ہاں !نماز میں یہ تمام اثرات وبرکات موجود ہیں ۔

اس کے بعد حق جو افراد کا ساتواں طرز عمل اسی طرح سے بیان کیا گیا ہے :وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہمارے عطا کردہ رزق سے پنہان و آشکار خرچ کرتے ہیں ﴿وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾۔

انفاق اور زکوٰۃ کا مسئلہ صرف اسی آیت میں نماز کے بعد بیان نہیں ہوا بلکہ بہت سی آیات قرآن میں زکوۃ کو نماز کے پہلو میں رکھا گیا ہے کیونکہ ان میں سے ایک چیز انسان کے رشتے کو" خدا " سے مستحکم کرتی ہے اور دوسری "مخلوق " سے تعلق کو۔

یہاں اگر ہم "ممارزقناھم"کی طرف توجہ دیں تو وہ ہر قسم کی عنایت و بخشش کے بارے میں چاہے مال ہو یا علم ،طاقت و حیثیت ہو یا اجتماعی اثر و رسوخ ایسا ہونا ضروری بھی ہے کیونکہ انفاق اور خرچ کرنے کا ایک پہلو نہیں ہو چاہئیے ،بلکہ یہ خرچ تمام پہلوؤں سے اور تمام نعمات سے ہونا چاہئیے۔

"سرا وعلانیۃ" (پنہان اور آشکار) یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے مصارف میں اس حقیقت کی طرف بھی نظر رکھتے ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو وہ زیادہ موثر ہوتا ہے ۔ مثلاً اگر دوسرے کی حیثیت کا تقاضا ہو کہ اسے مخفی رکھا جائے یا انفاق کرنے والا ریا اور دکھاوے سے بچنا چاہتا ہو اور کبھی انفاق آشکار طور پر کیا جائے تو اس کا اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے مثلاً ایسے مواقع پر جبکہ ایسا کرنا دوسروں کی تشویق کا باعث بنے اور انہیں اس عمل کی اقتدا کی ترغیب دے او انفاق کرنے کا ایک عمل ایسے سینکڑوں اور ہزاروں کاموں کا سبب بنے ۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مثبت عمل کی انجام دہی کے لئے قرآن کس قدر باریک بینی سے کام لیتا ہے وہ صرف اصل کام کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ تاکید کرتا ہے کہ اصل عمل بھی خیر ہو اور اس کے انجام پانے کی کیفیت بھی اچھی ہو (ایسے مواقع پر جہاں ایک کام کی انجام دہی مختلف کیفیات سے ممکن ہو) ۔

آخر میں اس کا آٹھواں اور آخری طرز عمل بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ "حسنات" (نیکیوں) کے ذریعے اپنی" سیئات "(برائیوں) کو ختم کردیتے ہیں ﴿وَيَدْرَئُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾ ۔

اس معنی میں کہ وہ ایک گناہ اور لغزش کے ارتکاب پر صرف پشیمان ہونے اور ندامت و استغفار پر قناعت نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر تلافی کے لئے قدم اٹھاتے ہیں اور جس قدر ان کا گناہ اور لغزش زیادہ ہو اسی قدر حسنات اور نیکیاں بھی زیادہ انجام دیتے ہیں تاکہ اپنے اور معاشرے کے وجود سے گناہ کی آلودگی کو حسنات کو پانی سے دھو ڈالیں ۔

"یدرؤن" " درء " (بروزن "زرع") کے مادہ سے دفع کرنے کے معنی میں ہے ۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ برائی کی تلافی برائی کے ذریعے نہیں کررتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کی طرف سے انہیں برائی پہنچے تو اس کے حق میں نیکی انجام دے کر اسے شرمندہ ہونے او تجدید نظر پر آمادہ کریں ۔جیسا کہ سورہ فصلت کی آیہ ۳۵ میں ہے :﴿ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولیّ حمیم﴾

بدی کو اس طریقہ سے اپنے سے دور کر جو زیادہ اچھا ہے کیونکہ اس موقع پر وہ شخص جس کے اور تیرے درمیان عداوت ہے اپنا چہرہ یوں بدل لیتا ہے گویا وہ تیرا مخلص اور پکا دوست ہے ۔

بہر حال اس میں کوئی مانع نہیں کہ زیر بحث آیت دونوں مفاہیم لئے ہوئے ہو۔ احادیث اسلامی میں بھی کچھ احادیث دونوں تفاسیر بیان کرتی ہیں ۔

ایک حدیث پیغمبر اکرم سے منقول ہے ، آپ معاذ بن جبل سے فرماتے ہیں :

فاذا عملت سیئةفاعمل بجنبها حسنة تمحها۔

جب کوئی برا کام کر بیٹھو تو اس کے ساتھ ہی کوئی نیک کام انجام دو جو اسے محو کردے۔

مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عاتب اخاک بالاحسان الیه واردو شره بالانعام علیه۔

اپنے بھائی کو کوئی غلط کام انجام دینے پر نیکی کے ذریعے سرزنش کرو اور اس کے شر کو انعام اور احسان کے ذریعے اس کی طرف پلٹا دو۔[۲]

البتہ ان طرف توجہ رہے کہ یہ ایک اخلاقی حکم ہے جو بعض مواضع سے مخصوص ہے کہ جہاں اس قسم کی طرز عمل موثر ہوتا ہے ورنہ حد جاری کرنا اور بدکاروں کو سزا دینا اسلام کے قوانین میں سے ہیں اور ان تمام افراد کے لئے یکساں طو پر ہے کہ جو اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

مختلف طرز عمل کے بعد "اولو الباب "صاحبان فکر و نظر، طرفداران حق اور ایسے طریقوں پر عمل کرنے والوں کے انجام کا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: دوسرا گھر جو نیک او اچھی عاقبت کا حامل ہے، ان کے لئے ﴿أُوْلَئِکَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾۔[۳]

بعد والی آیت میں اس نیک انجام اور عاقبتِ خیر کی توضیح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کا انجام کا جنت کے دائمی باغات ہیں کہ جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے صالح اور نیک آباؤ و اجداد، ازواج اور اولاد بھی ﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ﴾۔

اور جو چیز ان عظیم اور بے پایاں نعمتوں کی تکمیل کرتی ہے یہ ہے کہ "ہر دروازے سے ان کے ئے فرشتے داخل "﴿وَالْمَلاَئِکَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ کُلِّ بَابٍ﴾۔

اور انہیں کہیں گے "تم پر سلام ہو تمہارے صبر و استقامت کی بناء پر﴿سَلاَمٌ عَلَيْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾۔ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اور شدائد و مصائب برداشت کرنے میں تمہارا صبر و استقامت ہے جو اس اسلامی کا باعث ہوا ہے۔یہاں انتہائی امن، آرام اورچین و سکون سے رہوگے۔یہاں نہ جنگ و جدال ہے،نہ نزاع ہے، نہ سختی،نہ مخالفت ہے اور نہ جھگڑا،ہر جگہ امن ہی امر ہے اور تمام چیزیں تمہارے سامنے تبسم کناں ہیں اور ایسا آرام و سکون جس میں اضطرابِ قلب کا شائبہ تک نہیں وہ یہیں پر ہے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے یہ کیسا اچھا انجام اور کیسی اچھی عاقبت ہے ﴿فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾۔

۱۔صبر صرف اطاعت، مصیبت سے بچنے اور مصیبت کے موقع پر منحصر نہیں ہے بلکہ نعمت کے موقع پر بھی صبر کرنا چاہئیے یعنی وہ انسان کو مغرور اور بے لگام نہ بنادے۔

۲۔نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۵۸۔

۳۔"عقبیٰ" عاقبت اور انجام کار کے معنی میں ہے چاہے اچھا ہویا برا لیکن قرینہ حالیہ اور مقالیہ کی طرف توجہ کی جائے تو مذکورہ آیت میں اس سے مراد عاقبت خیر ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ صرف "صبر" کا ذکر کیوں ہوا ہے؟

" سلام علیکم بماصبرتم " کے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتے اہل جنت یوں سے کہیں گے: "تم پر تمہارے صبر و استقامت کی وجہ سے سلام ہو" حالانکہ مندرجہ بالا آیت میں ان کے آٹھ قسم کے اچھے کاموں اور اہم طرزہائے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس جملے میں آٹھ امور میں سے صرف "صبر" کی نشاندہی ہی کی گئی ہے۔

اس امر کی وجہ حضرت علی کے ایک زندہ اور پر مغز بیان سے سمجھی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالراس من الجسد ولاخیر فی جسد لارأس معه ولافی ایمان لاصبر معه۔

صبر کی ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کی جسم سے ہے۔بدن سے کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اور ایمان بی صبر کے بغیر کوئی وقعت نہیں رکھتا۔(۱)

در حقیقت تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحی پروگراموں کا سہارا صبر و شکیبائی اور استقامت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ان میں سے کچھ بھی انجام نہیں پاسکتا کیونکہ ہر مثبت کام کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں ہوتی ہیں کہ جن پر صبر و استقامت کی قوت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی نہ ایفائے عہد صبر و استقامت کے بغیر ممکن ہے، نہ خدا رشتوں کی حفاظت اس کے بغیر ممکن ہو سکتی ہے، نہ اسکے بغیر خدا اور عدالت ِقیامت کا خوف ہوتا ہے، نہ اس کے بنا قیام نماز ممکن ہے، نہ خدائی نعمتوں میں سے اس کے بغیر کرچ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر حسنات کے ذریعے خطاؤں کی تلافی ہو سکتی ہے۔

۲۔جنت کے دروازے:

آیات قرآن سے بھی اور روایات سے بھی یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جنت کے دروازے ہیں لیکن یہ متعدد دروازے اس بناء پر نہیں ہیں کہ جنت میں داخل ہونے والوں کی تعداد اس قدر ہے کہ اگر وہ ایک ہی دروازے سے داخل ہونا چاہیں تو زحمت ہوگی، نہ ہی اس کی وجہ یہ ہے کہ طبقات میں اختلاف ہے اور جس کی بناء پر ہر گز گروہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دروازے سے آئے، نہ ہی اس کی وجہ راستے کی نزدیکی یا دوری ہے اور نہ ہی دروازوں کی کثرت خوبصورتی زیبائی اور تنوع کا باعث ہے اصولی طور پر جنت کے دروازے دنیا کے دروازوں کی طرح نہیں ہیں کہ وباغات، محلات اور مکانات میں داخل ہونے کے لئے ہوتے ہیں بلکہ یہ دروازے اعمال و کردار کی طرف اشارہ ہیں کہ جو

جنت میں داخل ہونے کا سبب ہوں گے اسی لئے چند ایک احادیث میں ہے کہ جنت کے دروازے کے مختلف نام ہیں ۔ ان میں سے ایک کا نام "باب المجاھدین" (مجاہدین کا دروازہ) ہے اور مجاہدین اسی اسلحہ سے مسلح ہو کر اس دوازے سے جنت میں داخل ہوں گے جس کے ساتھ وہ جہاد کرتے تھے اور فرشتے انہیں "خوش آمدید" کہیں گے۔(۲)

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: اعلموا ان للجنة ثمانية ابواب عرض كل باب منها ميسرةاربعين سبعة

جان لو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں کہ جن میں ہر دروازے کا عرض چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے ۔(۳)

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ ایسے مواقع پر دروازے کا مفہوم ہماری روزمرہ کی گفتگو سے وسیع تر ہے ۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن حکیم میں ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں: لھا سبعة ابواب (حجر ۴۴)

اور روایات کے مطابق جنت کے اس آٹھ دروازے ہیں ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جہنم میں پہنچنے کے راستوں کی نسبت سعادت بہشت جاوداں تک پہنچنے کے راستے زیادہ ہیں اور خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے جیسا کہ دعاء جوشن کبیر کے الفاظ ہیں: یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اس سے بھی زیاادہ جاذب نظر امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں بھی "اولوا الالباب" کے طرزہائے عمل کے بارے میں آٹھ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک دراصل جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور سعادت جاوداں تک پہنچنے کا راستہ ہے ۔

۳۔اہل جنت سے وابستگی رکھنے والے ان سے جاملیں گے:

نہ صرف مندرجہ بالا آیت بلکہ قرآن کی دوسی آیات بھی یہ بات صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ جنت میں اہل بہشت اور ان کے ماں باپ ،بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک اور صالح ہوں گے داخل ہوں گے ۔ یہ درحقیقت ان پر خدائی نعمات کی تکمیل ہے تاکہ وہ وہاں کسی قسم کی کمی محسوس نہ کریں یہاں تک کہ جن افراد سے ان کا لگاؤ ہے ان کی جدائی بھی نہ ہو۔ نیز چونکہ اس دار آخرت میں کہ جو نیا اور کامل گھر ہے ہر چیز تازہ اور نئی ہوتی ہوجاتی ہے لہٰذا وہ لوگ بھی تازہ اور نئے چہروں کے ساتھ اور زیادہ خلوص و محبت کے ساتھ وہاں داخل ہوں گے ، ایسی مہر و محبت کو جو نعماتِ بہشت کی قدر و قیمت کئی گناہ کردے گی۔

مندرجہ بالاآیت میں اگرچہ صرف ماں باپ ، اولاد اور ازواج کا ذکر ہے لیکن درحقیقت وہاں تمام وابستگان اکھٹے ہوں گے کیونکہ اولاد اور ماں باپ (یا باپ داد) کی موجودگی بہن بھائیوں کے بغیر بلکہ دیگر وابستگان کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ تھوڑا سا غور وخوض کیا جائے تو یہ مطلب واضح ہوجاتا ہے کیونکہ نیک باپ جنتی ہے لہٰذا اسکے تمام بیٹے اس سے آملیں گے ۔ اس طرح بھائی آپس میں مل جائیں گے اور اسی طرح دیگر وابستگان اور عزیز و اقارب اکھٹے ہوجائیں گے (کیجئے گا) ۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اہل جنت اہل بہشت کے لئے ابدی اور جاودانی گھر ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سورہ توبہ کی آیہ ۷۲ کے ذیل میں کہا جاتا ہے ، قرآن کی چند ایک آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناتِ عدن میں ایک مخصوص مقام ہے جو جنت کے دیگر باغات سے امتیاز رکھتا ہے اور اس میں صرف تین طرح کے لوگ رہیں گے انبیاء مرسلین صدقین (یعنی انبیاء کے خاص دوست احباب) اور شہدا۔(۴)

۴۔ گناہ کے آثار دھلنا :

اجمالی طور پر "حسنات" اور "سیئات" ایک دوسرے پر متقابل اثر رکھتے ہیں اور اسمیں کوئی شک و شبہ نہیں ہے ۔ حتی کہ ہم اس چیز کے نمونے اپنی روزمرہ زندگی میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان سالہا سال زحمت اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ محنت و مشقت کرکے سرمایہ جمع کرتا ہے لیکن نا سمجھی، ہو و ہوس کی پیروی یا بے پرواہی سے اسے گنوا بیٹھتا ہے یہ بالکل مادی حسنات کو گنوا بیٹھنے کے اور کچھ نہیں ہے جسے قرآن میں " حبط" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس کے بر عکس کبھی انسان بہت سی غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے اور ان کے باعث سنگین خسارے کے بوجھ تلے دب جاتا ہے لیکن ایک عقلمندانہ عمل سے یا عاشقانہ جہاد کے ذریعے ان سب نقصانات کی تلافی کردیتا ہے ۔ مثلاًہمارے زمانے کے اسی اسلامی انقلاب میں ہم نے بہت سے افراد دیکھے ہیں کہ وہ سابق ظالم و جابر نظام میں بہت سے گناہوں کے مرتکب ہوئے تھے اور اسی وجہ سے وہ جیل میں تھے لیکن جب ملک کے دشمنوں کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس وقت ان کی فوجی مہارت کی بناء پر انہیں میدانِ جنگ میں آنے کی دعوت دی گئی ۔ انہوں نے بی بے نظیر شجاعت و فداکاری سے پیکر دشمن پر مہلک ضربیں لگائیں ۔

اس دوران ان میں سے بعض شہید ہو گئے اور بعض زندہ ہیں ۔ دونوں صورتوں میں انہون نے اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کرلی ۔

زیر بحث آیات کہ جن میں فرمایا گیا ہے :ویدرءون بالحسنة السیئة

اہل ایمان عقلاء اور ارباب ِفکر و نظر اپنی برائیوں کو نیکیوں کے ذریعے دور کرتے ہیں ۔

یہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غیر معصوم انسان کبھی نہ کبھی غلطیوں اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے بعد وہ ان کی تلافی کی فکر میں رہے نہ صرف گناہ کے اجتماعی آثار جو اپنے اعمال ِخیر کے ساتھ دھوڈالے بلکہ وہ ظلمت ِگناہ جو انسان کے قلب و روح پر جاپڑتی ہے اسے بھی "حسنات" کے ذریعے دور کرے اور اسے فطری نورانیت اور شفافیت کی طرف پلٹا ئے ۔ قرآن کی زبان میں اس کام کو "تکفیر" (ڈھانپنا) اور پاک کرنا کہتے ہیں (اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۶۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں) ۔

البتہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں ہوسکتا ہے " ویدرءون بالحسنة" ایک اوراہم اخلاقی فضیلت کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ " اولوالالباب " دوسروں کی برائی کا برائی سے جواب نہیں دیتے اور انتقام لینے کی بجائے نیکی اور اچھائی کرتے ہیں تاکہ دوسرا خود شرمندہ ہو جائے ، پاکیزگی کی طرف پلٹ آئے اور اپنی اصلاح کرلے ۔

۱۔ جنات ِعدن کیا ہے ؟ جنات "کا معنی ہے "باغات " اور "عدن "کا معنی ہے " طولانی توقفِ " اوریہاں ابدیت اور ہمیشگی کے معنی میں ہے اور یہ جو " معدن "(کان) کو " معدن " کہتے ہیں وہ بھی اس جگہ کسی مواد کے طولانی توقف کی بناء پر ہے ۔

۲۔ منھاج البراعۃفی شرح نہج البلاغہ جلد ۳ ص ۹۹۵۔

۳۔ خصال صدوق ابواب ثمانیہ۔

۴۔ مزید وضاحت کے لئے جلد ۸ (اردو ترجمہ کی طرف رجوع فرمائیں ۔

آیات ۲۵،۲۶

۲۵۔﴿وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِی الْأَرْضِ أُوْلَئِکَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾۔

۲۶۔﴿اللهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِی الْآخِرَةِ إِلاَّ مَتَاعٌ﴾۔

ترجمہ

۲۵۔ اور وہ کہ جو عہد الٰہی کو مستحکم ہونے کے بعد توڑدیتے ہیں اور ان رشتوں کو قطع کردیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور روئے میں میں دفساد کرتے ہیں ان کے لئے لعنت اور آخرت کے گھر کی بدی (اور سزا) ہے۔

۲۶۔ خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے (مستحق سمجھتا ہے) تنگ کردیتا ہے لیکن وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہوگئے ہیں جب کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا وی زندگی متاعِ ناچیز ہے ۔

دنیا پرست تباہ کار

چونکہ نیک و بد ہمیشہ ایک دوسرے سے موازنہ کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں لہٰذا ”اوالالباب“ اور حق پرست افراد کہ جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے کہ صفات بیان کرنے کے بعد محل بحث آیات کے کچھ حصوں میں مفسدین اور وہ کہ جو واقعی اپنی عقل و کفر گنوا بیٹھے ہیں کی چند بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں ۔ارشاد ہوتاہے : اور وہ کہ جو عہد خدا وندی کو محکم کرنے کے بعد توڑدیتے ہیں اور ان رشتوں کو منقطع کردیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور روئے زمیں میں فساد برپا کرتے ہیں ان پر لعنت ہے اور دار آخرت کا عذاب ان کے لئے مخصوص ہے ﴿وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِی الْأَرْضِ أُوْلَئِکَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴾۔

درحقیقت ان کے تمام اعتقادی و عملی مفاسد کا خلاصہ مذکورہ تین عہد وپیمان میں بیان کردیا گیا ہے :۔

(۱) خدائی عہد وپیمان کو توڑنا جس میں فطری ، عقلی اور شرعی عہد وپیمان شامل ہیں ۔

(۲)روابط اور رشتوں کو منقطع کرنا ۔ خدا سے رابطہ ، خدائی رہبروں سے رابطہ ، مخلوق سے رابطہ اور اپنے آپ سے رابطہ ۔

(۳) آخری حصہ کہ جو پہلے دو حصوں کا نتیجہ ہے روئے زمیں میں فساد کرنا۔

جو شخص پیمان الٰہی توڑتا ہے اور ہر طرف سے رشتوں کو منقطع کردیتا ہے کیا وہ فتنہ فساد کے علاوہ کوئی کام انجام دے سکتا ہے، یہ کاوشیں ان لوگوں کی جانب سے مادی مقاصد کے لئے حتی کہ خیالی مقاصد کے لئے کی جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں وہ کسی بلند مقصد کے قریب ہونے کی بجائے دو ہو جاتے ہیں کیونکہ "لعنت" رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے۔ (۱)

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں "دار" گھر اور سرائے) بصورت مطلق آیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی گھر آخرت والا گھر ہی ہے کیونکہ دوسرا ہر گھر آخر کار خلل پذیر ہو گا اور ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

بعد والی آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے: خدا جسے چاہتا ہے وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کردیتا ہے ﴿اللهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ دنیا سمیٹنے کے لئے روئے زمین پر فساد کرتے ہیں وہ خدائی رشتوں کو توڑتے ہیں اور خدا کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہیں تاکہ مادی زندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکیں لیکن وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ رزق اور اس میں کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

علاوہ ازیں یہ جملہ ایک سوال کا جواب بھی ہوسکتا جو آیت میں صراحت سے نہیں آیا اور وہ یہ کہ گزشتہ آیات میں حق و باطل کے طرفدار دو گروہوں کے ذکر کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے رزق اور نعمات سے کس طرح نوازتا ہے تو آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بہت صورت یہ روزی جلد گزرجانے والی متاع ہے جب کہ وہ چیز جسے اہمیت دی جا نا چاہئیے وہ آخرت کا گھر او رابدی سعادت ہے

تاہم اس کے بارے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ رزق کے لئے " مشیت ِالٰہی " یہ خدا نہیں کہ بغیر حساب کے اور اسباب سے فائدہ اٹھائے بغیر کسی کو رزق فراوان دے دے یا اس کی روزی کو کم کردے بلکہ اس کی مشیت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اسے اس عالم کے اسباب کے اندر تلاش کرے کیونکہ: " ابی اللہ این یجری الامور الاباسبابھا "یعنی خدا چاہتا ہے کہ تمام امور اسباب کے ساتھ ہی روپذیر ہوں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: عہد شکن اور فساد فی الارض کرنے والے دنیاوی زندگی پر ہی خوش ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیا وی زندگی متاعِ ناچیز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ﴿وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلاَّ مَتَاعٌ﴾۔

نکرہ کی صورت میں "متاع" کا ذکر اس کا حقیر ہونا ظاہر کرنے کے لئے ۔ جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں :

فلاں موضوع "متاعی" بیش نیست

فلاں چیز "ایک متاع " سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ۔

یعنی بے وقعت متاع ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ مفسد فی الارض "کون ہے ؟

"فساد" کہ جو "اصلاح " (درستی) کا متضاد ہے ہر قسم کی تخریب کاری اور تباہ کاری کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے ۔

راغب نے مفردات میں کہا ہے :

الفساد خروج الشیء عن الاعتدال قلیلا کان اوکثیراً و یضاد ھ الصلاح، و یستعمل ذٰلک فی النفس و البدن و الاشیاء الخارجه عن الاستقامة۔

چیزیں حالتِ اعتدال سے کس طرح بھی خارج ہوجائیں ، کم یا زیادہ، اسے فساد کہتے ہیں ۔ اس کا متضاد "صلاح " ہے ۔ یہ جان و بدن اور ان تمام خرابیاں جو مختلف کاموں میں پیدا ہوتی ہیں اور تمام انفرادی یا اجتماعی مسائل میں ہر قسم کا افراط اور تفریط "فساد" کا مصداق ہیں ۔قرآن مجید میں بھی بہت سے مواقع پر "فساد" اور "صلاح " ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں ۔ سورہ شعراء کی آیت ۱۵۲ میں ہے :﴿الذین یفسدون فی الارض ولایصلحون﴾

وہ لوگ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے ۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں ہے :﴿و اللہ یعلم المفسدین من المصلح﴾

خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے ۔

سورہ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں ہے :﴿واصلح ولاتتبع سبیل المفسدین ﴾ اصلاح کرو اور مفسدین کی راہ کی پیروی نہ کرو۔

بعض مواقع پر ایمان اور عمل صالح کو فساد کے مقابلہ میں قرار دیا گیا ہے :

﴿ام نجعل الذین اٰمنوا و عملو الصالحات کالمفسدین فی الارض﴾

کیاہم ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجالانے والوں کو مفسدینِ فی الارض کی طرح قرار دیں ۔ (ص۔۲۸)

دوسری طرف بہت سی آیاتِ قرآن میں لفظ "فساد" کو "فی الارض" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جو نشاندہی کرتا ہے کہ مسئلے کے اجتماعی پہلوؤں پر نگاہ ہے۔ یہ تعبیر قرآن میں بیس سے زیادہ مواقع پر دکھائی دیتی ہے۔

تیسری طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں "فساد" افساد" ایسے گناہوں کے ساتھ آیا ہے جو شاید زیادہ تر مصداق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض گناہ بہت بڑے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں۔ کبھی تو خدا اور رسول خدا اور رسول سے جنگ کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے، مثلاً: انما جزاؤا الذین یحاربون اللہ و رسول لہ و یسعون فی الارض فساد اً

ان لوگوں کی جزاء کے جو اللہ اور اس کے رسول سے جنت کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے در پے ہیں (مائدہ ۔۳۳) کبھی نسال اور زراعت کو تباہ کرنے کے پلہ قرار پایا ہے، مثلاً

﴿و اذا تولیّ سعیٰ فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث و النسل﴾

اور جہاں منھ پھیرا تو ادھر دوڑ دھوپ کرنے لگا تاکہ زمین میں فساد پھیلائے اور زراعت اور نسل کا ستیاناس کردے ۔ (بقرہ ۔ ۲۰۵)

کبھی اس کا ذکر ان رشتوں کو منقطع کرنے کے ساتھ آیا ہے جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے، مثلاً:

﴿الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض﴾

وہ لوگ کہ جو اس سے یثاق باندھنے کے بعد عہد الٰہی کو توڑدیتے ہیں اور جن رشتوں کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کردیتے ہیں اور اور زمین میں فساد کرتے ہیں ۔ (بقرہ ۔۲۷)

کبھی اسے بڑا بننے کی خواہش اور سرکشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً

﴿تلک الدار الاٰخرہ نجعلھا للذین لایریدون علواً فی الارض و لا فساداً﴾

یہ آخرت کا گھر ہے جو ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو زمین پر بڑا ہونے کی خواہش اور فساد برپا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ۔ (قصص ۔ ۸۳)

کبھی قرآن "فرعون" کو مفسد گردانتا ہے اور دریائے نیل میں غرق ہوتے ہیں وقت اسکے توبہ کرنے کے متعلق کہتا ہے: ﴿الاٰ و قد عصیت قبل وکنت من المفسدین﴾

اب ایمان لاتا ہے حالانکہ پہلے تونے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا ۔ (یونس ۔ ۹۱)

کبھی یہی لفظ "فساد فی الارض" چوری کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق ہے کہ انہوں نے چوری کی تہمت لگنے کے بعد کہا:﴿تاللہ لقد علمتم ماجئنا لنفسد فی الارض وما کنا سارقین﴾

بخدا تم جانتے ہو کہ ہم سرزمین مصر میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم کبھی بی چور نہ تھے۔(یوسف۔۷۳)

کبھی یہ لفظ کم فروشی کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے،جیسا کہ حضرت شعیب علیہ اسلام کے واقعے میں ہے کہ وہ اپنی قوم سے کہتے ہیں:﴿ولا تبخسو ااالناس اشیاء ھم ولا تعثو ا فی الارض مفسدین﴾

کم فروشی نہ کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ (ہود۔۸۵)

اور کبھی نظامِ عالم ہستی اور جہان خلقت کو خراب اور تباہ کرنے کے معنی میں آیا ہے:لو کان فیھما الٰھة الاالہ لفسد تا

اگر زمین و آسمان مین اللہ کہ جو خدائے یگانہ ہے کہ علاوہ اور خدا ہوتے تو یہ فاسد،خراب اور جرباد ہو جاتے۔(انبیاء۔۲۲)

ان تمام آیات سے کہ جو قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہیں اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ "فساد"بطور کلی "یا"فساد فی الارض"ایک بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے۔اس کے مفہوم میں بڑے بڑے جرائم مثلاً فرعون اور دوسرے آمروں کے جرائم اور ان سے کم تر کام یہاں تک کہ کم فروشی اور لین دین میں دھوکا بازی جیسے گناہ بھی شامل ہیں۔فساد کے وسیع مفہوم یعنی حد اعتدال سے ہر قسم کا اخراج،کی طرف توجہ رکھی جائے تو یہ وسعت پوری طرح قابل فہم ہے۔نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عذاب اور سزاؤں کو میزان جرم کے مطابق ہونا چاہیئے:واضح ہوتا ہے کہ ان "مفسدین" میں سے ہر گروہ کو ایک الگ سزا ملنا چاہئیے اور سب کے لئے ایک جیسی سزا نہیں ہے۔یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی آیہ ۳۳ کہ جسمیں "مفسد فی الارض "کا ذکر " خدا اور رسول کے محارب" کے ساتھ آیا ہے، ان کے لئے چار قسم کی سزائیں ہیں۔یقینا حاکم شرع کے ذمہ ہے کہ وہ ان چار سزاؤں (قتل کرنا، سولی پر لٹکانا ، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور جلا وطن کرنا) میں سے جرم کی مقدار کے مطابق ایک سزا منتخب کرے ، ہمارے فقہا نے فقہی کتب میں محارب اور مفسد فی الارض کی بحث میں ان سزاؤں کی شرائط اور حدود و تفصیل سے بیان کی ہیں۔ ۲

ایسے مفاسد کی بیخ کنی کے لئے ہر موقع پر کسی ذریعے سے متمسک ہونا پڑے گا ۔ کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلا مرحلہ یعنی پندو نصیحت اور تذکر ہی کافی ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا وقت آجاتا ہے کہ شدت عمل کے آخری درجہ یعنی جنگ کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے ۔

ضمناً فساد فی الارخ کی تعبیر ہمیں انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک حقیقت کی طرف راہنمائیکرتی ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی مفاسد عام طور کسی خاص مقام سے تعلق نہیں رکھتے اور انہیں کسی ایک علاقے میں محصور نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی وسعت پورے معاشرے اور پوری زمین تک ہوتی ہے اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف سرایت کرتے ہیں ۔

آیات ِ قرآنی سے یہ نکتہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعثت ِ انبیاء کے عظیم مقاصد سے ایک " وسیع مفہوم میں " زمین سے فساد ختم کرنا ہے ۔ جیسا کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت شیعب علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ وہ اپنی سرکش قوم کے فساد کے مقابلے میں کہتے ہیں :﴿ان ارید الا الاصلاح ما استطعت﴾

میرا ہدف صرف یہ ہے کہ جتنا استطاعت میں ہے فساد کے خلاف جنگ کروں اور اصلاح کروں ۔ (ہود۔۸۸)

۲۔ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن:

مندرجہ بالاآیات ہی نہیں جو کہتی ہیں کہ روزی کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے واضح طور پریہی مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ خدا جس شخص کی چاہتا ہے روزی وسیع کردیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے کم کردیتا ہے لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جو بعض جاہل لوگ خیال کرتے ہیں کہ کوشش و کارکردگی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئیے اور گوشہ نشین ہوجانا چاہئیے تاکہ جو کچھ مقدر میں ہے خدا دے دے ۔ ان لوگوں کی منفی سوچ مذاہب کو افیون قراردینے والوں کے لئے بڑی اہم سند ہے ۔

یہ لوگ دو بنیادی نکتوں سے غافل ہیں :

پہلا یہ کہ خدا کا چاہنا اور اس کی مشیت و ارادہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہوا ہے وہ کوئی من پسند اور بغیر کسی کلیہ قاعدہ والا معاملہ نہیں بلکہ اسی طرح ہے جس طرح ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ خدا کی مشیت و ارادہ اس کی حکمت سے جدا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ لیاقت اور اہلیت پر موقوف ہے ۔

دوسرا یہ کہ یہ مسئلہ عالم اسباب کی نفی میں نہیں ہے کیونکہ عالم ِاسباب یعنی جہان تکوینی بھی اس کی مشیت ِتکوینی ہے اور وہ کبھی بھی اس مشیت تشریعی سے جدا نہیں ہوئی ۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رزق کی وسعت و تنگی کے بارے میں خدا کا ارادہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے کہ جو انسانوں کی زندگی پ رحکم فرماہیں ۔ کوشش، ہمت اور اخلاص اور اس کے بر عکس سستی، تن آسانی، بخل اور زینوں کی آلودگی اس میں نتیجہ خیز اثر رکھتی ہے ۔ اسی بناء پر قرآن مجید نے بارہا انسان کو اس کی سعی و کوشش او رجہد و فعالیت کا مرہونِ منت شمار کیا ہے اور زندگی میں اس کے حصہ کو سعی و کوشش کی میزان پر تَولا ہے ۔ اسی لئے وسائل الشیعہ کی کتابِ تجارت میں ایک باب حصولِ رزق کے لئے کوشش سے متعلق ہے نیز کچھ ابواب بیکاری، زیادہ سونے اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں سستی کی مذمت کے بارے میں بھی ہیں ۔

ان ابواب میں منقول احادیث میں سے ایک حدیث جو امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے، میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الاشیاء لما ازدوجت ازدوج الکسل و العجز فنتجابینھما الفقر

جب شروع شروع میں موجودات نے ایک دوسرے سے ازدواج کیا تو سستی اور عجز ناتوانی نے آپس میں شادی رچائی اور ان سے جو بچہ پیدا ہوا وہ "فقر" تھا ۔(۳)

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: لاتکسلوافی طلب معایشکم فان اٰبائنا کانوا یرکضون فیھا ویطلبونھا

حصول رزق میں ضرورتِ زندگی مہیا کرنے میں سستی سے کام نہ لو کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد ان کے حصول میں دوڑا کرتے تھے اور ان کے لئے تلاش و جستجو کرتے تھے ۔ (۴)

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

انی لابغض الرجل ان یکون کسلاناً عن امر دنیاہ، ومن کسل عن امر دنیاہ فھو عن امر اٰخرتہ اکسل ۔

میں ایسے شخص سے ناراض ہوں جو اپنے کارِ دنیا میں سست ہو کہ کیونکہ جو کارِ دنیا میں سست ہے (اگر چہ وہ اس کا نتیجہ جلد بھگتے گا تاہم) وہ آخرت کے معاملے میں زیادہ سست ہو گا ۔(۵)

نیز امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا: ان اللہ تعالیٰ لیبغض العبد النوّام ، ان اللہ لیبغض العبد الفارغ

یقینا خدا تعالیٰ زیادہ سونے والے اور بیکار شخص سے ناراض ہے ۔ (۶)

۱۔ راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے: " اس طرح سے دور کرنے کے معنی میں ہے جس میں غصہ ملا ہوا، جب آخرت میں خدا کی طرف اس لفظ کی اضافت ہو تو سزا کے معنی میں ہے اور دنیا میں رحمت منقطع ہونے کے معنی میں ہے اور اگر لوگوں کی طرف سے ہو تو پھر نفرین کے معنی میں ہے ۔

۲۔ ہم نے بھی سورہ مائدہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں (جلد ۴ پر) اس سلسلے میں ضروری وضاحت کی ہے (اردو ترجمہ دیکھئے) ۔

۳۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ۔ ص۳۸۔

۴۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ۔ ص۳۸۔

۵۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ۔ ص۳۷۔

۶۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ۔ ص۳۷۔

آیات ۲۷،۲۸،۲۹

۲۷۔﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلاَأُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِی إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ﴾۔

۲۸۔﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ أَلاَبِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾۔

۲۹۔﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ﴾۔

ترجمہ

۲۷۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے آیت (اور معجزہ) کیوں نازل نہیں ہوتا۔ کہہ دو: خدا جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرتا ہے اور جو شکس اس کی طرف پلٹ آتا ہے اسے ہدایت کرتا ہے (معجزے کی کمی نہیں ان کی ہٹ دھرمی رکاوٹ کا باعث ہے)۔

۲۸۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن (اور پر سکون) ہیں یادرکھو کہ یا د خدا سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

۲۹۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئیے پاکیزہ ترین (زندگی) اور بہترین انجام ان کا نصیب ہے۔

یادالٰہی باعث ِ تسکین دل ہے

اس سورت میں چونکہ توحید، معاد اور رسالت ِپیغمبر کے بارے میں بہت سی مباحث ہیں لہذا زیر بحث پہلی آیت دوبارہ پیغمبر اسلام کی دعوت کے مسئلے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس میں ہٹ دھرم منکرین کا ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کافرین کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر معجزہ نازل کیوں نہیں ہوتا﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلاَأُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ﴾)۔

لفظ "یقول" فعل مضارع ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بار بار اعتراض کرتے تھے اور باوجودیکہ انہوں نے رسول اللہ سے بارہا معجزات دیکھتے تھے (اور ہر پیغمبر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقانیت کے ثبوت میں کچھ معجزات پیش کرے) پھر بھی وہ بہانے تراشتے تھے اور گزشتہ معجزات کو نظر انداز کردیتے تھے اور اپنی من پسند کے نئے معجزے کا تقاضا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اور تمام ہٹ دھرم منکرین ہمیشہ اپنی مرضی کے معجزات ڈھونڈتے رہتے تھے کہ پیغمبر اور توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر ایک جادوگر کی طرح کہیں بیٹھ جائیں اور ان میں سے ہر کوئی جائے اور جو معجزہ

طلب کرے وہ فوراً پیش کردیں اور اگر پھر بھی یہ نہ چاہیں تو ایمان نہ لائیں ۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پہلے درجے میں انبیاء کی ذمہ داری ہے کہ تبلیغ، تعلیم اور تنبیہ کا ذریعہ اختیار کریں ۔ معجزات تو استثنائی امور ہیں کہ جس حسبِ ضرورت وہ بھی حکم خدا سے (نہ پیغمبر کی خواہش کے مطابق) انجام پاتے ہیں لیکن ہم بارہا آیاتِ قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ دشمنوں کے کئی گروہ اس حقیقت کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ انبیاء کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں اور اس قسم کی فرمائشیں کرتے رہے ہیں ۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے : اے پیغمبر ا ان سے کہہ دو خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف لوٹے اسے ہدایت کرتا ہے ﴿قُلْ إِنَّ اللهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِى إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ﴾ ۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے لئے معجزے کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں کیونکہ پیغمبر نے کافی مقدار میں معجزات دکھائے ہیں کمی خود تمہارے وجود اندر رہے ۔ ہٹ دھرمیاں ، تعصبات، جہالتیں وہ گناہ کہ جو توفیق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تمہارے ایمان لانے میں حائل ہیں لہٰذا خدا کی طرف لوٹ آؤ، توبہ رو، جہالت و غرور اور خود خواہی کے پردے اپنی نگاہِ فکر سے ہٹاؤ تاکہ واضح طور پر جمالِ حق کا مشاہدہ کر سکو، کیونکہ :

جمال یار ندارو نقاب و پردہ ولی غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

جمالِ دوست پر تو کوئی نقاب نہیں ہے لیکن راستے کا غبار ہٹا دو تاکہ میں اسے دیکھ سکوں ۔

بعد والی آیت میں " من اناب" (جو خدا کی طرف پلٹ آئے ہیں) کی بہت عمدہ تفسیر بیان ہوئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل ذکر الٰہی سے مطمئن اور پر سکون ہیں ﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ ﴾ ۔

اس کے بعد ایک دائمی وسیع اصول کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے : آگاہ ہو کہ یاد الٰہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور قرار پاتے ہیں ﴿أَلاَبِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ ۔

زیر بحث آخری آیت میں اہل ایمان کا انجام کار بیان کرکے گزشتہ آیت کا مضمون یوں مکمل کیا گیا ہے : وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور رانہوں نے صالح اعمال انجام دئیے ان کے لئے بہترین زندگی ہے اور ران کا انجام کار بہترین ہوگا ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآب﴾ ۔

بہت سے بزرگ مفسرین نے لفظ " طوبیٰ" کو " اطیب" کا مونث سمجھا ہے جس کا مفہوم ہے بہتر، پاکیزہ تر یا بہترین اور پاکیزہ ترین۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اس لفظ کا مفہوم ہر لحاظ سے وسیع اور غیر محدود ہوگا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "طوبیٰ لھم" کے ذریعے ان کے لئے تمام سعادتوں اور پاکیزگیوں کی پیش بینی کی گئی ہے۔ ان کے لئے تمام چیزوں میں سے بہترین مہیا ہوں گی۔

بہترین زندگی، بہترین نعمتیں، بہترین آرام او رسکوں، بہترین دوست و احباب اور پروردگار کی بہترین اور خاص مہر بانیاں یہ سب کی سب ایمان اور عمل صالح کی مرہونِ منت ہیں اور یہ ان کے لئے اجر ہے جو عقیدے کے لحاظ سے محکم اور عمل کے لحاظ سے پاک، فعال، درست کار اور خدمت گزار ہیں۔

لہٰذا اس لفظ کی مختلف مفسرین کی طرف جو مختلف تفسیریں ہوئی ہیں وہ سب اس کی مصداق ہیں۔ یہاں تک کہ مجمع البیان میں اس کے دس معانی ذکر ہوئے ہیں جو حقیقت میں اس کے وسیع معنی کے مختلف مصادیق ہیں۔

کئی ایک روایات میں بھی ہے کہ " طوبیٰ" ایک درخت ہے جس کی جڑیں جنت میں رسول اللہ یا حضرت علی کے گھر میں ہیں اور اس کی شاخیں ہر جگہ تمام مومنین اور ان کے گھروں پر سایہ فگن ہیں۔ ہوسکتا یہ روایات ان عظیم پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کے درمیان ان کے مقامِ رہبری اور نہ ٹوٹنے والے رشتوں کی تصویر کشی کرتی ہوں جن کا نتیجہ ایسی طرح طرح کی نعمات ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں لفظ " طوبیٰ" مونث کے طور پر آیا ہے اور "اطیب" نہیں آیا کہ جو مذکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حیات یا نعمت کی صفت ہے اور یہ دونوں الفاظ مونث ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ یاد الہٰی سے دل کو کیسے سکون ملتا ہے؟

انسانوں کی زندگی میں اضطراب اور پریشانی ہمیشہ سے ایک بڑی مصیبت کے طور پر موجود ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات پوری طرح محسوس ہوتے ہیں۔ سکون و قرار ہمیشہ سے انسان کی زندگی کی ایک قیمتی گمشدہ چیز رہی ہے۔ اس کی تلاش میں انسان ہر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اگر ہم پوری تاریخ بشر میں صحیح یا غلط طریقے سے کی گئی ان کوششوں کا ذکر کریں کہ جو سکون قرار حاصل کرنے کے لئے کی گئیں تو بہت ہی ضخیم کتاب بن جائے۔ بعض ماہرین اور

علماء کہتے ہیں کہ بعض ہمہ گیر بیماریاں جب پھیلتی ہیں اور وباء کی صورت اختیار کرلیتی ہیں تو جو افراد ظاہراً اس وبائی بیماری کی وجہ سے مرتے ہیں ان میں سے اکثر خوف اور پریشانی کی وجہ سے دم توڑ دیتے تھوڑے ہی افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقیقتاً اس بیماری میں بتلا ہو کر ختم ہوتے ہیں۔

اصولی طور پر سکون و پریشانی فرد اور معاشرے کی سلامتی و بیماری اور سعادت و بد بختی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے آسانی سے گزر جایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بہت سی کتابیں پریشانی اور اضطرابِ قلب پر قابو پانے اور آرام و سکون حاصل کرنے کے طریقوں پر لکھی گئی ہیں۔

تاریخ بشر ایسے غم انگیز مناظر سے بھری پڑی ہے کہ انسان نے تلاش سکون میں ہر چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وادی وادی پھرا اور طرح طرح کی عادتیں اپنائیں۔

لیکن قرآن نے ایک مختصر اور پر مغز جملے میں انتہائی اطمینان کے لئے نزدیک ترین راستے کی نشاندہی کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ یادِ خدا دلوں کے لئے آرام بخش اور باعثِ سکون ہے۔

اس قرآنی حقیقت کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل توضیح کی طرف توجہ کیجئے:۔

پریشانی اور اضطراب کے عوامل

۱۔اضطراب و پریشانی کبھی تاریک اور مبہم مستقبل کی فکر کی بناء پر ہوتی ہے۔ نعمتوں کا زوال، دشمن کے چنگل میں گرفتاری، ضعف کمزوری، بیماری، ناتوانی، درماندگی اور حاجتمندی کا احتمال یہ سب چیزیں انسان کو پریشان کردیتی ہیں لیکن قادر و متعال اور رحیم و مہربان خدا پر ایمان وہ خدا کہ جو ہمیشہ سے اپنے بندوں کی کفالت اپنے ذمہ لئے ہوئے ہے۔ ایسی پریشانیوں کو دور کرسکتا ہے اور اسے سکون دے سکتا ہے۔ اس کی یاد یہ حوصلہ دے سکتی ہے کہ آنے والے حوادث کے مقابلے میں تو درماندہ اور بے یار و مددگار نہیں ہے تو توانا، قادر اور مہربان خدا رکھتا ہے۔

۲۔ کبھی ماضی کی تاریک زندگی فکرِ انسانی کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور ہمیشہ اسے پریشان کئے رہتی ہے ان گناہوں پر پریشانی کہ جو اس نے انجام دئے ہیں اور وہ کوتاہیاں اور لغزشیں جو اس سے سرزد ہوئی ہیں اسے ستاتی رہتی ہیں لیکن اس طرف توجہ کہ خدا غفار، توبہ قبول کرنے والا، رحیم اور غفور ہے، اسے سکون دیتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ اس کی بارگاہ میں تقصیر و کوتاہی پر معذرت چاہو، گزشتہ گناہوں پر عذر خواہی کرو اور ان کی تلافی کی کوشش کرو کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور تلافی ممکن ہے۔

۳۔ کبھی طبعی اور مادی عوامل کے مقابلے میں انسان کی کمزوری وناتوانی اور کبھی داخلی و خارجی دشمنوں کی کثرت اسے پریشان کردیتی ہے کہ میں طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں میدانِ جہاد میں کیا کروں یا ان سے دیگر مقابلوں میں میں کیا کرسکتا ہوں لیکن جب وہ خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کی قدرت و رحمت پر بھروسہ کرتا ہے وہ قدرت جو تمام طاقتوں سے برتر ہے اور کوئی اس کے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا تو اسکے دل کو سکون آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے: وہاں! میں اکیلا نہیں ہوں، خدا کے سائے میں میری طاقت لامتناہی ہے۔

جنگوں میں مجاہدین راہ خدا کا جذبہ گزشتہ زمانہ ہویا موجودہ ان کی تعجب انگیز اور خیرہ کن جنگیں یہاں تک کہ ان مواقع پر بھی جب وہ یک و تنہا ہوتے ہیں ان سے وہ سکون و اطمینان واضح ہوتا ہے کہ جو صرف سایہ ایمان میں پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں یاکان سے سنتے ہیں کہ ایک افسرِ رشید خیرکن معرکے میں اپنی بینائی بالکل کھوبیٹھتا ہے اور وہ مجروح بدن کے ساتھ ہسپتال میں چارپائی پرپڑا ہوتا ہے لیکن ایسے سکونِ دل اورا طمینان قلب سے گفتگو کررہا ہوتا ہے گویا اس کے بدن پر کوئی خراش تک نہیں آئی اس سے ہم ذکر، خدا کے زیر سایہ پر اعجاز سکون کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔(۱)

۴۔ کبھی انسان کی تکلیف دہ پریشانیوں کی بنیادزندگی کے لئے بے مقصد ہونے کا حساس ہوتا ہے لیکن جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور زندگی میں تکامل وکمال حاصل کرنے کو ایک عظیم مقصد کے طور پر اپنائے ہوئے ہے اور زندگی کے تمام امور و حوادث کو اسی مقصد کو روشنی میں دیکھتا ہے اسے نہ زندگی کے بے کار ہونے کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بے ہدف اور ٹھکرائے ہوئے افراد کی طرح مضطرب و سرگرداں ہوتا ہے۔

۵۔ پریشانی کا ایک اور عامل یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایک ہدف تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن اسے کوئی ایسا فردنظر نہیں آتا جو اسی زحمت و مشقت کا قدردان ہو۔ یہ ناقدری اسے شدید دکھ دیتی ہے اور اسے ایک عالم اضطراب و پریشانی میں غرق کردیتی ہے لیکن جب وہ احساس کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کی تمام مساعی اور کاوشوں سے آگاہ ہے، وہاں سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور وہ ان سب پر اجر و ثواب دے گا تو پھر وہ کیوں پریشان اور بے چین ہوگا۔

۶۔ بدگمانیاں، توہمات اور بے ہودہ خیالات بھی پریشانی کے عوامل میں سے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی وجہ سے اپنی زندگی میں رنج اٹھاتے ہیں لیکن کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے لطف و کرم کی یاد نیز اس حکم کی طرف توجہ کہ ہر

صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حسن ظن سے کام لے اسے یہ پریشانی جاتی رہتی ہے اور اس کی جگہ سکون و اطمینان لے لیتا ہے۔

۷۔ دنیا پرستی اور مادی زندگی کی رنگیوں پر دلباختگی انسانوں کے اضطراب و پریشانی کا ایک بہت بڑا عامل رہا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات لباس، جوتے، ٹوپی یا ہزاروں چیزوں میں سے کسی ایک کا خاس رنگ نہ مل سکے تو دنیا پرست کئی گھنٹے، کئی دن یا کئی ہفتے پریشان اور بے آرام رہتے ہیں لیکن خدا پر ایمان اور ایسی چیزوں سے مومن کی آزادی ایسی تمام پریشانیوں کو ختم کردیتی ہے کیونکہ ایک مومن ہمیشہ اصلاحی زہد کا حامل ہوتا ہے اور وہ مادی زندگی کی رنگینیوں کا قیدی نہیں ہوتا۔

جس وقت انسانی روح اتنی وسعت حاصل کرلے کہ وہ علی علیہ السلام کی طرح کہے:

دنیاکم هذه اهون عندی من ورقة فی فم جرادة تقضمها

تمہاری دنیا میری نظر میں درخت کے اس پتے سے بھی حقیر ہے کو ایک ٹڈی دَل کے منہ میں ہوجسے وہ جبا رہی ہو۔ (۲)

تو پھر کسی مادی چیز تک اسکا نہ پہنچنا یا سے کھو بیٹھنا انسانی روح کا سکون کیسے درہم برہم کرسکتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں کیونکر پریشانی پیدا کرسکتا ہے۔

۸۔ پریشانی کا ایک اور اہم عامل موت کا خوف بھی ہے یہ خوف ہمیشہ انسانوں کی روح کر ستائے رکھتا ہے۔ موت کا امکان چونکہ صرف زیادہ بڑی عمر میں نہیں بلکہ دوسرے سالوں میں بھی ہے، خصوصاً بیماریوں، جنگوں اور بدامنیوں کی حالت میں لہٰذا یہ وحشت اور خوف عمومی ہو سکتا ہے۔

البتہ اگر ہم عالم شناسی کے حوالے سے موت کو فنا اور ہر چیز کے خاتمے کے معنی میں سمجھیں (جیسا کہ مادی نظریہ رکھنے والوں کا خیال ہے) تو پھر یہ اضطراب بالکل بجا ہے۔ ایسی موت سے واقعاً ڈرنا چاہیئے جو انسان کی تمام آرزوں اور کامیوبیوں کا آخری نقطہ ہو لیکن اگر خدا پر ایمان کی وجہ سے موت کو ایک وسیع تر اور اعلیٰ تر زندگی کا دریچہ سمجھا جائے اور موت سے گزرنے کو زندان کے دالان سے گزر کر ایک آزاد فضا تک پہنچنا شمار کیا جائے تو پھر یہ پریشانی بے معنی ہے بلکہ ایسی موت اگر ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے آئے تو اسے پسند کیا جانا چاہیئے اور وہ چاہے جانے کے قابل ہے۔

پریشانی کے عوامل انہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اس کے اور بھی بہت سے عوامل شمار کئے جاسکتے ہیں لیکن یہ بات قابل قبول ہے کہ زیادہ تر پریشانیوں کی بازگشت مذکورہ عوامل ہی کی طرف ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عوامل خدا پر

ایمان کے مقابلے میں پگھل جاتے ہیں، بے رنگ ہو جاتے ہیں او رنابود ہو جاتے ہیں تو پھر اس بات کی تصدیق کرنا پڑے گی کہ خدا کی یاد دلوں کے سکون و قرار کا باعث ہے ﴿الا بذکر اللہ تطمئن القلوب﴾(۳)

۲۔ کیا خوفِ خدا اور اطمینان باہم مطابقت رکھتے ہیں؟

بعض مفسرین نے یہاں ایک اعتراض اٹھایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم مذکورہ آیت میں پڑھتے ہیں کہ یادِ خدا دلوں کے سکون و اطمینان باعث ہے جب کہ دوسری طرف سورہ انفال کی آیہ۲ میں ہے:

﴿انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم﴾

مومن وہ ہیں کہ جس وقت خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آرام و سکون سے مراد وہی عوامل کے مقابلے میں سکون ہے کہ جو عام لوگوں ک وپریشان کیے رکھتے ہیں، جن کے واضح نمونے ہم نے سطور بالا میں پیش کئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اہل ایمان اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں دوسرے لفظوں میں جو چیز ان میں نہیں ہوتی وہ ویران گر پریشانیاں ہیں جو دنیا میں عام طور پر ہوتی ہیں باقی رہی اصلاحی پریشانی کہ جو انسان کو خدا اور مخلوق کے بارے میں احساسِ ذمہ داری پر ہوتی ہے اور جو زندگی میں مثبت کردار اور آمادہ کرتی ہے وہ ان میں موجود ہوتی ہے اور اسے ہونا بھی چاہئیے اور خوف خدا سے مراد بھی یہی ہے۔(۴)

۳۔ "ذکر خدا" کیا ہے اور کس طرح ہے؟

جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات میں کہا ہے "ذکر" کبھی مطالب و معارف کے حفظ کے معنی میں آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ لفظ "حفظ" اس کی ابتداء میں بولا جاتا ہے اور لفظ "ذکر" اسے جاری رکھتے ہوئے اور کبھی کسی چیز کو زبان سے یا دل میں یاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ "ذکر" دو قسم کا ہے "ذکر قلبی" "ذکر زبانی"۔ ان میں ہر ایک پھر دو طرح کا ہے یا تو فراموشی کے بعد ذکر یا بغیر فراموش کئے ذکر۔

بہرحال زیر بحث آیت میں ذکر خدا کو کہ جو دلوں کے لئے باعث سکون ہے، سے مراد یہ نہیں کہ اس کا نام زبان پر لایا جائے اور بار بار تسبیح و تحلیل اور تکبیر کہی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کے ساتھ خدا کی طرف اور اس کے عظمت، اس کے علم اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کی طرف متوجہ رہا جائے اور یہ توجہ انسان میں جہاد و کوشش اور نیکیوں کی

طرف حرکت کی بنیاد بنے اور اس کے اور گناہ کے درمیان ایک مضبوط بند کا کردار ادا کرے یہ ہے وہ ذکر جس کے لئے روایات اسلامی میں اس قدر آثار و برکات بیان ہوئی ہیں ۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم نے حضرت علی سے جو وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی :

یا علی ثلاث لاتطیقھا ھٰذہ الامۃ المواسات للاخ فی مالہ و انصاف الناس من نفسہ و ذکر اللہ علی کل حال، و لیس ھو سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر و لٰکن اذا ورد علی مایحرم علیہ خاف اللہ عزو جل عندہ و ترکہ۔

یا علی ا تین کام ایسے ہیں جن کی اس امت میں طاقت نہیں ہے (اور ہر شخص یہ کام نہیں کرسکتا): مال میں دینی بھائیوں کے ساتھ مواسات کرنا ، اپنی طرف سے لوگوں کا حق ادا کرنا اور ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا لیکن خدا کی یاد(صرف) سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر نہیں ہے بلکہ یادِخدا یہ ہے کہ جس وقت انسان کسی فعل حرام کا سامنا کرے تو خدا سے ڈرتے اور اسے ترک کردے۔ (۵)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

الذکر ذکر اللہ عزو جل عند المصیبۃ و افضل من ذٰلک ذکر اللہ عند ما حرم اللہ علیک فیکون حاجزاً۔

ذکر دو قسم ہے ۔ ایک تو خدا کو مصیبت کے وقت رکھنا (اور صبر و استقامت سے کام لینا) اور اس سے افضل و برتر یہ ہے کہ محرمات کے مقابلے میں خدا کو یاد رکھا جائے اور اس کے اور حرام کام کے درمیان دیوار کھڑی کردی جائے ۔ (۶)

یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکر خدا کا تعارف ایک سپر اور دفاعی ہتھیار کے طور پر کروایا گیا ہے ۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم نے اپنے اصحاب کی طرف رخ کرکے ارشاد فرمایا:

اتخذوا جئنا فقالوا: یا رسول اللہ امن عدو و قد اظلنا؟

قال: لا، ولٰکن من النارقولوا سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر

اپنے لئے سپر مہیا کرو۔

اصحاب نے عرض کیا : یا رسول اللہ! کیا دشمنوں کے مقابلے میں جنہوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہم پر سایہ کئے ہوئے ہیں ؟ فرمایا : نہیں بلکہ جہنم (کی آگ) سے کہو: سبحان اللہ و الحمد اللہ و الاالہ الا اللہ و اللہ اکبر (خدا کی پاکیزگی بیان کرو، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرو اس کے علاوہ کسی کو معبود نہ بناؤ اور اسے ہر چیز سے برتر سمجھو) ۔(۶)

جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک احادیث میں پیغمبر اکرم کا تعارف 'ذکر اللہ " کے طور پر ہوا ہے تو وہ بھی اس بناء پر ہے کہ وہ لوگوں کو یاد خدا دلاتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں ۔ امام صادق علیہ السلام سے "﴿الابذکر اللہ تطمئن القلوب﴾" کی تفسیر کے ضمن میں نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :بمحمد تطمئن القلوب وهو ذكر الله و حجابه

محمد کے ذریعے دلوں کو سکون ہوتا ہے ، وہ ہیں خدا کا ذکر اور اس کا حجاب۔

۱۔ ایسے واقعات ہم پر دشمنوں کی مسلط کردہ ایران عراق جنگ میں ایک نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں ۔ یہ واقعات مجاہدین بد اور دیگر اسلامی جنگوں کے مجاہدین کی تازی کرتے ہیں ۔

۲۔ نہج البلاغہ ۲۲۴۔

۳۔مزید وضاحت کے لئے کتاب "راہ غلبہ پر نگرانیھا "کی طرف رجوع فرمائیں ۔

۴۔ تفسیر نمونہ جلد ۸۴(اردو ترجمہ) پر بھی ہم نے اس سلسلے میں وضاحت کی ہے ۔

۵۔سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۸۴۔

۶۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۸۴۔

۷۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۸۴۔

آیات ۳۲،۳۱، ۳۰

۳۰۔ ﴿كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَانِ قُلْ هُوَ رَبِّي لَاإِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ﴾۔

۳۱۔ ﴿وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَى بَلْ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا أَفَلَمْ يَيْئَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا وَلَايَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِنْ دَارِهِمْ حَتَّى يَأْتِيَ وَعْدُ اللهِ إِنَّ اللهَ لَايُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾۔

۳۲۔ ﴿وَلَقَدْ اسْتُهْزِءَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ﴾۔

ترجمہ

۳۰۔ جیسا کہ (ہم نے گزشتہ انبیاء کو بھیجا) تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا کہ جس سے پہلے دوسری امتیں آئیں اور چلی گئیں، تاکہ ہم نے جو کچھ تجھ پر وحی کی ہے ان کے سامنے پڑھو حالانکہ وہ رحمن (وہ خدا کہ جس کی رحمت سب پر محیط ہے) ست کفر کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ میرا پروردگار ہے، اسے کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر توکل کیا ہے اور میری بازگشت اس کی طرف ہے۔

۳۱۔ اگر قرآن کہ وجہ سے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مردوں کے ساتھ گفتگو کی جائے (وہ پھر بھی ایمان لائیں گے) لیکن یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو(جبراً)ہدایت کردے (لیکن جبری ہدایت کا کوئی فائدہ نہیں) اور کافروں پر ان کے اعمال کی وجہ سے مسلسل سرکوبی کرنے والی مصیبتیں ٹوٹی رہیں گی یا ان کے گھروں کے اردگرد نازل ہوں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری وعدہ پورا ہو، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

۳۲۔ (انہوں نے صرف تیرا مذاق نہیں اڑایا بلکہ) تجھ سے پہلے انبیاء سے بھی انہوں نے استہزاء کیا۔ میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر ان کی گرفت کی، تو نے دیکھا (میری) سزا کیسی تھی؟

شان نزول

مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلی آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں ہجرت کے چھٹے سال نزال ہوئی۔ جب صلح نامہ لکھا جانے لگا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ آلہ و سلم نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا:

لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس پر سہیل بن عمرو اور دیگر مشرکین کہنے لگے: ہم "رحمان" ک و نہیں پہچانتے۔ "رحمن" تو صرف ایک ہی ہے اور وہ یمامہ میں ہے (ان کی مراد مسیلمہ کذاب سے تھی کہ جو نبوت کا دعویدار تھا)، بلکہ لکھو: با سمک اللھم

زمانہ جاہلیت میں اسی طرح لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت نے حضرت علی سے کہا لکھو:

یہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ

ابھی اتنا ہی لکھتا تھا کہ مشرکین قریش کہنے لگے: اگر تم خدا کے رسول ہوتے اور ہم تم سے جنگ کرتے اور خانہ خدا کا راستہ تم پر بند کرتے تو ہم بڑے ظالم ہوتے (جھگڑا تو تمہاری اس رسالت کا ہی ہے) بلکہ لکھو "یہ صلح نامہ محمد بن عبد اللہ کا ہے"۔

اس وقت اصحاب پیغمبر بھڑک اٹھے۔ کہنے لگے: ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے جنگ کریں۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا: نہیں، جس طرح یہ کہتے ہیں ویسے لکھو۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا کے نام "رحمن" کے سلسلے میں ان کی بہانہ جوئی، ہٹ دھرمی اور مخالفت پر ان کی شدید سرزنش کی گئی کیونکہ یہ تو خدا کی قطعی صفات میں سے ہے۔

یہ شان نزول اس صورت میں صحیح ہے جب ہم اس سورہ کو مدنی سمجھیں تاکہ یہ صلح حدیبیہ کے واقعے سے مطابقت اختیار کر سکے لیکن اگر جیسا کہ مشہور ہے کہ اسے مکی سمجھیں تو پھر اس بحث کی نوبت نہیں آئے گی مگر یہ کہ اس آیہ کی شان نزول کو مشرکین کی اس گفتگو کا جواب سمجھا جائے جو سورہ فرقان میں آئی ہے۔ انہوں نے "رحمن" کو سجدہ کرنے کی دعوتِ پیغمبر کے جواب میں کہا ہے کہ ہم رحمن کو نہیں پہچانتے:

﴿اسجدوا للرحمن قالوا و ما الرحمن﴾ (جب ان سے کہا گیا کہ) رحمن کو سجدہ کرو تو کہنے لگے رحمن کون؟ (فرقان۔۶۰)

بہر حال مندرجہ بالا آیت شانِ نزول سے قطع نظر بھی ایک واضح مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا۔ دوسری آیت کی شان نزول کے بارے میں بھی بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کی پشت کی طرف بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیغمبر اکرم کی طرف کسی کو یہ پیغام دے کر بھیجا:

اگر تو چاہتا ہے کہ ہم تیری پیروی کریں تو مکہ کے ان پہاڑوں کو اپنے قرآن کے ذریعے پیچھے ہٹا دے تاکہ ہماری یہ تنگ زمین کسی حدتک وسیع ہو جائے ۔ نیز زمین میں شگاف کرکے اس میں چشمے اور نہریں جاری کردے تاکہ ہماری یہ تنگ زمین کسی حدتک وسیع ہو جائے ۔ نیز زمین میں شگاف کرکے اس میں چشمے نہریں جاری کردے تاکہ ہم درخت لگائیں اور زراعت کریں تو اپنے گمان میں داؤد سے کم نہیں ہے کہ جس کے لئے خدا نے پہاڑوں کو مسخر کر رکھا تھا کہ جو اس سے ہم آواز ہو کر خدا کی تسبیح کرتے تھے یا یہ کہ ہمارے لئے ہوا کو مسخر کردے تاکہ ہم اسکے دوش پر سوار ہو کر شامل کی طرف جائیں اور اپنی مشکلات حال کریں اپنی ضروریات پوری کریں اور اسی دن واپس لوٹ آئیں جیسا کہ سلیمان کے لئے مسخر تھی اور تو اپنے گمان میں سلیمان سے کم نہیں ہے نیز اپنے دادا "قصی" (قبیلہ قریش کے جدِّ اعلیٰ) یا ہمارے مردوں میں سے کسی اور شخص کو جسے چاہے زندہ کردے تاکہ ہم اس سے سوال کریں کہ کیا جو کچھ تو کہتا ہے حق ہے یا باطل کیونکہ عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتا تھا اور تو عیسیٰ سے کم تر نہیں ہے ۔

اس پر دوسری زیر بحث آیت نازل ہوئی اور ان سے کہا گیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہٹ دھرمی کے وجہ سے ہے نہ کہ ایمان لانے کے لئے کیونکہ ایمان لانے کے لئے درکار کافی معجزات پیش کیے جا چکے ہیں ۔

ہٹ دھرم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے

ان آیات میں ہم پھر نبوت کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں ۔ ان میں مشرکین کی گفتگو کا ایک اور حصہ پیش کیا گیا ہے نیز نبوت کے بارے میں ان کی گفتگو کا واضح جواب دیا گیا ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے گزشتہ انبیاء کو گزشتہ قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا ہے کہ جس سے پہلے امتیں آئیں اور چلی گئیں ﴿لتتلو ا علیھم الذی اوحینا الیک﴾ حالانکہ وہ "رحمن" (وہ خدا کہ جس کی رحمت اور وسیع و عام فیض مومن و کافر اور یہودو نصاریٰ سب پر محیط ہے) کا انکار کرتے ہیں (وھم یکفرون بالرحمن)

۔

۔ کہہ دو: اگر تم انکار کرتے ہو تو رحمن کہ جن کا فیض و رحمت عام ہے، میرا پروردگار ہے (قل ھو ربی) اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اس پر توکل کرتا ہوں اور میری بازگشت اسی طرف ہے (لا الہ الا ھو علیہ توکلت والیہ متاب)

۔

اس کے بع دان بہانہ تراش افراد کے جواب میں کہ جو ہر چیز پر اعتراض کرتے ہیں، فرماتا ہے: یہاں تک کہ اگر قرآن کے ذریعے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مردوں سے گفتگو بھی ہو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَى﴾۔

لیکن یہ تمام کام خدا کے اختیار میں ہے اور وہ جتنا ضروری سمجھتا ہے انجام دیتا ہے ﴿بَلْ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا﴾۔

مگر تم لوگ حق کے طالب نہیں ہو، گر ہوتے تو جس قدر اعجاز کی نشانیاں اس پیغمبر سے صادر ہوئی ہیں ایمان لانے کے لئے کاملاً کافی ہیں، یہ تو سب بہانے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو جبراً ہدایت کردے ﴿أَفَلَمْ يَيْئَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا﴾۔

۱۔ "﴿أَفَلَمْ يَيْئَسِ﴾" "یأس" کے مادہ سے ناامیدی کے معنی میں ہے مگر بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں علم کے معنی میں ہے لیکن (فخر رازی کے مطابق) "کچھ لوگوں" کے بقول کہیں نہیں دیکھا گیا کہ "یئست" "علمت" کے معنی میں ہو۔ مفردات میں راغب کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "یأس" یہاں اپنے اسی مشہور معنی میں ہے لیکن ہر مایوسی کے لئے ضروری ہے کہ اس کام کے نہ ہوسکنے کا علم ہو۔ اس بناء پر ان کے یاس کے ہونے کا لازمہ ان کا علم ہے لیکن راغب کی اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں یاس وجود علم کے معنی میں نہیں بلکہ عدم کے علم کے معنی میں ہے اور یہ مفہوم آیت کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا اس بناء پر حق وہی ہے جو مشہور مفسرین نے کہا ہے اور اس کے لئے اقوالِ عرب سے بھی شواہد پیش کیے گئے ہیں اور ان کے نمونے فخر رازی نے اپنی تفسیر میں پیش کئے ہیں ۔(غور کیجئے)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ داخلی یا خارجی طور پر جبری طریقے سے منکرین اور ہٹ دھرم افراد تک کو بھی ایمان لانے پر آمادہ کرسکتا ہے کہ کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی قدرت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے لیکن وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا جبری ایمان بے وقعت ہے۔ ایسا ایمان اس معنویت اور کمال سے محروم ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس کے باوجود کفار ہمیشہ اپنے اعمال کے سبب تباہ کن مصائب کے حملے سے دوچار ہیں یہ مصائب مختلف بلاؤں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں اور کبھی ان پر مجاہدین اسلام کے تباہ کن حملوں کی صورت میں آتے ہیں ﴿وَلاَیَزَالُ الَّذِینَ کَفرُوا تُصِیبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ﴾۔

یہ مصائب اگر ان کے گھروں پر نازل نہ ہوں تو ان کے گھروں کے آس پاس نازل ہوں گے ﴿أَوْ تَحُلُّ قَرِیبًا مِنْ دَارِهِمْ﴾تاکہ وہ عبرت حاصل کریں، حرکت میں آئیں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں۔

یہ تنبیہیں اسی طرح جاری رہیں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری حکم آپہنچے﴿حَتَّی یَأْتِیَ وَعْدُ اللهِ﴾۔

یہ آخری حکم ہو سکتا ہے موت کی طرف یا روز قیامت کی طرف اشارہ ہو یا بقول بعض کے فتح مکہ کی طرف اشارہ ہو کہ جس نے دشمن کی ساری طاقت کو درہم برہم کرکے رکھ دیا۔

بہر حال خدا کا وعدہ حتمی ہے "خدا کبھی بھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا" ﴿إِنَّ اللهَ لاَیُخْلِفُ الْمِیعَادَ﴾

۔

زیر نظر آخری آیت پیغمبر اکرم کی طرف روئے سخن کئے ہوئے کہتی ہے: صرف تمہی نہیں ہو کہ جسے اس کا فر گروہ کے طرح طرح کے تقاضوں اور من پسند معجزوں کی فرمائش کے ذریعے تمسخر اور استہزاء کا سامنا کرنا پڑا ہے بلکہ یہ تو پوری تاریخ انبیاء میں ہوتا رہا ہے "اور تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے" ﴿وَلَقَدْ اسْتُهْزِءَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِکَ

﴾۔

لیکن ہم نے ان کافروں کو فوراً عذاب نہیں کیا بلکہ "ہم نے انہیں مہلت دی" ﴿فَأَمْلَیْتُ لِلَّذِینَ کَفَرُوا﴾۔

اس لئے کہ شاید بیدار ہوجائیں اور شاید راہ حق کی طرف پلٹ آئیں یا کم از کم ان پر کافی اتمام حجت ہو جائے کیونکہ اگر وہ بدکار اور گنہگار ہیں تو خدا کی مہربانی اور اس کا لطف و کرم اور حکمت بھی تو موجود ہے۔

بہر حال یہ مہلت اور تاخیر اس معنی میں نہیں کہ ان کی سزا اور کیفر کردار کو فراموش کردیا جائے لہٰذا "اس مہلت کے بعد ہم نے انہیں گرفت کی اور تو نے دیکھا کہ ہم نے انہیں کس طرح سزا دی" یہ انجام تیری ہٹ دھرم قوم کے بھی انتظار میں ہے ﴿ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَکَیْفَ کَانَ عِقَابِ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ لفظ "رحمن" کیوں استعمال کیا گیا ہے؟

مندرجہ بالا آیات اور ان کے بارے میں مذکورہ شان نزول نشاندہی کرتی ہیں کہ قریش کو لفظ "رحمن" کہ قریش کو لفظ "رحمن" سے خدا کی توصیف و تعریف پسند نہیں تھی کیونکہ ایسی کوئی چیز ان کے درمیان رائج نہ تھی لہٰذا وہ اس کا مذاق اراتے تھے حالانکہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس لفظ میں ایک خاص لطف پوشیدہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی صفت رحمانیت اس کے لطف عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو دوست اور دشمن سب پر محیط ہے اور مومن اور کافر سب کے شامل حال ہے جب کہ اس کے مقابلے میں صفت رحیمیت خدا کی صفتِ خاص ہے اور صالح اور مومن بندوں کے بارے میں ہے۔

یعنی تم کس طرح اس خدا پر ایمان لاتے ہو کہ ج ومنبع لطف و کرم ہے یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو بی اپنے لطف و رحمت سے نوازتا ہے۔ یہ تمہاری انتہائی نادانی ہے۔

۲۔ پیغمبر اکرم نے معجزات کا تقاضا کیوں پورا نہ کیا

یہاں ہمیں پھر ان لوگون کی گفتگو کا سامنا کرنا پڑرہاہے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سوائے قرآن کے اور کوئی معجزہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ زیر نظر آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے مدد لیتے ہیں کیونکہ ان آیات کا ظہور یہ بتاتا ہے کہ نبی اکرم نے مختلف معجزات کی فرمائش کو ٹھکرادیا۔ وہ لوگ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے پیچھے ہٹانے کا، وہاں کی زمین میں شگاف کرکے چشمے اور نہریں جاری کرنے کا اور مردوں کے زندہ ہوکر گفتگو کرنے کا تقاضا کررہے تھے لیکن آپ نے ان کی درخواست رد کردی۔

لیکن ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ معجزہ ان لوگوں کو کہ جو حقیقت طلب ہیں صرف حقیقت کا چہرہ دکھانے کے لئے ہے نہ یہ کہ پیغمبر ایک معجزہ گر بن جائے اور جو شخص جس عمل فرمائش کرے وہ اسے انجام دیتا جائے چاہے وہ اسے قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہو۔

من پسند کے معجزات کی ایسی فرمائش صرف ایسے ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر افراد کی طرف سے کی جاتی ہے کہ جو کسی حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس امر کی نشانیاں مندرجہ بالا آیات میں واضح طورپر دکھائی دیتی ہیں۔ آخری زیر بحث آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ گفتگو ان کی طرف سے پیغمبر کا مذاق اڑانے کے سلسلے میں آئی ہے یعنی وہ لوگ حق کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ ایسی فرمائشوں سے ان کا مقصود پیغمبر اکرم کا تمسخر اڑانا تھا۔

علاوہ ازیں ان آیات کے بارے میں جو شان ہائے نزول ہم نے پڑھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرم سے تقاضا کیا تھا کہ وہ گزشتہ بزرگوں میں سے کسی ایک کو زندہ کردیں تاکہ وہ ان سے پوچھیں کہ کیا آپ حق پر ہیں یا باطل پر حالانکہ اگر پیغمبر اس قسم کا معجزہ (مردوں کو زندہ کرنا) پیش کردیں تو پھر اس بات کے پوچھنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ پیغمبر حق پر ہیں یا باطل پر۔ یہی بات نشاندہی کرتی ہے کہ وہ متعصب، ہٹ دھرم اور معاند افراد تھے اور ان کا مقصد حق کی جستجو نہ تھا۔ وہ ہمیشہ عجیب و غریب فرمائشیں کرتے رہتے تھے اور آخر کار وہ ایمان بھی نہیں لاتے تھے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۰ کے ذیل میں ہم انشاء اللہ دوبارہ اس مسئلے کی وضاحت کریں گے۔

۳۔ "قارعۃ" کیا ہے؟

'قارعۃ" "قرع" کے مادہ سے ہے جو کہ کھٹکھٹانے کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر "قارعۃ" کا معنی ہے "کھٹکھٹانے والی" یہاں ایسے امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور اسے تنبیہ کرتے ہیں اور اگر بیدار ہونے کے لئے آمادہ ہو تو اسے بیدار کرتے ہیں۔

در حقیقت "قارعۃ" کا ایک وسیع معنی ہے کہ جس میں ہر قسم کی انفرادی یا اجتماعی مصیبتوں، مشکلات اور دردناک حوادث کا مفہوم شامل ہے۔ اسی لئے بعض مفسرین اسے جنگوں، خشک سالیوں، قتل ہونے اور قید ہونے کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جب دوسرے اسے صرف ان جنگوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو صدر اسلام میں "سریہ" کے عنوان سے ہوئیں۔ "سریہ" ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جن میں پیغمبر اسلام خود شریک نہیں ہوئے بلکہ ان میں آپ نے اپنے اصحاب و انصار کو مامور فرمایا لیکن مسلم ہے کہ "قارعۃ" ان امور میں سے کسی ایک کے لئے مختص نہیں اور اس کے مفہوم میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں ہے کہ یہ تباہ کن حوادث خود انہیں پہنچتے تھے یا ان کے گھر کے آس پاس رونما ہوتے تھے یعنی اگر وہ خود ان بیدار کرنے والے اور تنبیہ کرنے والے حوادث میں بتلا نہ ہوں تو بھی یہ ان کے اوس پڑوس یا ان کے نزدیک رونما ہوتے ہیں۔ کیا یہ ان کی بیداری کے لئے کافی نہیں۔

آیات ۳۳،۳۴

۳۳۔﴿أَفَمَنْ هوقَائِمٌ عَلَی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَکَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لاَیَعْلَمُ فِی الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ بَلْ زُیِّنَ لِلَّذِینَ کَفَرُوا مَکْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنْ السَّبِیلِ وَمَنْ یُضْلِلْ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾۔

۳۴۔﴿لَهُمْ عَذَابٌ فِی الْحَیَاةِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ اللّٰهِ مِنْ وَاقٍ﴾۔

ترجمہ

۳۳۔کیا وہ کہ جو سب کے سروں پر موجود ہے (اور سب کانگران اور نگہبان ہے)اور سب کے اعمال دیکھتا ہے (اس کی مانند ہے کہ جو ان میں سے کوئی صفت نہیں رکھتا)۔انہوں نے خدا کے لئے شریک قرار دیے ہیں۔ کہہ دو: ان کے نام لو، کیا اسے ایسی چیز کی خبر دیتے ہوئے کہ روئے زمین میں جس کے وجود سے وہ بے خبر ہے یاظاہری اور کھو کھلی باتیں کرتے ہو(نہیں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے)بلکہ کافروں کے سامنے ان کے جھوٹ مزین کئے گئے ہیں (اور اندرونی ناپاکی کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں) اور وہ(خدا کی)راہ سے روک دیئے گئے ہیں اور جسے خدا گمراہ کردے اس کے لئے کوئی راہنما نہیں ہوگا۔

۳۴۔ ان کے لئے دنیا میں (دردناک) عذاب ہے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے اور خدا کے مقابلے میں کوئی ان کا دفاع نہیں کرسکتا۔

کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟

ان آیات میں قرآن پھر توحید کی بحث کی جانب لوٹتا ہے اور ان لوگوں کو اس واضح دلیل سے خطاب کرتا ہے: کیا وہ کہ جو تمام عالم ہستی میں ہر چیز کا محافظ اور جس نے سب کو اپنی تدبیر کے زیرِ پردہ قرار دیا ہے اور تمام لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے اس کی طرح ہے کہ جس میں ان صفات میں سے کوئی بھی نہیں ﴿أَفَمَنْ هوقَائِمٌ عَلَی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ﴾۔[1]

در حقیقت مندرجہ بالا جملہ وضاحت سے کہتا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کا اس طرح سے احاطہ کر رکھا ہے کہ گویا وہ سب کے سروں پر کھڑا ہے، جو کچھ انجام دیتا ہے وہ اسے دیکھتا ہے، جانتا ہے، اس کا حساب و کتاب رکھتا ہے، اس کی جزا و سزا دیتا ہے اور تصرف و تدبیر کرتا ہے۔ اس بناء پر لفظ "قائم" ایک وسیع رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام امور شامل ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے ان میں ایک پہلو لے لیا ہے۔

اس کے بعد گزشتہ بحث کی تکمیل اور آئندہ بحث کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے خدا کے شریک قرار دیئے ہیں ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ﴾۔

فوراً ہی انہیں چند طریقوں سے جواب دیا گیا:

پہلا یہ کہ: فرمایا: ان شریکوں کے نام لو ﴿قُلْ سَمُّوهُم﴾۔

نام لینے سے یا تو یہ امر مراد ہے کہ ان کی وقعت اور قدر و قیمت اتنی بھی نہیں کہ ان کا نام و نشان بھی ہو یعنی تم چند بے نام و نشان اور بے وقعت موجودات کا قادر و متعال پروردگار کے کس طرح ہم پلہ قرار دیتے ہو؟

یا مراد یہ ہے کہ ان کی صفات بیان کرو تاکہ ہم دیکھیں کہ کیا وہ عبودیت کے لائق ہیں؟ اللہ کے بارے میں ہم کہتے ہیں وہ خالق، رازق زندگی بخشنے والا، عالم، قادر اور بزرگ و برتر ہے تو کیا تم یہ صفات بتوں کے لئے استعمال کرسکتے ہو یا اس کے برعکس اگر ان کا ذکر کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ، پتھر، لکڑی کے بے حس و حرکت بت جو عقل و شعور سے عاری ہیں اور اپنے عبادت کرنے والوں کے محتاج ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے عاری بت تو پھر ان دونوں کو کس طرح ایک جیسا قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا اب تک انہوں نے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے یا کسی کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے، یا کسی کو مشکل حل کی ہے یا کسی کام میں مدد کی ہے؟ تو ان حالات میں کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انہیں خدا کا ہم پلہ قرار دیا جائے کہ جو تمام برکات و نعمات، سود و زیان اور جزا و سزا کا مالک ہے۔

البتہ کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام معانی "سموھم" (ان کے نام لو) جملے میں جمع ہوں۔

دوسرا یہ کہ اس قسم کا کوئی شریک کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہ خدا جو تمہارے خیال میں ان کا شریک ہے ان کے وجود کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتا جب کہ اس کا علم تمام جہان پر محیط ہے۔ "کیا اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جس کے وجود کو وہ زمین میں نہیں جانتا" ﴿أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ﴾۔ یہ تعبیر در حقیقت مد مقابل کے بے ہودہ اور فضول گفتگو ختم کرنے کے لئے بہترین راستہ ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص آپ سے کہتا ہے کہ کل رات فلاں شخص تمہارے گھر میں مہمان تھا اور آپ اسکے جواب میں کہتے ہیں کہ تم مجھے ایسے مہمان کی خبر دیتے ہو جس کی مجھے اطلاع نہیں ہے یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص میرا مہمان ہو اور میں اس سے بے خبر ہوں اور تم اس سے آگاہ ہو۔

تیسرا یہ کہ دراصل خود تم بھی دل میں ایسی چیز کا ایمان نہیں رکھتے "صرف ایک کھوکھلی ظاہری بات کا سہارا لئے ہوئے ہو کہ جس میں کوئی حقیقی مفہوم موجود نہیں ہے" ﴿أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ﴾۔

اسی بناء پر یہ مشرکین جب زندگی کی کسی سخت گھائی میں جو ہر طرف سے بند ہو کر پھنس جاتے ہیں تو " اللہ " کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ وہ دلی طور پر جانتے ہیں کہ بتوں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خدا ان کی حالت سورہ عنکبوت کی آی ۶۵ میں بیان فرماتا ہے جب کہ وہ کسی کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سخت طوفان میں گھر جاتے ہیں تو صرف خدا کا رخ کرتے ہیں۔

چوتھا یہ کہ مشرکین صحیح شعور نہیں رکھتے اور چونکہ ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں لہٰذا عقل مندانہ اور صحیح فیصلہ نہیں کرپاتے۔ اسی بناء پر گمراہ ہی میں آن پڑے ہیں۔ "پیغمبر اور مومنین کے خلاف ان کی سازشوں کو اور ان کے جھوٹ، تہمتوں اور بہتانوں کو (ان کی اندرونی ناپاکی کی بناء پر)مزین کردیا گیا ہے"یہاں تک کہ انہوں نے ان بے وقعت اور بے نام و نشان موجودات کو خدا کا شریک جان لیا ہے﴿بل زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ﴾)اور جس شخص کو خدا قرار دے اس کی ہدایت کسی کے بس نہیں ہے﴿وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ گمراہی جبری معنی میں نہیں ہے اور نہ یہ بغیر کسی شرط اور بنیاد کے من پسند کا مسئلہ ہے بلکہ خدا کی طرف سے گمراہی خود انسان کے غلط کاموں کے عکس العمل کے معنی میں ہے یہ اس کے اپنے اعمال کا ردّ عمل ہے کہ جو اسے گمراہیوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چونکہ ایسے اعمال میں خدا نے یہ خاصیت پیدا کی ہے لہٰذا اس کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے۔

زیر نظر آخری آیت میں دنیا و آخرت میں ان کی دردناک سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان ن میں فطرتاً شکست و ناکامی، سیاہ روزی اور ذلت و رسوائی شامل ہیں۔ فرمایا گیا ہے: ان کے لئے دنیا زندگی میں بھی سزا ہے اور آخرت کی سزا زیادہ سخت اور شدید تر ہے﴿لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ﴾۔ کیونکہ وہ سزا دائمی بھی ہے، جسمانی اور روحانی بھی اور اس میں طرح طرح کا عذاب شامل ہے اور اگر وہ یہ گمان کریں کہ اس سے بچ نکلنے کے لئے ان کے پاس کوئی راستہ یا وسیلہ ہے تو وہ سخت غلط فہی میں بتلا ہیں کیونکہ " خدا کے مقابلے میں انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی "﴿وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ﴾۔

۱۔در حقیقت مندرجہ بالا جملہ بتداء پر مشتمل ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، تقدیر میں اس طرح تھا:افمن هو قائم علی کل نفس بما کسبت کمن لیس کذلک یعنی کیا وہ کہ جو اس صفت کا حامل ہے اس جیسا کہ جو اس سے عاری ہے۔

آیت ۳۵

۳۵۔ ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِی وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا تِلْکَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوا وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ﴾۔

ترجمہ

۳۵۔ وہ جنت کہ جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں ۔ اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کے سائے ہمیشہ کے لئے ہیں ۔ یہ انجام ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے اور کافروں کا انجام آگ ہے ۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں توحید، قیامت اور دیگر اسلامی معارف کا باری باری ذکر آیا ہے ۔ اس آیت میں معاد کے بارے میں خصوصاً جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنت کے وہ باغ کہ جن کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے درختوں کے نیچے جاری پانی کی نہریں رواں دواں ہیں﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِی وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾۔

”مثل“ کی تعبیر شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت کے گھر کے باغات اور دیگر نعمتوں کی اس محدود جہان میں رہنے والوں کے لئے کسی بیان سے تعریف نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ جہان بعد از موت کے جہان کے مقابلے میں نہایت چھوٹا ہے ۔ اس جہان کے لوگوں کے لئے وہاں کی چیزوں کو صرف ” مثل“ اور ارشاداتی گفتگو میں بیان کیا جاسکتا ہے ۔ جیسے ایک بچہ جو عالم جنین میں ہے اگر عقل و شعور رکھتا ہو تو اس کے سامنے اس دنیا کی نعمتوں کی وضاحت ہرگز نہیں ہوسکتی ۔ صرف ناقص اور کم رنگ مثالیں پیش کی جاسکتی ہے ۔

باغات کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کے پھل دائمی ہیں ﴿أُكُلُهَا دَائِمٌ﴾۔نہ کہ اس جہان کے پھلوں کی طرح جو موسمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موسم میں ہی پیدا ہوتا ہے بلکہ کسی آفت کی وجہ سے ممکن ہے کسی سال بالکل نہ ہو لیکن جنت کے پھلوں کو نہ کوئی آفت درپیش ہے اور نہ وہ کسی موسم کے محتاج ہیں بلکہ سچے مومنین کے ایمان کی طرح قائم و دائم ہیں ۔ اسی طرح ان درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے ﴿ وَظِلُّهَا﴾ ۔ ان کے سائے دنیا کے درختوں کے سائے کی

طرح نہیں ہیں کہ ہو سکتا دن کے وقت جب کہ صبح سورج ایک طرف سے چمکتا ہے ان کے سائے سطح باغ میں گھرے ہوں لیکن جب آفتاب عمودی شکل میں چمکتا ہے تو وہ کم ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح فصل بہار میں گرمیوں میں جب کہ درخت پتوں سے بھرے ہوتے ہیں ان کا سایہ ہوتا ہے مگر فصل خزاں میں سردیوں میں جب درخت برہنہ ہوجاتے ہیں ان کا سابھی جاتا رہتا ہے ۔ (البتہ دنیا میں کہیں کہیں سدا بہار درختوں کے نمونے بھی موجود ہیں کہ جو ہمیشہ پھل پھول دیتے رہتے ہیں ۔ یہ درخت ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں خزان کی خنکی اور فصلِ سرما نہیں ہوتی) ۔

خلاصہ یہ کہ جنت کے سائے اس کی تمام نعمتوں کی طرح جاودانی ہیں ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ باغاتِ بہشت کے لئے خزاں نہیں ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں نورِ آفتاب یا اس جیسی کوئی چیز ہے ورنہ جہاں شعاعِ نور نہ ہو وہاں سائے کا کوئی مفہوم نہیں ہے ۔ یہ جو سورہ دہر کی آیہ ۱۳ میں ہے :﴿لا یرون فیھا شمساً ولا زمھریراً﴾

وہاں شدت کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ زیادہ سردی ۔

ہوسکتا ہے یہ موسم کے اعتدال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سوزشِ آفتاب اور اسی طرح سخت سردی جنت میں نہیں ہے نہ یہ کہ وہاں سورج بالکل نہیں چمکتا ۔

کرہ آفتاب کا خاموش ہوجانا اس کے ہمیشہ کے لئے ختم ہوجانے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے :

قیامت میں زمین و آسمان دوسرے (نئے اور وسیع تر) زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے ۔

اور اگر کہا جائے کہ جہاں سورج کی تمازت اور تپش نہیں وہاں پھر سایہ کس لئے ہے ؟ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سائے کا لطف صرف تمازتِ آفتاب سے بچنے میں نہیں ہے بلکہ پتوں سے طبعی اور اوپر جانے والی رطوبت کہ جو نشاط بخش آکسیجن سے ملی ہوتی ہے سائے کو ایک خاص قسم کی لطافت اور تازگی بھی دیتی ہے ۔ اسی لئے درخت کا سایہ کرے کی چھت کے سائے کی طرح ہرگز خشک اور بے روح نہیں ہوتا ۔

جنت کی یہ تین صفات بیان کرنے کے بعد، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : یہ ہے پرہیزگاروں کا انجام ، لیکن کافروں کا انجام آگ ہے ﴿تِلْکَ عُقْبَی الَّذِینَ اتَّقَوا وَعُقْبَی الْکَافِرِینَ النَّارُ﴾ ۔

جنت کی نعمتوں کا ذکر اس خوبصورت اور زیبا تعبیر کے ذریعے لطافت اور تفصیل کے ساتھ ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں ایک مختصر سا خشک اور سخت جملہ ہے کہ ان کا انجام کار جہنم ہے ۔

آیت ۳۶

۳۶۔ ﴿وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنْ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنكِرُ بَعْضَهُ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللهَ وَلاَأُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ﴾۔

ترجمہ

۳۶۔ اور وہ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے وہ اس پر خوش ہیں کہ جو تجھ پر نازل ہوا ہے اور بعض احزاب (اور گروہ) اس کے ایک حصہ کا انکار کرتے ہیں ۔ کہہ دو: میں مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت کروں اور اسکے لئے شریک قرار نہ دوں ۔ میں اس کی طرف دعوت دیتا ہوں (سب کی) بازگشت اسی کی طرف ہے ۔

خدا پرست اور دیگر گروہ

اس آیت میں آیات قرآن کے نزول پر لوگوں کے مختلف ردّ عمل کی طرف اشارہ ہوا ہے ۔ اس میں بتا یا گیا ہے کہ حقیقت کے متلاشی اور حق جو افرد کس طرح جو کچھ پیغمبر پر نازل ہوتا تھا اس پر سر تسلیم خم کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے جب کہ مخالف اورہٹ دھرم افراد اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے :جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو کچھ تجھ پر نازل ہوتا ہے ﴿و الذین اتیناھم الکتاب یفرحون بما انزل الیک﴾۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”اتیناھم الکتاب“ اور اس قسم کی تعبیر پورے قرآن میں عام طور پر یہود و نصاریٰ اور ان جیسے آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ، تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ یہاں بھی انہی کی طرف اشارہ ہے ۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور ان جیسے دوسرے جویانِ حق تجھ پر ان آیات کے نزول پر مسرور ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ انہیں ان نشانیوں سے ہم آہنگ پاتے ہیں جو ان کے پاس ہیں اور دوسری طرف یہ انکے لئے ان خرافات سے نیز یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب کے ان عالم نما جاہلوں کے شر سے آزادی اور نجات کا سبب ہیں جنہوں نے انہیں قید و بند میں جکڑ رکھا ہے اور فکری آزادی اور تکامل و ارتقائے انسانی سے محروم رکھا ہے ۔

یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”﴿الذین اتینا ھم الکتاب﴾“ سے مراد حضرت رسول اکرم کے اصحاب و انصار ہیں بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے لئے ایسی تعبیر کا استعمال معمول نہیں ہے ۔ علاوہ ازیں یہ بات ”﴿بما انزل الیک﴾“ سے مطابقت نہیں رکھتی ۔(۱)

نیز جو کچھ کہا گیا سورہ رعد کا مکی ہونا اس کے منافی نہیں کیونکہ یہودیوں کا اصلی مرکز اگرچہ مدینہ اور خیبر تھے اور عیسائیوں کا اصلی مرکز نجران وغیرہ تھا پھر بھی اس میں شک نہیں کہ وہ مکہ آتے جاتے تھے اور مکہ میں ان کے افکار و نظریات اور ثقافت کا تھوڑا بہت اثر تھا ۔ اسی بناء پر مکہ کے لوگ ان انشانیوں کے بناء پر کہ جو یہودی خدا کے آخری پیغمبر کے بارے میں بیان کرتے تھے ان میں سے ایسے پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں رہتے تھے ۔ (اس سلسلے میں ورقہ بن نوفل اور اس قسم کے دیگر افراد کے واقعا مشہور ہیں) ۔ قرآن مجید کی دیگر سورتوں میں بھی اس بات کے شواہد ہیں کہ اہل کتاب میں سے سچ مومنین پیغمبر اسلام پر آیاتِ قرآن کے نزول سے خوش تھے ۔ سورہ قصص کی آیہ ۵۲ میں ہے :

﴿الذین اتینا هم الکتاب من قبله هم به یؤمنون﴾

جنہیں ہم نے اس سے پہلے آسمانی کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان رکھتے تھے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : لیکن احزاب میں سے ایک جماعت ہے کہ جس پر قومی و مذہبی تعصب اور ایسے دوسرے تعصبات کا غلبہ تھا ۔ اسی بناء پر قرآن انہیں " اہل کتاب " نہیں کہتا کیونکہ وہ اپنی آسمانی کتب کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کئے ہوئے ۔ بلکہ حقیقت میں وہ " احزاب " اور مختلف گروہ تھے کہ جو صرف اپنے اپنے گروہ کے راستے پر چلتے تھے ۔ یہ گروہ رہ اس چیز کا انکار کردیتے تھے کہ جو ان کے اپنے میلان ، طریقے اور پہلے سے کئے گئے فیصلوں سے ہم آہنگ نہ ہوتی ۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ " احزاب " مشرکین کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سورہ احزاب مین بھی ان کا اس لفظ کے ذریعے ذکر کیا گیا ہے ۔ اصل میں ان کا کوئی دین و مذہب نہ تھا بلکہ وہ بکھرے ہوئے گروہ اور احزاب تھے کہ جو قرآن اور اسلام کی مخالفت میں متحد تھے ۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مندرجہ بالا آیت صفتِ رحمن کے ساتھ خدا وند عالم کی توصیف سے بت پرستوں کے انکار کی طرف اشارہ ہے کہ جب اہل کتاب خصوصاً یہودی اس توصیف سے آشنائی کی بناء پر قرآنی آیات میں لفظ " رحمن " کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور مشرکینِ مکہ کہ جو اس صفت سے نا آشنا تھے ، اس کا مذاق اڑاتے تھے ۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی اور اس کی مخالفت اور رہٹ دھرمی کی پرواہ نہ کرو بلکہ اپنے حقیقی خط اور صراط مستقیم پر قائم رہو اور " کہو: میں مامور ہوں کہ صرف اللہ کی پرستش کروں کہ جو یکتا و یگانہ خدا ہے اور

اس کے لئے کسی شریک کا قائل نہ ہوں میں صرف اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میری اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے "﴿قل امرت ان اعبد اللہ ولا اشرک بہ الیہ ادعوا و الیہ مآب﴾۔

یہاں س طرف اشارہ ہے کہ سچے موحد اور حقیقی خدا پرست کا خدا کے فراین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ اورپروگرام نہیں ہے وہ ان تمام امور کے لئے فرماں بردار ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہین اور ان کے بارے میں کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے کا قائل نہیں ہوتا ۔ ایسا نہیں ہوتاکہ جس چیز کے بارے میں اس کی رغبت ہو اسے قبول کرلے اور جس کے بارے میں میلان نہ ہو اس کی مخالفت کرے اور انکار کردے ۔

ایک اہم نکتہ

ایمان اور اجتماعی وابستگیاں : زیر نظر آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کس طرح یہود و نصاریٰ میں سے سچے مومنین کو " اہل کتاب " سے تعبیر کرہاہے اور جو لوگ اپنے تعصبات اور ہوا و ہوس کے تابع تھے انہیں " احزاب " قرار دے رہا ہے ۔ امر صدر اسلام اورپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و الہ وسلم کے ہم عصر یہود و نصاریٰ میں منحصر نہیں بلکہ حقیقی مومنین اور ایمان کے دعویداروں میں ہمیشہ یہی فرق رہا ہے کہ سچے مومنین فراین حق کے سامنے تسلیم محض ہوتے ہیں اور ان مین تفریق و تبعیض کے قائل نہیں ہوتے یعنی اپنی خواہش و رغبت کو ان کے تحت رکھتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے اہل کتاب اور اہل ایمان کا لقب سجتا ہے ۔

لیکن وہ کہ جو "نؤمن ببعض ونکفر ببعض" کا مصداق ہیں یعنی جو کچھ ان کی ذاتی سوچ ، رغبت اور ہوا ہوس سے ہم آہنگ ہے اسے قبول کرلیتے اور جو کچھ ایسا نہیں اس کا انکار کردیتے ہیں یا کچھ ان کے فائدے میں ہے اسے مان لیتے ہیں اور جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہے اس کا انکار کمردیتے ہیں وہ نہ حقیقی مسلمان ہیں اور نہ سچے مومن بلکہ وہ تو اجتماعی وابستگیاں رکھتے اور اپنے مقاصد دین میں تلاش کرتے ہیں اسی لئے تعلیمانِ اسلام اور احکام دین میں ہمیشہ تبعیض کے قائل ہوتے ہیں ۔

۱۔کیونکہ اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ " ما انزل الیک " " الکتاب" ہی ہو کیونکہ اس صورت میں دونوں قرآن کی طرف اشارہ ہیں حالانکہ قرینہ مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "الکتاب" سے مراد اور ہے اور " ماانزل الیک " سے مراد کچھ اور ہے ۔

آیات ۳۷،۳۸،۳۹،۴۰

۳۷۔﴿وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَمَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ

وَلَا وَاقٍ﴾۔

۳۸۔﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ

كِتَابٌ﴾۔

۳۹﴿يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾۔

۴۰۔﴿وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾۔

ترجمہ

۳۷۔ جس طرح (کہ ہم نے گزشتہ انبیاء کو آسمانی کتاب دی ہے) تجھ پر بھی واضح اور صریح فرمان نازل کیا ہے اور تیرے پاس آگاہی آجائے کہ بعد اگر ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو خدا کے سامنے کوئی تیری حمایت کرنے والا اور بچا نے والا نہیں ہوگا ۔

۳۸۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اور ان کی بیو.بیاں اور اولاد بھی تھی اور کوئی رسول حکم خدا کے بغیر(اپنی طرف سے)کوئی معجزہ نہیں لاسکتا تھا، ہر زمانہ ایک کتاب رکھتا ہے (او رہر کام کے لئے وقت مقرر ہے) ۔

۳۹۔ خدا جسے چاہتا ہے محو کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبات عطا کرتا ہے اور ام الکتاب اس کے پاس ہے ۔

۴۰۔ اور وہ بعض سزائیں کہ جن کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تجھے دکھائیں یا (ان سزاؤں کے آنے سے پہلے) ہم تجھے ماردیں تو ہر حالت میں تو فقط ابلاغ پر مامور ہے اور (ان کا)حساب ہمارے ذمہ ہے ۔

قطعی اور قابل ِتغیر حوادث

ان آیات میں بھی نبوت سے مربوط مسائل کا سلسلہ جاری ہے ۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : جیسے ہم نے اہل کتاب اور گزشتہ انبیاء پر آسمانی کتاب نازل کی ویسے ہی یہ قرآن بھی تم پر نازل کیا ہے اس حالت میں کہ یہ واضح و آشکار احکام پر مشتمل ہے ﴿وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا﴾۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے " عربی" فصیح اور واضح گفتگو کے معنی میں ہے :

الفصیح البین من الکلام

لہذا جس وقت کہا جاتا ہے: " امرأة روبة" تو اس کا مفہوم ہے: " جو عورت اپنی عفت و پاکدامنی سے آگاہ ہو"۔

اس کے بعد راغب مزید کہتا ہے: قوله حكماًعربياً قيل معناه مفصحاً يحق الحق ويبطل الباطل

یہ جو خدا نے فرمایا ہے " حکماً عربیاً" اس کا مفہوم ہے ایسی واضح اور آشکار گفتگو جو حق کو ثابت کرتی ہے اور باطل کا بطلان کرتی ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "عربی" یہاں "شریف" کے معنی میں ہے کیونکہ لغت میں یہ لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے۔ اس طرح اس صفت سے قرآن کی توصیف مراد یہ ہے کہ اس کے احکام واضح و آشکار ہیں اور اسے غلط فائدہ اٹھانے اور مختلف تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے اس تعبیر کے بعد دیگر آیات میں استقامت، ٹیڑھا پن نہ ہونے اوری اعلم و آگہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ زمر کی آیت ۲۸ میں ہے: ﴿قرانا عربياً غير ذى عوج﴾

یہ آشکار قرآن ہے کہ جو ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھ پن سے پاک ہے۔

سورہ حم سجدہ کی آیہ ۳ میں ہے: ﴿كتاب فصلت اياته قراناً عربياً لقوم يعلمون﴾

یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی آیات تشریح شدہ ہیں اور یہ ان کے لئے واضح و آشکار قرآن ہے کہ جو جاننا چاہے۔

اس طرح اس آیت میں قبل اور بعد کا جملہ تائید کرتا ہے کہ " عربیت" سے مراد بیان کا واضح، روشن اور پیچ و خم سے خالی ہونا چاہے۔

یہ تعبیر قرآن کی سات سورتوں میں آئی ہے لیکن چند ایک مواقع پر " لسان عربی مبین" اور اس قسم کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی اسی معنی یعنی بیان کا روشن، واضح اور ابہام سے خالی ہونا، میں ہو۔

البتہ اس خاص موقع پر ہوسکتا ہے عربی زبان کی طرف اشارہ ہو کیونکہ خدا ہر نبی کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں مبعوث کرتا تھا تاکہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کو ہدایت کرے اس کے بعد اس انقلاب کا دامن دوسری جگہوں تک پھیلائے۔

اس کے بعد تہدید آمیز اور قاطع لہجے میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب تک حقیقت تجھ پر آشکار ہوجائے تو اس کے بعد اگر تو ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو تمہیں خدائی عذاب کے ذریعے سزا ہو گی ﴿وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَائَهُمْ بَعْدَمَا جَائَكَ مِنْ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنْ اللهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلاَوَاقٍ﴾۔

پیغمبر اکرم کے مقام عصمت ، معرفت اور علم و آگہی کی وجہ سے اگر چہ ان کے لئے انحراف کا احتمال یقینا نہیں ہے لیکن یہ الفاظ اولاً تو واضح کرتے ہیں کہ خدا کسی شخص کے ساتھ خصوصی ارتباط نہیں رکھتا بالفاظ دیگر اس کی کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر پیغمبر کا مقام بلند و بالا ہے تو ان کی تسلیم و عبودیت اور ایمان و استقامت کی بناء پر ہے ۔

ثانیاً یہ بات دوسروں کے لئے تاکید ہے کہ جہاں پیغمبر جیسی ہستی راہِ حق سے انحراف اور باطل راستے کی طرف میلان کی صورت میں خدائی سزا سے بچ نہیں سکتی تو پر دوسروں کی حیثیت واضح ہے ۔

یہ بعینہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص اپنے اچھے اور نیک بیٹے کو مخاطب کر کے کہے ، اگر تو اپنا ہاتھ غلط کاریوں سے آلودہ کرے تو میں تجھے سزادوں گا تاکہ دوسروں کو اپنا حساب کتاب معلوم ہو جائے ۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ " ولی " سرپرستو محافظ) اور " واق " (نگہدار) اگرچہ معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں تاہم ان میں فرق یہ ہے کہ ایک مثبت پہلو کو بیان کرتا ہے اور دوسرا منفی پہلو کو ۔ ایک نصرت و مدد کرنے والے کے معنی میں ہے اور دوسرا دفاع اور حفاظت کرنے والے کے معنی میں ۔

بعد والی آیت در حقیقت ان مختلف اعتراضات ک اجواب ہے کہ جو دشمن آپ کر کرتے تھے ۔ ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر نوعِ بشر میں سے ہو اور اس کی بیوی اور بچے ہوں تو مندرجہ بالا آیت انہیں جواب دیتے ہوئے کہتی ہے : یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہم نے تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں ۔ ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً﴾[۱]۔

ان کے اعتراض سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو تاریخِ انبیاء سے نا واقف تھے یا اپنے آپ کو نادانی او رجہالت میں رکھے ہوئے تھے ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے ۔

دوسرا یہ کہ انہیں توقع تھی کہ وہ جو معجزہ بھی تجویز کریں اور جو بھی ان کی خواہشات کا تقاضا ہو آپ اسے انجام دیں (چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں) لیکن انہیں جاننا چاہیئے کہ "کوئی رسول حکمِ خدا کے بغیر کوئی معجزہ پیش نہیں کرسکتا " ﴿وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ ﴾۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ پیغمبر اسلام کیوں آئے ہیں اور انہوں نے تورات یا انجیل کے احکام کو کیوں تبدیل کردیا ہے، کیا یہ آسمانی کتاب نہیں ہیں اور خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اپنا حکم تبدیل کردے؟ (یہ اعتراض خصوصاً اس امر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کہ یہودی نسخِ احکام کے ناممکن ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے)۔

زیرِ نظر آیت اپنے آخری جملے میں انہیں جواب دیتی ہے: ہر زمانے کے لئے ایک حکم اور قانون مقرر ہوا ہے (تاکہ بشریت اپنے آخری بلوغ تک پہنچ جائے اور آخری حکم صادر ہو)﴿لِکُلِّ أَجَلٍ کِتَابٌ﴾۔

لہٰذا مقام تعجب نہیں کہ ایک دن وہ تورات نازل کرے، دوسرے دن انجیل نازل کرے اور پھر قرآن۔ کیونکہ تکاملِ حیات کے لئے مختلف اور گوناگون پوگراموں کی ضرورت ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لکل اجل کتاب" ان لوگوں ک اجواب ہو جو کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر سچ کہتا ہے تو پھر کیوں خدائی عذاب اس کے مخالف کا قلع قمع نہیں کرتا۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہے اور کوئی چیز حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے۔ سزا اور عذاب کا وقت بھی آپہنچے گا۔ [۲]

جو کچھ گزشتہ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے بعد والی آیت اس کے لئے تاکید و استدلال کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ ہر حادثے اور حکم کے لئے ایک معین زمانہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: ان الامور مرھونۃ باوقاتھا

اور اگر دیکھتے ہو کہ بعض آسمانی کتب دیگر کتب کی جگہ لیتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ " خدا جو چیز چاہتا ہے محو کردیتا ہے جیسے وہ اپنے ارادے اور حکمت کے تقاضے سے کچھ امر کا اثبات کرتا ہے نیز کتابِ اصلی اور ام الکتاب اس کے پاس ہے﴿یَمْحُوا اللهُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْکِتَابِ﴾۔ آخر میں مزید تاکید کے طور پر ان عذابوں کا ذکر ہے کہ پیغمبر جن کا وعدہ کرتے تھے اور وہ ان کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اعتراض کرتے تھے کہ تمہارے وعدے نے عملی شکل کیوں اختیار نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے: اور بعض امور کہ جن کا ہم نے وعدہ کررکھا ہے (یعنی تیری کامیابی، ان کی شکست، تیرے پیروکاروں کی رہائی اور ان کے پیروکاروں کی اسارت) ہم تجھے تیری زندگی میں دکھائیں یا ان وعدوں پر عمل در آمد سے پہلے تجھے اس دنیا سے لے جائیں تیری ذمہ داری بہر صورت پر عمل در آمد سے پہلے تجھے اس دنیا سے لے جائیں تیری ذمہ داری بہر صورت ابلاغ رسالت ہے اور ہماری ذمہ داری ان سے حساب لینا ہے ﴿وَإِنْ مَا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِی نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَإِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلَاغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ﴾۔

۱۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے لئے ایک شان نزول ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے پیغمبر اکرم کی ایک سے زیادہ ازواج ہونے پر اعتراض کیا تھا حالانکہ سورہ رعد مکی ہے اور مکہ میں تعداد ازواج کا معاملہ درپیش نہیں تھا۔

۲۔ البتہ اس معنی کے مطابق، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں تقدیم و تاخیر کا قائل ہونا پڑے گا اور یہ کہنا پرے گا کہ تقدیر میں "لکل کتاب اجل" تھا (غور کیجئے گا)۔

دو اہم نکات

۱۔لوح محو و اثبات اور ام الکتاب :

"﴿یمحو اللہ مایشاء ویثبت﴾" مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ انبیاء پر نزول معجزات یا آسمانی کتب کے نازل ہونے کے بارے میں آیا ہے لیکن اس میں ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے کہ جس کی طرف مختلف منابعِ اسلامی میں بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ تحقق موجودات اور عالم کے مختلف حوادث کے دو مرحلے ہیں ۔ ایک مرحلہ قطعیت ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا (مذکورہ بالا آیت میں " ام الکتاب " اسی کی طرف اشارہ ہے) ۔ دوسرا مرحلہ غیر قطعی ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ مشروط ہے کہ اس مرحلے میں تبدیلی ممکن ہے لہذا اسے مرحلہ محوو اثبات کہتے ہیں ۔

کبھی انہیں " لوح محفوظ " اور "لوح محو و اثبات" بھی کہا جاتا ہے ۔ گویا ان میں سے ایک لوح میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ بالکل محفوظ ہے لیکن دوسری میں ممکن ہے کوئی چیز لکھی جائے اور پھر محو ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری چیز لکھی جائے ۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ کبھی ایک حادثہ پر ہم اس کے ناقص اسباب کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں ۔ مثلاً زہر قاتل کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ انسان کو ختم کردے ، اسے نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص اسے کھائے گا مر جائے گا مگر اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ اس زہر کے لئے ایک " ضد زہر" بھی ہے اگر اس کے بعد اسے کھا لیا تو اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے (البتہ ممکن ہے ہم بے خبر تو نہ ہوں لیکن اس " ضد زہر" کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھیں) ۔

اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ حادثہ زہر کھانے سے موت، قطعی پہلو نہیں رکھتا یعنی اس مقام پر " لوحِ محو و اثبات " ہے کہ جس میں دوسرے حوادث پر نظر رکھتے ہوئے تغیر ممکن ہے لیکن اگر حادثے کو اس کی علتِ تامہ یعنی مقتضیٰ کے وجود، تمام شرائط کی موجودگی اور تمام موانع کے خاتمے کے ساتھ نظر میں رکھیں (مندرجہ بالا مثال میں زہر کھانے اور "ضد زہر" نہ کھانے کے ساتھ نظر میں رکھیں) تو پھر یہاں حادثہ قطعی ہے اور اصطلاح کے مطابق اس کی جگہ لوح محفوظ اور ام الکتاب میں ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا ۔

یہ بات ایک اور طرح سے بیان کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ خدا کے علم کے دو مرحلے ہیں ۔ " مقتضیات اور عللِ ناقصہ کا علم " اور "علل تامہ کا علم " جو دوسرے مرحلے سے مربوط ہے اسے علم الکتاب اور لوح محفوظ کہا جاتا ہے او

رجو پہلے مرحلے سے مربوط ہے اسے لوح محو و اثبات سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ آسمان کے کسی گوشے میں کوئی لوح اور تختی نہیں رکھی ہوئی کہ جس پر کوئی چیز لکھی جاتی ہو یا مٹا کر اس پر دوسری چیز لکھی جاتی ہو۔

یہاں سے منابع اسلامی کے مطالعہ سے سامنے آنے والے بہت سے سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے کیونکہ کبھی کبھی روایات یا بعض قرآنی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں کام فلاں نتیجے کا سبب بنتا ہے لیکن ہم بعض اوقات اس میں ایسا نتیجہ نہیں دیکھے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس نتیجہ کا حصول بعض شرائط یا موانع کا حامل ہوتا ہے کہ جو شرط پوری نہ ہونے یا رکاوٹ دور نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتا۔

نیز بہت سی روایات کہ جو لوحِ محفوظ، لوح محو و اثبات اور انبیاء و آئمہ علیہم السلام کے علم کے بارے میں ہیں ان کا مفہوم اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند روایات ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

۱) امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں رسول اللہ سے سوال کیا تو حضور نے فرمایا:

لا قرن عینیک بتفسیر ھا ولاقرن عین امتی بعدی بتفسیر ھا، الصدقة علی وجھھا وبر الوالدین و اصطناع المعروف یحول الشقاء سعادة، ویزید فی العمر، وقی مصادع السوء۔

اس آیت کی تفسیر میں تیری آنکھوں کو روشن کرونگا اور اسی طرح اپنے بعد اپنی امت کی آنکھوں کو ضرورت مندوں کی صحیح طریقے سے مدد کرنا۔ ماں باپ سے نیکی کرنا اور اچھے کام انجام دینا شقاوقت کو سعادت میں دیتا بدل ہے، زدگی کو طولانی کردیتا ہے اور خطرات سے بچاتا ہے۔ (المیزان جلد ۱۱ ص ۴۱۹)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سعادت و شقاوت کو حتمی اور ناقابل تغیر امر نہیں۔ یہاں تک کہ اگر انسان نے ایسے اعمال انجام دیئے ہوں کہ جن کی وجہ سے بدبختیوں کی صف میں شامل ہو تو وہ اپنی جگہ تبدیل کرکے اور نیکیوں کا رخ کرکے خصوصاً مخلوق خدا کی مدد اور خدمت کرکے اپنی سرنوشت کو بدل سکتا ہے کیونکہ ان امور کا مقام لوحِ محو و اثبات ہے نہ کہ ام الکتاب۔ توجہ رہے کہ جو کچھ مندرجہ حدیث میں آیا ہے وہ مفہوم آیت کا ایک حصہ ہے کہ ایک مثال کے طور پر بیان ہوا ہے۔

۲) امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من الامور محتومة کائنة لامھالة، ومن الامور امور موقوفة عند اللہ ، یقدم فیھا مایشاء و یمحو مایشاء ویثبت منھا مایشاء

کچھ امور حوادث حتمی ہیں کہ جو یقینا رونما ہوتے ہیں اور بعض خدا کے ہاں کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں وہ جس میں مصلحت دیکھتا ہے اسے مقدم کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبت کردیتا ہے۔ (المیزان جلد ۱۱ ص ۴۱۹)۔

نیز مرقوم ہے کہ امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرماکرتے تھے:

الولایة فی کتاب الله لحدثتکم بما کان مایکون الیٰ یوم القیامة ، فقلت له أیة فقال قال الله: یمحوا الله مایشاء و عنده ام الکتاب

اگر قرآن میں ایک حدیث نہ ہوتی تو میں گزشتہ اور آئندہ قیامت تک حوادث کی تمہیں خبر دیتا۔

راوی حدیث کہتا ہے: میں نے عرض کیا کہ کونسی آیت ہے تو فرمایا:

خدا فرماتا ہے: ﴿یمحو ا الله مایشاء و یثبت و عند ہ ام الکتاب﴾ (نور الثقلین، جلد ۲ ص ۵۱۲)۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مختلف حوادث کے متعلق دین کے عظیم راہبروں کے کم از کم کچھ علوم لوح محو و اثبات سے مربوط ہیں اور لوح محفوظ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اسے مخصوص ہے اور وہ اس کے کچھ حصے کی کہ جو میں مصلحت سمجھتا ہے اپنے خاص بندون کو تعلیم دے دیتا ہے۔

و ان کنت من الاشقیاء فامحنی من الاشقاءء و اکتبنی من السعدائ

اگر شقاوت مندوں میں سے ہوں تو ان میں سے خذف کر کے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دے (یعنی مجھے اس کام کی توفیق دے)۔

بہر حال جیسا کہ کہا جا چکا ہے محو و اثبات کا ایک جامع مفہوم ہے۔ شرائط کی تبدیلی اور موانع کی موجودگی کے زیر اثر اس میں ہر قسم کی تبدیلی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے کسی خاص مصداق کی نشاندہی کی ہے مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ یہ توبہ کے زیر اثر گناہوں کے محو ہونے یا حالات بدلنے سے روزی کم یا زیادہ ہونے یا اس قسم کے امور کی طرف اشارہ ہے ان میں سے ہر بات اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب مراد ایک مصداق بیان کرنا ہو۔

۲۔ بداء کیا ہے؟ شیعہ اور سنی میں جو ایک پیچیدہ بحث پیدا ہو گئی ہے وہ مسئلہ "بداء" کے بارے میں ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیروں میں زیر بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے:۔

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے لئے "بدا" جائز ہے اور ان کے نزدیک بدا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص ایک چیز کا معتقد ہو پر پھر ظاہر ہو جائے کہ حقیقت اس کے اعتقاد کے برخلاف ہے اور یہ بات ثابت کرنے کے لئے انہوں نے "یمحوا الله مایشاء و یثبت" کی آیت کا سہارا لیا ہے۔

فخر رازی مزید کہتا ہے :

یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ علمِ خدا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے اور جو ایسا ہو اس میں تغیر و تبدل محال ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسئلہ بدا کے بارے میں شیعہ عقیدہ سے عدم آگاہی اور لاعلمی کے سبب بہت سے اہل سنت بھائیوں نے شیعوں کی طرف ایسی ناروا نسبتیں دی ہیں ۔ اس کی وضاحت یہ ہے :

لغت میں لفظ "بداء" آشکار ہونے اور پوری طرح واضح ہونے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ پشیمانی کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ جو شخص پشیمان ہوتا ہے یقینا اسے کوئی نئی چیز پیش آتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ اس معنیٰ کے لحاظ سے خدا کے بارے میں بداء کا کوئی مفہوم نہیں اور ممکن نہیں ۔ اور کسی عقلمند اور دانا کے لئے ممکن نہیں کہ اسے یہ احتمال ہو کہ کوئی مطلب خدا سے پوشیدہ ہوتا ہے اور پھر وقت گزرنے سے اس پر آشکار ہوجاتا ہے ۔ اصولی طور پر یہ بات صریح کفر ہے اور کھٹکنے والی ہے ۔ اس بات کا لازمی مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذاتِ پاک کی طرف جہالت کی نسبت دی جائے اور اس کی ذات کو محل تغیر اور محل حوادث سمجھا جائے حاشا و کل شیعہ امامیہ ذات پروردگار اور خدائے لایزال کے بارے میں ایسا احتمال ہر گز نہیں رکھتے ۔

جس میں شیعہ کا بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں اور جس کے مطابق روایاتِ اہل بیت میں آیا ہے کہ

ماعرف الله حق معرفته من لم يعرفه بالبداء

وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم علل و اسباب کے ظواہر کے مطابق محسوس کرتے ہیں کہ ایک واقعہ وقوع پذیر ہو گا یا کسی پیغمبر کو ایسا واقعہ پیش آنے کی خبر دی گئی حالانکہ ہم بعد میں دیکھتے ہیں ایسا واقع نہیں ہوا تو اس موقع پر ہم کہتے ہیں کہ " بداء" واقع ہوا ہے یعنی جس امر کو ہم واقع شدہ سمجھتے تھے اور اس کے رونما ہونے کو یقینی جانتے تھے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

اس بات کی بنیاد اور اصلی علم وہی ہے جو گزشتہ بحث میں بیان ہوچکی ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ہماری آگاہی کا تعلق صرف علل ناقصہ سے ہوتا ہے اور ہم شرائط و موانع نہیں دیکھ پاتے اور ہم اس کے مطابق فیصلہ کردیتے ہیں اور اس کے بعد جب شرط کے فقدان یا مانع کے وجود سے سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس کی ہم توقع کررہے ہوتے ہیں اس کے خلاف واقع ہو جاتا ہے تو ہم ان کے مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

اسی طرح کبھی امام پیغمبر یا امام لوح پیغمبر یا امام لوح محو و اثبات سے آگاہی حاصل کرلیتے ہیں جب کہ یہ طبعاً قابل تغیر ہے اور پھر موانع پیش آنے اور شرائط مفقود ہونے کی بناء پر اس طرح رونما نہیں ہوتا۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے "نسخ "اور "بداء "کا آپس میں موازنہ کرنا چاہیئے۔ ہم جانتے ہیں کہ تما مسلمانوں کے نزدیک نسخ احکام جائز ہے۔ یعنی ممکن ہے ایک حکم شریعت میں نازل ہو اور لوگ سمجھیں کہ یہ ابدی حکم ہے لیکن پھر وہ ذات پیغمبر کے ذریعے منسوخ قرار پاجائے اور اس کی جگہ دوسرا آجائے (جیسے ہم نے تفسیر، فقہ اور حدیث میں قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں پڑھا ہے)۔

یہ درحقیقت "بداء "کی ایک قسم ہے لیکن عام طور پر امور تشریعی اور احکام و قوانین میں اسے نسخ کہتے ہیں اور مور تکوینی میں بداء ایک قسم کا نسخ ہے۔ کیا کوئی شخص ایسے منطقی امر کا انکار کرسکتا ہے سوائے ایسے شخص کے جو علت تامہ اور علت ناقصہ کے درمیان فرق نہ کر سکے یا یہ کہ وہ شیعیانِ اہل بیت کے خلاف ہونے والے منحوس پراپیگنڈا کا شکار ہو جائے اور اس کا تعصب اسے اجازت نہ دے کہ شیعہ عقائد کا مطالعہ خود ان کی کتب سے کرے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر الدین رازی نے "یمحو اللہ مایشاء اللہ ویثبت" کے ذیل میں بداء کے بارے میں شیعوں کے عقیدے کی بات تو کی لیکن اس نے اس مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ بداء اسی "محو و اثبات" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے تو اپنے مخصوص تعصب کی بناء پر شیعوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بداء کے قائل کیوں نہیں

۔

اجازت دیجئے کہ مسئلہ بداء کے کے بارے میں چند ایسے نمونے پیش کئے جائیں کہ جنہیں سب کے قبول کیا ہے۔

۱) حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ ان کی قوم کی نافرمانی سبب بنی کہ عذاب الٰہی ان کی طرف آئے اور اس عظیم پیغمبر نے بھی چونکہ انہیں قابل ہدایت نہ سمجھا اور انہیں مستحق عذاب جانا تو انہیں چھوڑ کر چلے گئے لیکن اچانک "بداء واقع ہوا" اس قوم کے ایک عالم نے جب آثار عذاب دیکھے تو انہیں جمع کیا اور توبہ کی دعوت دی۔ سب نے بات مان لی اور وہ عذاب کہ جس کی نشانیاں ظاہر ہو چکی تھیں ٹل گیا۔

﴿فلولا کانت قریة أمنت فنعھا ایمانھا الاقوم یونس لما أمنوا کشفنا عنھم عذاب الخزی فی الحیٰوة الدنیا و متعناھم الیٰ حین﴾۔ (یونس۔ ۹۸)۔

۲) اسلامی تواریخ میں ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے ایک دلہن کے بارے میں خبر دی کہ وہ اسی شب زفاف مرجائے گی لیکن وہ آپ کی پیش گوئی کے بر خلاف زندہ رہی جب آپ سے ماجرا پوچھا گیا تو فرمایا:

کیا تم نے اس سلسلہ میں کوئی صدقہ دیا ہے۔

انہوں نے کہا:

جی ہاں

تو آپ نے فرمایا:

صدقہ حتمی بلاؤں کو دور کردیتا ہے۔[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے در حقیقت لوحِ محو و اثبات سے ارتباط کی وجہ سے ایسے واقعہ کے رونما ہونے کی خبر دی تھی حالانکہ یہ واقعہ مشروط تھا (شرط یہ تھی کہ اس میں صدقہ کی طرح کوئی مانع پیدا نہ ہوگیا ہو تو نتیجہ کوئی اور نکل آیا۔

۳) بہادربت شکن ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہ اسماعیل کو ذبح کرنے پر مامور ہوئے اور اس ماموریت کے بعدبیٹے کو قربان گاہ میں لے گئے لیکن جب انہوں نے ثابت کردیا کہ میں پوری طرح آمادہ ہو تو بداء واقع ہو گیا اور واضح ہوگیا کہ یہ ایک امتحان تھا اس عظیم پیغمبر اور انکے فرزند ارجمند کی اطاعت و تسلیم کو آزمایا جائے۔

۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ پہلے وہ مامور ہوئے کہ اپنی قوم سے تیس دن تک علیحدہ رہیں اور احکام تورات حاصل کرنے کے لئے خدائی وعدہ گاہ کی طرف جائیں لیکن پھر (بنی اسرائیل کی آزمائش کے لئے) اس مدت کو دس دن بڑھا دیا گیا۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بداء کے ایسے واقعات کا کیا فائدہ؟

اس سوال کا جواب ان کے امور میں توجہ کرنے سے ظاہراً مشکل نہیں رہتا جن کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات اہم مسائل مثلاً کسی شخص کی آزمائش، کسی قوم کا امتحان، توبہ اور خدائی بازگشت (جیسے داستان یونس میں آیا ہے)صدقہ، حاجتمندوں کی مدد اور نیک کاموں کے زیر اثر دردناک برطرف ہو جاتے ہیں۔ ایسے ماور تقاضا کرتے ہیں کہ آئندہ کے واقعات پہلے اس طرح سے منظم ہوں اور پھر شرائط و حالات بدلنے سے وہ بھی بدل جائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کی سرنوشت خود انہی کے ہاتھ ہے اور روش کی تبدیلی سے وہ اپنی تقدیر بدلنے پر قادر ہیں اور یہ بداء کے ساتھ نہیں پہچانا وہ اس کی پوری معرفت نہیں رکھتا، یہ بھی انہی حقائق کی طرف اشارہ ہے اسی لئے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

مابعث الله عزوجل نبیاً حتی یأخذ علیه ثلاث خصال الاقرار بالعبودية وخلع الانداد، و ان اله یقدم ما یشاء و یؤخر مایشاء

خدا نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس سے یہ تین پیمان لیے ۔ پروردگار کی بندگی کا اقرار، ہر قسم کے شرک کی نفی اور یہ کہ خدا جس چیز کو چاہتا ہے مقدم کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے موخر کرتا ہے ۔ [۲]

حقیقت میں پہلا پیمان خدا کی اطاعت اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے مربوط ہے دوسرا عہد شرک کے خلاف قیام کرنے سے متعلق ہے اور تیسرا مسئلہ بداء سے مربوط ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ حالات تبدیل کرکے اپنے آپ کو لطف ِ الٰہی یا عذاب ِ خدا کا حقدار بنا لیتا ہے ۔

آخری بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا پہلوؤں کی بناء پر علماء شیعہ نے کہا ہے کہ جب "بداء" کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو یہ "ابداء" کے معنی میں ہوتی ہے یعنی کسی ایسی چیز کو ظاہر کردیتا ہے جو پہلے ظاہر نہ ہو اور جس پیشین گوئی نہ کی جاسکتی ہو۔

لیکن شیعوں کی طرف یہ نسبت دینا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کبھی کبھی اپنے کام پر پشیمان ہوجاتا ہے یا کسی ایسی چیز سے باخبر ہو جاتا ہے کہ جس سے پہلے آگاہ نہ ہو یہ بہت بڑی زیادتی ہے اور ایسی تہمت ہے جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

اسی لئے آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

من زعم ان اللہ عزوجل یبد ولہ فی شیء لم یعلمہ امس فابرؤا منہ

جو شخص یہ گمان کرے کہ خدا پر کوئی ایسی چیز آج آشکار ہوتی ہے جسے وہ کل نہیں جانتا تھا تو ایسے شخص سے بیزاری اختیار کرو۔ [۳]

۱۔ بحار الانوار چاپ قدیم، جلد ۲ ص ۱۳۱ از امالی صدوق۔

۲۔ اصول کافی، جلد ۱ ص ۱۱۴، سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۶۱۔

۳۔ سفینۃ البحار جلد ۶۱۔

آیات ۴۳،۴۲،۴۱

۴۱۔ ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِى الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لاَمُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾۔

۴۲۔ ﴿وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ﴾

۴۳۔ ﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِى وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾۔

ترجمہ

۴۱۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ہم ہمیشہ زمین کے اطراف (وجوانب) کو کم کررہتے ہیں (معاشرے، تمدن اور علماء تدیجاً ختم ہوتے رہتے ہیں) اور خدا حکومت کرتا ہے اور کسی شخص کو اسے روکنے یا اس کے احکام رد کرنے کا یارا نہیں اور وہ سریع الحساب ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے ان سے پہلے سازشیں کیں اور منصوبے بنائے لیکن منصوبہ بنانا تو خدا کا کام ہے کہ جو ہر شخص کے کام سے آگاہ ہے اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ دوسرے گھر میں (نیک و بد) انجام کس کا ہے۔

۴۳۔ جو کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ رو رسول نہیں ہے۔ کہہ دے کہ خدا اور وہ لوگ کہ جن کے پاس علم کتاب (اور قرآن کی آگاہی) ہے (میری ۹ گواہی کے لئے کافی ہیں۔

انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں، خدا باقی رہتا ہے

گزشتہ آیات میں روئے سخن رسول اللہ کی رسالت کے منکرین کی طرف تھا۔ ان آیات میں اس بحث کو جاری رکھا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انہیں تنبیہ کی جائے، انہیں بیدار کیا جائے، ان کے سامنے استدلال کیا جائے الغرض مختلف طریقوں سے انہیں عقلی راہ پر لگا کر غور و فکر کرنے اور پھر اپنی حالت کی اصلاح کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان مغرور اور ہٹ دھرم افراد نے دیکھا نہیں کہ ہم مسلسل زمین کے اطراف و جوانب کو کم کرتے رہتے ہیں ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِى الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا﴾۔

واضح ہے کہ زمین سے یہاں مراد اہل زمین ہیں۔ یعنی کیا وہ اس واقعیت کی طرف نگاہ نہیں کرتے کہ ہمیشہ اقوام، تمدن اور حکومتیں زوال پذیر ہوتی ہیں۔ وہ قومیں کہ جو ان سے زیادہ قوی تھیں، زیادہ طاقتور تھیں اور زیادہ سرکش تھیں، ان سب نے اپنے منہ مٹی میں چھپا لئے۔ یہاں تک کہ علماء بزرگ اور دانشور کہ جو زمین کا سہارا تھے انہوں نے بھی

اس جہان سے آنکھیں بند کرلیں اور ابدایت کے ساتھ وابستہ ہو گئے ۔ کیا یہ ہمہ گیر قانونِ حیات کہ جو تمام افراد، تمام انسانی معاشروں اور ہر چھوٹے بڑے پر جاری و ساری ہے ان کے بیدار ہونے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ اس چند روزہ زندگی کو ابدی نہ سمجھیں اور اسے غفلت میں نہ گزاردیں ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: حکومت اور فرمان جار کرنا خدا کے لئے ہے اور کسی شخص میں اس کے فرمان کو رف کرنے اور سے روکنے کا یارا نہیں ہے ﴿وَاللهُ یَحْکُمُ لاَمُعَقِّبَ لِحُکْمِه﴾ ۔ اور وہ سریع الحساب ہے ﴿وَهُوَ سَرِیعُ الْحِسَابِ ﴾ ۔

اس بناء پر ایک طرف تو اس نے تمام افراد اور سب قوموں کو پشیمانی پر قانونِ فنا رقم کردیا ہے اور دوسری طرف کسی کی مجال نہیں کہ اس فرمان کو یا خدا کے دوسرے فرامین کو بدل سکے اور تیسری طرف وہ بندوں سے بڑی تیزی سے حساب لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی جزاء قطعی ہے ۔

کئی ایک روایات کو جو تفسیر برہان، نور ثقلین، دیگر تفاسیر اور کتب حدیث میں آئی ہیں ان میں زیر نظر آیت کی تفسیر علماء اور دانشمند بیان کی گئی ہے کیونکہ ان کا فقدان زمین اور اسلامی معاشرے کی کمی اور نقصان کا سبب بنتا ہے ۔

مفسرِ بزرگ طبرسی اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں :

ننقصها بذهاب علمائها ، وفقهائها و خیارها

ہم زمین میں اس کے علماء فقہا او رنیک لوگوں کے لئے چلے جانے سے کمی واقع کریں گے ۔ (۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام شہید ہوئے تو عبد اللہ بن عمر نے یہ آیت پڑھی: انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها

اس کے بعد کہا: یا امیر المومنین لقد کنت الطرف الاکبر فی العلم ، الیوم نقص علم الاسلام و مضی رکن الایمان

اے امیر المومنین آپ عالمِ انسانیت میں علم انسانیت میں علم کی بہت بڑی "طرف" تھے ۔ آپ شہادت سے آج اسلام کا علم و دانش نقصان کی طرف جھک گیا اور ایمان کا ستون گرگیا ۔ (۲)

باقی رہا یہ کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ زمین کے نقصان سے مراد کفار کی زمینوں کا کم ہونا اور مسلمان علاقوں میں اضافہ ہونا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت تو ایسی فتوحات نہیں تھیں کہ کفار جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور قرآن ان کی طرف اشارہ کرتا ۔ نیز یہ جو بعض مفسرین

کہ جوعلوم طبیعی میں مستغرق ہیں وہ زیر نظر آیت کو قطبین کی طرف سے زمین کے کم ہونے اور استوائی جانب سے زیادہ ابھرنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ قرآن کی زیر نظر آیت میں یہ چیز بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: صرف یہی گروہ نہیں کہ جو سازشوں اور مکرو فریب کے ساتھ تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ " ان سے پہلے والے بھی سازشیں اور مکاریں کیا کرتے تھے"﴿وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾۔

لیکن ان کے منصوبے نقش بر آب ہو گئے اور ان کی سازشیں حکم خدا سے بے اثر ہو کر رہ گئیں کیونکہ وہ ہر شخص کے معاملات خود اس سے بہتر جانتا ہے نکہ "تمام منصوبے خدا کے لئے ہیں"﴿فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا﴾۔وہ ہے کہ جو ہر شخص کے کسب و کار سے آگاہ ہے اور"وہ جانتا ہے کہ ہر شخص کیا انجام دیتا ہے"﴿يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ﴾۔

اور پھر تہدید کے لہجے میں انہیں ان کے انجام کار سے ڈرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کفار بہت ہی جلد جالیں گے کہ انجام کار اور نیک و بد عاقبت دوسرے جہان میں کس کس کے لئے ہے﴿وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ﴾۔

جس طرح سے یہ سورت قرآن اور کتاب اللہ کے ذکر سے شروع ہوئی تھی اسی طرح زیر بحث آخری آیت میں قرآن کے معجزہ ہونے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اسی پر سورہ رعد ختم ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا﴾)

یہ لوگ ہر روز ایک نیا بہانہ تراشتے ہیں، ہر وقت معجزہ کا تقاضا کرتے ہیں اور پھر بھی آخر کار کہتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے

۔

ان کے جواب میں کہو: یہی کافی ہے کہ دو ہستیاں میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہیں ایک اللہ اور دوسرا وہ کہ جس کے پاس کتاب کا علم اور قرآن کی آگاہی موجود ہے﴿قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾۔ایک تو خود خدا جانتا ہے میں اس کا بھیجا ہوا ہوں اور دوسرے وہ لوگ کہ جو میری اس آسمانی کتاب یعنی قرآن کے بارے میں کافی آگھی رکھتے ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی دماغ کی ساختہ نہیں ہے خدائے بزرگ کے سوا یہ کسی اور کی ہو، یہ بھی مختلف پہلوؤں سے قرآن کے اعجاز ہونے کے بارے میں ایک تاکید ہے۔اس کی تفصیل ہم دیگر خصوصا کتاب،، قرآن و آخرین پیامبر میں بیان کرچکے ہیں۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی بنا پر﴿ومن عندہ علم الکتاب﴾سے مراد مضامین قرآن مجید سے آگاہ افراد ہیں

۔

لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء کی طرف اشارہ ہے۔بہت سی روایات میں آیا ہے(من عندہ علم الکتاب)سے مراد حضرت علی بن ابی طالب اور دیگر ائمہ ھدی مراد ہیں ۔

اس سلسلے کی روایات تفسیر نور الثقلین اور تفسیر برہان می جمع کردی گئی ہیں لیکن یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں کہ مفہوم آیت اسی پر منحصر نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ ایک مصداق یا مصادیق تامہ وکاملہ کی طرف اشارہ ہیں ۔بہر حال یہ روایات پہلی تفسیر کہ جسے ہم نے انتخاب کیا ہے کی تایید کرتی ہیں ۔ناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو پیغمبر اکرم سے منقول ایک رواے ت پر ختم کریں

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر گرامی سے ،،قال الذی عندہ علم من الکتاب،،اس شخص نے کہا کہ جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا (یہ آیت حضرت سلیمان کے واقعہ کے ضمن میں ہے)

کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:ذاک وصی اخی سلیمان بن داود

وہ میرے بھائی سلیمان بن داوود کا وصی اور جانشین تھا ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا :،،﴿قل کفی باللہ شھیدا بینی وبینکم ومن عندہ علم الکتاب﴾،،کس کے بارے میں ہے اور کس طرف اشارہ ہے رسول اللہ نے فرمایا :ذاک اخی علی بن ابی طالب

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں ۔(المیزان ج،۱۱ص۴۲۷)

پروردگارا! اپنی رحمت کے دروازے ہم پر کھول دے اور اپنی کتاب کا علم ہم پر ارزانی فرما ۔

بارالھا!قرآن کی آگہی سے ہمارے دل اس طرح سے روشن اور ہماری فکر کو ایسا توانا بنا ہم تجھے چھوڑ کر تےرے غےر کی طرف نہ جائیں ،کسی چیز کو تیری مشیت پر مقدم نہ کریں ،خودغرضیوں ،تنگ نظریوں اور خود بینیوں کے تنگ وتاریک گڑھوں میں نہ گریں ،تےرے بندوں کے درمیان تفرقہ نہ ڈالیں ،اپنے اسلامی انقلاب کو خطرے کی طرف کھینچ نہ لے جائیں اور اسلام ،قرآن اور ملت اسلامی کی مصلحتوں کو ہر چیز پر مقدم رکھیں ۔

خداوندا! عراق کے ظالم حکام کو خواب غفلت سے بیدار کر کہ جنہوں نے یہ خانماں سوز، ویران گر اور تباہ کن جنگ دشمنان اسلام کی تحریک ہم پر مسلط کی ہے اور اگر وہ بیدار ہونے والے نہیں تو انہیں نابود فرما اور ہمیں اپنی کتاب کے زیر سایہ آگہی عطا فرما جس سے ہم حق وعدالت کے دشمنوں پر کامیابی کے لئے جائز اور تمام ممکنہ وسائل سے استفادہ کریں ۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۰۱۔

۲۔ البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے ۔ اس میں ہر قسم کا نقصان اور کمی شامل ہیں چاہے وہ افراد ہوں، یا معاشرے یا بطور کلی اہل زمین ۔ یہ تمام لوگوں کے لئے جرس بیداری ہے چاہے وہ نیک ہوں یا برے حتی کہ علماء اور دانشمندوں کے لئے بھی کہ جو انسانی معاشروں کے ستون ہیں جب کہ ان میں سے کبھی ایک کے چلے جانے سے پوری دنیا کو نقصان پہنچتا ہے ۔ یہ سب کے لئے بولتی ہوئی ہلادینے والی صدائے ہوشیار باش ہے ۔

سورہ ابراھیم

آیات ۳،۲،۱

﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

۱۔﴿الر کِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾۔

۲۔﴿اللهِ الَّذِی لَهُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَوَيْلٌ لِلْکَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ﴾۔

۳۔﴿الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا أُوْلَئِکَ فِی ضَلَالٍ بَعِيدٍ﴾۔

ترجمہ

رحمن و رحیم کے نام سے

۱۔ الر۔ یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر نازل کی تاکہ تو پروردگار نے فرمان سے لوگوں کو (شرک، ظلم اور طغیان کی)تاریکیوں سے نکال کر(ایمان، عدل اور صلح کی)کی روشنی کی طرف جائے، عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف۔

۲۔ وہی خدا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا ہے۔ کافروں کے لئے افسوس ناک ہے عذاب ِ شدید۔

۳۔ وہی کہ جو دنیا ی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راہِ حق کو ٹیڑھا کردیں اور دور کی گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

ظلمتوں سے نور کی طرف

یہ سورہ بھی قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی طرح حروف مقطعہ (آلمرٰ) سے شروع ہوئی ہے۔ ان حروف کی تفسیر ہم سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں بیان کرچکے ہیں۔یہاں نکتے کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں یہ کہ ۲۹ مقامات پر قرآن کی سورتوں کا آغاز حروف مقطعہ سے ہوا ہے۔ ان میں سے ۲۴ مقامات ایسے ہیں جن میں بلا فاصلہ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن اور حروف مقطعہ کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے اور ہوسکتا ہے یہ وہی تعلق ہو جس کا ذکر ہم سورہ بقرہ کی ابتداء میں کر چکے۔ وہ یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ اس سے واضح کرے کہ یہ عظیم

آسمانی کتاب اپنے با عظمت معانی و مفاہیم کہ جن کی بناء پر وہ تمام انسانوں کی ہدایت اپنے ذمہ لئے ہوئے ہے کہ با وجود اسی سادہ سے خام مال (الف ، باء) سے تشکیل پائی ہے اور یہ اس اعجاز کی اہمیت کی نشانی ہے کہ وہ سادہ ترین چیز سے افضل ترین چیز کو وجود بخشا ہے ۔

بہر حال الف ، لام، را ۔ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر اس لئے نازل کی کہ تو لوگوں کو گمراہیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے ۔ ﴿كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾۔

در حقیقت نزول قرآن کے تمام تربیتی ، انسانی ، روحانی اور مادی مقاصد اسی ایک جملے میں جمع ہیں ، "ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے جانا"۔ ظلم و جہالت سے نورِ علم کی طرف ، ظلمت ِ کفر سے نور ایمان کی طرف ، ظلمت ِ ظلم سے نور ِ عدالت کی ، فساد سے نورِ صلاح کی طرف ظلمتِ گناہ سے نورِ تقویٰ کی طرف اور ظلمت ِ افتراق سے نور وحدت کی طرف۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہاں " ظلمات " بعض دیگر قرآنی سورتوں کی طرح جمع کی شکل میں آیا ہے اور "نور" واحد کی صورت میں ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام نیکیاں ، پاکیزگیاں ، ایمان و تقویٰ او ر فضیلت نورِ توحید کے سائے میں اپنے آپ میں وحدت و یگانگی کی حالت میں ہیں اور سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور متحد ہیں اور ان سے ایک متحد و واحد معاشرہ، جو ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ کپڑے کی مانند ہو تیار کیا جاسکتا ہے ۔

لیکن ظلمت ہر مقام پر پراگندگی اور صفوں میں تفرقہ کا سبب ہے ۔ ستم گر ، بدکار، آلودہ گناہ اور منحرف لوگ عموماً اپنی انحرافی راہوں میں بھی وحدت نہیں رکھتے اور آپس میں حالت ِ جنگ میں ہوتے ہیں ۔

تمام نیکیوں کا سرچشمہ چونکہ خدا کی ذاتِ پاک اور ادراکِ توحید کی بنیادی شرط اسی حقیقت کی طرف توجہ ہے لہٰذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے: یہ سب کچھ ان (لوگوں) کے پروردگار کے اذن و حکم سے ہے ﴿ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ﴾۔ اس نور کے بارے میں مزید توضیح کے لئے فرمایا گیا ہے: عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف ﴿إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾۔[1]

وہ کہ جس کی عزت اس کی قدرت کی دلیل ہے کیونکہ کسی کے بس میں نہیں کہ اس پر غلبہ حاصل کر سکے اور اس کا حمید ہونا اس کی بے پایاں نعمات کی نشانی ہے کیونکہ حمد و ستائش ہمیشہ نعمتوں ، عنایتوں اور زیبائی پر ہوتی ہے ۔

اگلی آیت میں معرفت ِخدا کے لئے ایک درس ِ توحید دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہی خدا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسی ہے ﴿اللهِ الَّذِی لَهُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ﴾ ۔[2]

تمام چیزیں اس کی ہیں کیونکہ وہی موجودات کا خالق ہے، اسی بناء پر وہ قادر و عزیز بھی ہے، تمام نعمتیں بخشنے والا اور حمید بھی۔

ذکر مبداء کے بعد آیت کے آخر میں مسئلہ معاد کی جانب توجہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وائے ہو کفار پر قیامت کے شدید عذاب سے ﴿وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ﴾۔

اگلی آیت میں بلا فاصلہ کفار کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ان کی صفات کے تین حصوں کا ذکر کرکے ان کی کیفیت کو پوری طرح مشخص کردیا گیا ہے اس طرح سے کہ ہر شخص ان کا سامنا کرتے ہیں انہیں پہچان لے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اس جہان کی پست زندگی کو آخرت کی زندگی پر مقدم شمار کرتے ہیں ﴿الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ﴾۔(۳)

اسی وجہ سے وہ ایمان، حق، عدالت، ، شرفِ آزادگی اور سربلندی کہ جو آخرت سے لگاؤ رکھنے والوں کی خصوصیات میں سے ہیں اپنے گھٹیا مفادات، شہوات اور ہوا و ہوس پر قربان کردیتے ہیں

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ اسی پر بس نہیں بلکہ خود ہی میں پڑنے کے بعد دوسروں کو بھی بھٹکانے کی کوشش کرے ہیں اور "وہ لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں"۔ ﴿وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾۔

در حقیقت وہ اللہ کی راہ کہ جو راہِ فطرت ہے اور انسان خود سے چل کر اسے عبود کر سکتا ہے اس میں طرح طرح کی دیوار اٹھاتے ہیں اور رکاوٹیں کھری کرتے ہیں۔ اپنی ہوا و ہوس اور خواہشا کی بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں، لوگوں کو گناہ کا شوق دلاتے ہیں اور راستی و پاکیزگی کے راستے سے خوف زدہ کرتے ہیں۔

ان کا کام فقط اللہ کے راستے میں رکاوٹیں اور دیواریں کھڑی کرنا نہیں بلکہ "کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے اسے بگاڑ کر پیش کریں" ﴿وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا﴾۔

در اصل وہ پوری توانائیوں سے کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیں اور اپنا ہم مسلک بنا لیں لہذا ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کے سیدھے کو ٹیڑھا کر کے دکھائیں۔ اس لئے وہ اس میں طرح طرح کی خرافات اور بے ہودہ گیاں پیدا کرتے ہیں، مختلف تحریفات سے کام لیتے ہیں۔ قبیح بدعتوں کو رواج دیتے ہیں اور کثیف طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ "ان صفات و اعمال کے حامل ہونے کی وجہ سے ایسے افراد بہت دور کی گمراہی میں ہیں"

﴿أُوْلَئِکَ فِی ضَلاَلٍ بَعِیدٍ﴾ ۔یہ وہی لوگ ہیں کہ راہِ حق سے زیادہ دور ہونے کی بناء پر جن کا راہِ حق کی طرف لوٹ آنا آسانی سے ممکن نہیں لیکن یہ سب کچھ خود انہی کے اعمال کا نتیجہ ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور راہِ خدا کو نور سے تشبیہ دینا

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نور" عالم مادہ کا لطیف ترین موجود ہے ، اس کی رفتار نہایت تیز ہے اور جہانِ مادہ میں اس کے آثار و برکات ہر چیز سے زیادہ ہیں ، یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام مادی نعمات و برکات کا سرچشمہ نور ہے ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان اور راہِ خدا میں قدم رکھنے کو نور سے تشبیہ دینا کس قدر پر معنی ہے ۔

نور اتحاد کا سبب ہے اور ظلمت انتشار کا عامل ہے ۔ نور زندگی کی علامت ہے اور ظلمت موت کی نشانی ہے ۔ اسی بناء پر قرآنِ مجید میں بہت سے قیمتی امور کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے ۔

ان میں سے ایک عمل صالح ہے ۔یوم تری المومنین و المؤمنات یسعیٰ نور ھم بین ایدیھم و بایمانھم

وہ دن کہ جب تو صاحبِ ایمان مردو اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب رواں دواں ہو گا ۔ (حدید ۔ ۱۲) ۔

ایمان اور توحید کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے ۔ مثلاً

﴿الله ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الیٰ النور﴾

اللہ ان لوگوں کا ولی و سرپرست ہے جو ایمان لائے ہیں کہ جنہیں وہ ظلمتوں سے نور کی ہدایت کرتا ہے ۔ (بقرہ ۔ ۲۵۷)

قرآن کو بھی نور سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿فالذین اٰمنوا بہ و عزروہ و نصروہ و اتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون﴾

اور جو پیغمبر پر ایمان لائے ہیں ، اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں ، اس کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں کہ جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے ، وہ فلاح پانے والے ہیں ۔ (اعراف ۔ ۱۵۷)

نیز خدا کے آئین و دین کو اس پر برکت وجود سے تشبیہ دی گئی ہے :﴿یریدون ان یطفؤا نور الله بافواھھم﴾

وہ چاہتے ہیں کہ پھونکوں سے نور خدا کا خاموش کردیں ۔ (توبہ ۔ ۳۲)

اور سب سے بڑھ کر خدا کی ذات پاک کہ جو افضل ترین وجود ہے بلکہ سب کی ہستی جس کے وجودِ مقدس کا پرتو ہے کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اللہ نور السمٰوٰت و الارض﴾

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے ۔ (نور۔۳۵)

یہ تمام امور ایک ہی حقیقت کی طرف پلٹ تے ہیں کیونکہ یہ سب اللہ ، اس پر ایمان ، اس کی گفتگو اور اس کی راہ کے پرتو ہیں ۔ لہٰذا یہ لفظ ان مواقع پر مفرد کی شکل میں آیا ہے ۔ جب کہ اس کے بر عک "ظلمات" چونکہ ہر جگہ انتشار و تفرقہ کا عامل ہے لہٰذا جمع کی صورت میں تعدد و تکثر کی علامت کے طور پر ذکر ہوا ہے اور خدا پر ایمان لانا ، اس کی راہ میں قدم رکھنا چونکہ حرکت بیداری کا سبب ہے ، اجتماعیت و وحدت کا عامل ہے اور ارتقاء و پیش رفت کا ذریعہ ہے لہٰذا یہ تشبیہ ہر لحاظ سے رسا ، با معنی اور باعث تربیت ہے ۔

۲۔ "لتخرج" کا مفہوم:

پہلی آیت میں "لتخرج" کی تعبیر در حقیقت دو نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ قرآن مجید اگر انسان کے لئے ہدایت و نجات کی کتاب ہے تا ہم اسے اجراء و نفاذ کرنے والے اور علمی صورت بخشنے والے کی احتیاج ہے لہٰذا پیغمبر جیسے راہبر کی ضرورت ہے جو اس کے ذریعے راہ حقیقت سے بھٹکے ہوؤں کی بد بختی کی ظلمات سے نورِ سعادت کی طرف ہدایت کرے ۔ لہٰذا قرآن بھی اپنی اس قدر عظمت کے باوجود رہبر ، رانما ، مجری اور نافذ کرنے والے کے بغیر تمام مشکلات حل نہیں کرسکتا ۔

دوسرا یہ کہ خارج کرنے کی تعبیر در حقیقت تغیر و تبدل کے ساتھ حرکت دینے اور چلانے کی دلیل ہے ۔ گویا بے ایمان لوگ ایک تنگ و تاریک فضا میں ہوتے ہیں اور پیغمبر و رہبر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں وسیع اور روشن فضا میں لے جاتے ہیں ۔

۳۔ سورۃ کے آغاز و اختتام پر ایک نظر:

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اس سورۃ کا آغاز لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف ہدایت سے ہوا ہے او راکا اختتام بھی لوگوں کو ابلاغ و انذار پر ہوا ہے ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بہر حال اصلی ہدف خود لوگ ، ان کی سر نوشت اور ان کی ہدایت ہے اور در حقیقت انبیاء و مرسلین کا بھیجنا اور آسمانی کتب کا نزول سب اسی کو پانے کے لئے ہے ۔

آیات ۴،۵،۶،۷

۴۔ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلاَّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِى مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾۔

۵۔ ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ إِنَّ فِى ذَلِکَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ﴾۔

۶۔ ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَائَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَائَكُمْ وَفِى ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾۔

۷۔ ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِى لَشَدِيدٌ﴾۔

ترجمہ

۴۔ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ ان کے سامنے (حقائق) آشکار کرے پھر خدا جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) ہدایت کرتا ہے اور وہ تو توانا و حکیم ہے۔

۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے ونور کی طرف نکال اور انہیں ایام اللہ یاد دلا اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر گزار کے لئے نشانیاں ہیں۔

۶۔ وہ وقت یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد رکھو جب کہ اس نے تمہیں آلِ فرعون (کے چنگل سے) سے نجات بخشی۔ وہ کہ جو تمہیں بدترین طریقے سے عذاب دیتے تھے۔

تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (خدمت گاری کے لئے) زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف بہت بڑی آزمائش تھی۔

۷۔ (اسی طرح) اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر شکر گزاری کروگے تو تم پر (اپنی نعمت کا) اضافہ کروں گا اور اگر کفران کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔

تفسیر

زندگی کے حساس دن

گزشتہ آیات میں قرآن مجید اور اس کے حیات بخش اثرات کے متعلق گفتگو تھی۔ زیر بحث پہلی آیت میں بھی ایک خاص پہلو سے اس موضوع کے بارے میں بات کی گئی ہے اور وہ ہے انبیاء اور آسمانی کتب کی زبان کا اس پہلی قوم کی زبان سے ہم آہنگ ہونا جس کی طرف وہ مبعوث ہوئے۔

فرمایا گیا ہے: ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلاَّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾۔

کیونکہ پہلے پہل تو کسی پیغمبر کا تعلق اسی قوم سے پیدا ہوتا ہے جس میں وہ قیام کرتے ہیں، انبیاء کے ذریعے پہلی وحی کی شعاع اسی پر پڑتی ہے اور ان کے اولین اصحاب و انصار اسی میں سے ہوتے ہیں لہٰذا پیغمبر کو انہی کی زبان میں گفتگو کرنا چاہیئے "تاکہ وہ ان کے لئے حقائق کو واضح طور پر پیش کر سکے" ﴿لِيُبَيِّنَ لَهُم﴾

اس جملے میں در حقیقت اس کے نکتے کی طرف ہی اشارہ ہے کہ عام طور پر انبیاء کی دعوت ان کے پیروکاروں پر کسی انجانے اور غیر مانوس طریقے سے منعکس نہیں ہوتے تھی بلکہ واضح و روشن طور پر عام مروجہ زبان میں وہ تعلیم و تربیت کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ان کے سانے منے دعوت ِ الٰہی کی وضاحت کے بعد "خدا جس شخص کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے" ﴿فَيُضِلُّ اللهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِى مَنْ يَشَاءُ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخر کار کسی کا ہدایت یافتہ ہونا یا گمراہ ہونا انبیاء کا کام تو تبلیغ اور تبیین ہے۔ بندوں کی حقیقی ہدایت و رہنمائی تو خدا ہی کے ہاتھ ہے۔

اس بناء پر کہیں یہ تصور نہ ہو کہ اس کا مطلب جبر، لازمی طور پر ہونا اور انسان کی آزادی کا سلب ہونا ہے، بلافاصلہ مزید ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ عزیز حکیم ہے ﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيم﴾۔

اپنی عزت و قدرت کی وجہ سے وہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق وہ کسی شخص کو بلا سبب ہدایت نہیں کرتا اور نہ کسی کو بلا وجہ گمراہ کرتا ہے بلکہ بندے اپنے ارادے کی انتہائی آزادی کے ساتھ "سیر الیٰ اللہ" کے لئے قدم اٹھاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے دل پر نور ہدایت اور فیض حق کی کرنیں پڑتی ہیں۔ جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیہ ۶۹ میں ہے: ﴿والذی جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا﴾

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور جدو جہد کرتے ہیں ہم یقینی طور پر انہیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح جن لوگوں نے تعصب، ہٹ دھرمی، حق دشمنی، شہوات میں غوطہ زنی اور ظلم میں آلودگی کے باعث ہدایت کے لئے اپنی قابلیت گنوادی ہے وہ فیض ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ضلالت و گمراہی کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:﴿کذٰلک یضل اللہ من ھومسرف مرتاب﴾

اسی طرح خدا ہر اسراد کرنے والے اور آلودہ شک شخص کو گمراہ کرتا ہے۔ (مومن۔ ۳۴)

یہ بھی فرمایا گیا ہے:

اس کے ذریعہ خدا صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے (بقرہ۔ ۲۶) نیز یہ بھی ارشاد ہوتا ہے:﴿یضل اللہ الظالمین﴾

خدا ستمگروں کو گمراہ کرتا ہے۔ (ابراہیم۔ ۲۷)

گویا ہدایت اور گمراہی کا سرچشمہ خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔

اگلی آیت میں اپنے ہم عصر طاغوتوں کے مقابلے میں انبیاء کے قیام کا ایک نمومہ ذکر کیا گیا ہے اور بتا یا گیا ہے کہ وہ ظلمتوں سے نکال کر وادی نور میں لے جانے ے لئے بھیجے گئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات (مختلف معجزات) کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنی قوم کو ظلمات سے ونر کی طرف ہدایت کرو﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنْ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾۔[1]

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی پہلی آیت میں پڑھا ہے پیغمبر اسلام کے پروگرام کا خلاصہ بھی لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکال لے جانا تھا۔

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب خدا کے انبیاء و رسل ہیں بلکہ سب کے سب انسانوں کے معنوی اور روحانی راہنما ہیں۔ کیا برائیاں، گمراہیاں، کجرویاں، ظلم و ستم، استثمار، ذلتیں، زبوں حالیاں، فتنہ و فساد اور گناہ ظلمت و تاریکی کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ اور کیا ایمان و توحید، تقویٰ و پاکیزگی، آزادی و استقلال اور سربلندی و عزت نور و ضیا کے سوا کچھ اور ہے۔ اس بناء پر تمام رہبروں کی دعوت کے درمیان بالکل یہی قدر مشترک اور قدر جامع ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیری ذمہ داری ہے کہ تو اپنی قوم کو "ایام اللہ" یاد دلائے﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ﴾۔

مسلم ہے کہ تمام دن ایام الٰہی ہیں جیسے تمام جگہیں اور مقامات خدا سے تعلق رکھتے ہیں اب اگر کسی خاص مقام کو " بیت اللہ " سے موسوم کیا جائے تو یہ اس کی خصوصیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح مسلم ہے کہ "ایام اللہ "کا عنواب مخصوص دنوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو بہت زیادہ امتیاز و درخشندگی رکھتے ہیں۔

اسی بناء پر مفسرین نے اس کی تفسیر میں مختلف احتمالات پیش کئے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ گزشتہ انبیاء اور ان کی سچی اور اچھی امتوں کی کامیابی کے دنوں کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح وہ ایام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں کہ جن میں انہیں ان کی اہلیت کی بناء پر انواع و قسام کی نعمتوں ن سے نوازا گیا۔

بعض نے کہا کہ یہ ان دنوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے سرکش قوموں کو عذاب زنجیر میں جکڑا اور طاغوت و سرکش افراد کو ایک ہی فرمان سے تباہ و برباد کردیا۔

بعض نے ان دونوں حصوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن اصولی طورپر اس گویا، عمدہ اور رسا تعبیر کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تمام دن " ایام اللہ " ہیں کہ جو نوعِ بشر کی زندگی کی تاریخ میں حاملِ عظمت ہیں۔ ہر وہ دن کہ جس میں کوئی فرمانِ الٰہی اس طرح درخشندہ ہوا کہ باقی امور کو اپنے تحت الشعاع لے آیا وہ ایام اللہ میں سے ہے۔

جس روز انسانوں کی زندگی میں سے نیا باب کھلا، انہیں درسِ عبرت دیا گیا، ان مین کسی پیغمبر نے ظہور یا قیام فرمایا یا جس دن کوئی منکر، طاغوت اور فرعون ظلمت کے گڑھے میں پھنکا گیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ دن کہ جس میں حق و عدالت برپا ہوئی اور ظلم و بدعت خاموش ہوئی وہ ایام اللہ میں سے ہے جیساکہ ہم دیکھیں گے آئمہ معصوبین علیہم السلام کی اس تفسیر کے ذیل میں منقول روایات میں بھی حساس دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: اس گفتگو میں اور تمام ایام اللہ مین ہر صابر و با استقامت اور شکر گزار انسان کے لئے نشانیاں ہیں ﴿إِنَّ فِی ذَٰلِکَ لَآیَاتٍ لِکُلِّ صَبَّارٍ شَکُورٍ﴾۔

"صبار" اور "شکور" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں ان میں سے ایک صبر و استقامت زیادہ ہونے اور دوسرا نعمت و احسان پر شکر گزاری زیادہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صاحبِ ایمان افراد نہ تو سختیوں اور مشکلوں کے دنوں میں حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو حوالہ حوادث کردیتے ہیں اور نہ ہی کامیابی اور نعمت کے دنوں

میں غرور و غفلت میں گرفتار ہوتے ہیں اور " ایام اللہ "کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ان دونوں کا تذکرہ گویا اسی مقصد کی نشاندہی کر رہا ہے۔

بعد والی آیت میں تاریخ بنی اسرائیل میں ایام اللہ اور درخشاں و پربار دلوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا ذکر مسلمانوں کے لئے بھی تذکرہ تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمت خدا کا تذکرہ کرو کہ جب اس نے تمہیں آل فرعون سے نجات بخشی ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ ﴾۔

وہی فرعونی کہ جنہوں نے تم پر بد ترین عذاب مسلط کر رکھا تھا، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو خدمت اور کنیزی کے لئے زندہ رکھتے تھے ﴿يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَائَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَائَكُمْ﴾۔

اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بہت بڑی آزمائش تھی ﴿وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾۔

اس دن سے زیادہ با برکت کونسا دن ہو گا کہ جس دن تمہارے سروں سے خود غرض، سنگدل اور استعمار گر لوگوں کو دور کیا گیا۔ وہی لوگ کہ جو تمہارے ساتھ ایک بہت بڑا ستم روا رکھے ہوئے تھے۔ اس ظلم سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ وہ تمہارے بیٹوں کے سر جانوروں کی طرح کاٹ دیتے تھے (توجہ رہے کہ قرآن نے ذبح کہا ہے قتل نہیں) اور اسے بڑھ کر یہ کہ تمہاری عزت و ناموس بے شرم دشمن کے چنگل میں کنیزوں کی طرح گرفتار تھی۔

نہ صرف بنی اسرائیل کے لئے بلکہ اقوام و ملل کے لئے آزادی و استقلال کے حصول اور طاغوت کی دست برد سے نجات کا دن ایام اللہ میں سے ہے کہ جسے انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ ایسی یاد کہ جس کے سبب وہ گزشتہ حالت کی طرف لوٹنے سے محفوظ ہیں۔

"یسومونکم" سوم (بروزن "صوم") کے مادہ سے ہے۔ در اصل یہ کسی چیز کے پیچھے جانے اور اس کی جستجو کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ کسی پر کسی کام کو زبردستی ٹھونسنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ (۲)

"یسومونکم سوء العذاب" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تم پر بد ترین سختیاں اور عذاب مسلط کرتے تھے۔ کیا یہ کم مصیبت ہے کہ ایک گروہ کی فعال قوت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اس کی عورتوں کو کسی سرپرست کے بغیر چند ظالموں کے چنگل میں کنیزوں کی طرح باقی رہنے دیا جائے۔

ضمناً "یسومون" کا فعل مضارع کی صورت میں ہونا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام مدتوں جاری رہا۔ (۳)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بیٹوں کا سر کاٹنے اور عورتوں کی کنیزی کے ذکر کے بعد ان کا واؤ کے ذریعے "سوء العذاب " پر عطف کیا گیا ہے حالانکہ یہ خود "سوء العذاب "کا مصداق ہیں ۔ ایسا ان دونوں عذابوں کی اہمیت کی بناء پر ہوا ہے ۔ نیز یہ نشاندہی کرتا ہے کہ فرعون کی جابر اور ستم گر قوم بنی اسرائیل پر اور مظالم بھی روا رکھتی تھی لیکن ان میں سے یہدو ظلم بہت شدید اور نہایت سخت تھے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : یہ بات بھی یاد رکھو کہ تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر میری نعمتوں کا شکر بجا لاؤ تو یقینا میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو تو میرا عذاب اور سزا شدید ہے ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ ۔[۴]

ہوسکتا ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا تسلسل ہو ۔ آپ (علیہ السلام) نے انہیں اس نجات ، کامیابی اور نعماتِ فراواں پر شکر گزاری کی دعوت دی اور ان سے نعمت میں اضافے کا وعدہ کیا اور کفران کی صورت میں عذاب کی تہدید کی اور یہ ممکن ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہو اور مسلمانوں سے خطاب ہو لیکن بہر حال نتیجے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر بن اسرائیل کو خطاب ہو پھر بھی قرآن مجید میں ہمارے لئے ایک اصلاحی درس کے طور پر آیا ہے ۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ شکر کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے "لازیدنکم" (یقینا میں اپنی نعمت تم پر زیادہ کردوں گا) ۔

جب کہ کفران نعمت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تمہیں عذاب کروں گا بلکہ ارشاد ہوتا ہے :" میرا عذاب شدید ہے "تعبیر کا یہ فرق پروردگار ک اانتہائی لطف و کرم ہے ۔

۱۔حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے ظاہر ہونے والے معجزات کی طرف زیر نظر آیت میں لفظ "آیات "کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے ۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ کے مطابق وہ نو اہم معجزات تھے جن کی تفصیل اس آیت کے ضمن میں آئے گی (انشاء اللہ) ۔

۲۔مفردات راغب ، تفسیر المنار(جلد ۱ ص ۳۰۸ اور تفسیر ابو الفتوح رازی کی جلد ۷ ص ۷ کی طرف رجوع کریں ۔

۳۔توجہ رہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس آیت کی نظیر سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ میں بھی ہے ۔

۴۔تأذن باب تفعل سے ہے اور تاکید سے اعلان کرنے کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے افعال کا مادہ " ایذان " اعلان کے معنی میں ہے اور جب تفعل کے معنی میں آئے تو اس سے اضافہ اور تاکید کا استفادہ ہوتا ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ ایام اللہ کی یاد آوری

۱۔ ایام اللہ کی یاد آوری: جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ "اللہ" کی طرف "ایام" کی اضافت انسانوں کی زندگی کے اہم اور تقدیر ساز دنوں کی طرف اشارہ ہے اور ان دنوں کی عظمت کی بناء پر انہیں خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ نیز اس بناء پر کہ اگر ایک عظیم نعمت الٰہی کسی لائق قوم کے شامل حال ہو۔ یا عظیم عذابِ الٰہی کسی سرکش و طغیان گر قوم کو دمن گیر ہو تو دونوں صورتوں میں تذکرہ کرو یا دو آوری کے لائق ہے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقوم روایات میں "ایام اللہ" کی تفسیر مختلف دنوں سے کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

﴿ایام اللہ ، یوم یقوم القائم ﴿علیہ السلام﴾ و یوم الکرّة و یوم القیامة﴾

ایام اللہ مہدی موعود (علیہ السلام) کے قیام کا دن، روز رجعت اور قیامت ہیں۔ (۱)

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

"ایام اللہ" تین دن ہیں قیام مہدی (علیہ السلام) کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن۔ (۲)

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے: ایام اللہ نعمائہ وبلائہ و ببلائہ سبحانہ

ایام اللہ اس کی نعمتوں اور اس کی طرف مصائب کے ذریعے آزمائشوں کے دن ہیں۔ (۳)

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اس قسم کی احادیث کبھی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ مفہوم انہی میں منحصر ہے بلکہ ان میں بعض مصادیق کے بعض حصوں کا بیان ہے۔

بہر حال عظیم دنوں کی یاد آوری (چاہے وہ کامیابی کے دن ہو یا سختی کے) ملتوں کی بیداری اور ہوشیاری میں بہت مؤثر ہوتی ہے۔ اسی آسمانی پیام سے ہدایت لیتے ہوئے ہم تاریخ اسلام کے عظیم دنوں کی یاد زندہ و جاوداں رکھتے ہیں اور ان یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ہر سال ہم نے کچھ دنوں کو مخصوص کیا ہوا ہے، ان دنوں میں ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس سے ہم درس لیتے ہیں، ایسے درس کہ جو ہمارے آج کے لئے بہت زیادہ مؤثر ہیں۔

نیز ہماری موجودہ تاریخ خصوصاً انقلاب اسلامی ایران کی پر شکوہ تاریخ میں بہت دن ایسے ہیں جو" ایام اللہ" کے مصادیق ہیں ۔ ہر سال ہمیں ان کی یاد زندہ رکھنا چاہئیے ایسی یاد کہ جس میں شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور عظیم دلاوروں کی یاد رچی بسی ہو اور پھر ان سے ہدایت لینا چاہیئے ۔

لہٰذا ان عظیم دنوں کا ذکر ہمارے مدارس کی درسی کتب میں ہونا چاہئیے اور ان کی یاد ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت کا حصہ ہونا چاہئے اور ہمیں آئندہ نسلوں کے بارے میں " ذکر ھم " (انہیں یاد دلاؤ) کی ذمہ داری پوری کرنا چاہئیے ۔

قرآن مجید میں بھی بارہا " ایام اللہ " کی یاد دہانی کروائی گئی ہے ۔ بنی اسرائیل کے بارے میں بھی اور مسلمانوں کے بارے میں بھی نعمتوں اور سختیوں کے دنوں کو یاد رکھا گیا ہے ۔

۲۔ جابروں کے طور طریقے

ہم نے بارہا قرآنی آیات میں پڑھا ہے کہ فرعونی بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کردیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے ۔ یہ کام صرف فرعون اور فرعونی نہیں کرتے تھے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر استعمار گر کا یہی شیوہ اور طریقہ تھا کہ وہ فعال جنگجو اور پر عزم قوتوں کا ایک حصہ نابود کردیتے اور دوسرے کو کمزور کرکے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے استعماری اور استثماری کام کاری نہیں رکھ سکتے تھے ۔

لیکن اہم بات یہ کہ سمجھیں کہ ایسی قوتیں کبھی تو فرعونیوں کی طرح لڑکوں کو نابود ہی کردیتی ہیں اور کبھی منشیات، شراب اور بدکاری جیسی بری عادتوں میں غرق کرکے فعال قوتوں کو ناکارہ بنادیتی ہیں اور انہیں زندہ نما مردہ بنادیتی ہیں ۔یہی وہ چیز ہے کہ جس پر مسلمانوں کو گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ان کی نسل نو ایسے کاموں پر پڑگئی اور اپنی ایمانی جسمانی قوت گنوا بیٹھی تو پھر انھی جان لینا چاہئیے کہ ان کے لئے غلامی یقینی ہے ۔

۳۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے:

یہ امر جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں " ایام اللہ " کے ذکر کے بعد صرف ایک دن کا ذکر کیا گیا ہے ۔ وہ دن کہ جو فرعونیوں کے چنگل سے بنی سرائیل کی نجات کا دن ہے (اذانجکم من اھل فرعون) حالانکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اور بھی بہت سے عظیم دن تھے کہ جن میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی ہدایت کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم نعمتیں بخشی تھیں لیکن زیر بحث آیات میں "یوم نجات" کا ذکر قوموں کی سرنوشت میں آزادی اور استقلال کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے ۔

جی ہاں ! جب تک کوئی قوم وابستگی سے نجات حاصل نہ کرے ، غلامی اور استعمار کے چنگل سے آزاد ہو اس کی صلاحتیں استعداد اور کمال ظاہر نہیں ہوسکتا اور وہ اللہ کی راہ میں قدم نہیں رکھ سکتی وہ راہ کہ شرک ، ظلم اور بیدار کے خلاف قیام کا راستہ ہے ۔

اسی بناء پر عظیم الٰہی رہبروں کا پہلا کا یہی تھا کہ وہ قوموں کو فکری ، ثقافتی ، سیاسی اور اقتصادی غلامی سے آزاد کروائیں اور اس کے بعدکوئی اور کام کریں اور توحید و انسانیت کے پروگراموں کو عملی شکل دیں ۔

۴۔ شکر نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتوں پر ہمارے تشکر کا محتاج نہیں اور اگر وہ شکر گزاری کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی ہم پر ایک اور نعمت کا موجب ہے اور ایک اعلیٰ درجے کا تربیتی انداز ہے ۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ شکر کی حقیقت کیا ہے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ اس کا نعمت کی زیادتی سے کیا تعلق ہے اور کس طرح وہ خود ایک عاملِ تربیت ہو سکتا ہے ۔

شکر کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبانی شکر کیا جائے یا "الحمد للہ" وغیرہ کہا جائے بلکہ شکر کے تین مراحل ہیں :

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ نعمت عطا کرنے والا کون ہے ۔ یہ توجہ ، ایمان اور آگاہی شکر کا پہلا ستون ہے ۔

دوسرا مرحلہ اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ عمل کا مرحلہ ہے یعنی عملی شکر یہ ہے یعنی ہم پوری طرح سے غور کریں کہ ہر نعمت ہمیں کس مقصد کے لئے دی گئی ہے اور اسے ہم اس کے اپنے مقام پر صرف کریں اور اگر ایسا نہ کیا تو پھر ہم نے کفران نعمت کیا ۔ جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے :الشکر صرف العبد جمیع ما انعمه الله تعالیٰ فیماخلق لاجله

شکر یہ ہے کہ بندہ ہر نعمت کو اس کے مصرف ہی میں صرف کرے ۔

واقعاً خدا نے ہمیں آنکھیں دی ہیں ، اس نے ہمیں دیکھنے اور سننے کی نعمت کیوں بخشی ہے ۔ کیا اس کے علاوہ کوئی مقصد تھا کہ ہم جہاں میں اسکی عظمت کو دیکھیں ، راہ حیات کو پہچانیں اور ان وسائل کے ذریعے تکامل و ارتقاء کی طرف قدم بڑھائیں اور ، ادراک ، حق کریں ، حمایتِ حق کریں ، اس کا دفاع کریں اور باطل کے خلاف جنگ کریں ۔ اگر خدا کی ان عظیم نعمتوں کو ہم نے ان کے راستے میں صرف کیا تو ان کا عملی شکر ہے اور اگر یہ نعمتیں طغیان ، خودپرستی ، غرور ، غفلت اور خدا سے دوری کا ذریعہ بن گئیں تو یہ عین کفران ہے ۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

ادنی الشکر رؤیة النعمة من اللہ من غیر علة یتعلق القب بھا دون اللہ ، و الرضا بما اعطاہ ، وان لا تعصیہ بنعمة و تخالفہ بشیء من امرہ و نھیہ بسبب من نعمتہ

کمترین شکریہ ہے کہ تو نعمت کو خدا کی طرف سے سمجھے بغیر اس کے کہ تیرا اس نعمت میں مشغول رہے اور تو خدا کو بھول جائے اور (شکر) اس کی عطا پر راضی ہونا ہے اور یہ کہ تو اس کی نعمت کو اس کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے اور اس کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے باوجود تو اس کے اوامر و نواہی کو روندنہ ڈالے ۔[۴]

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ طاقت ، علم ، قوتِ فکر و نظر ، معاشرتی حیثیت ، مال و ثروت اور تندرستی و سلامتی میں سے ہ رایک کے شکر کا راستہ کیا ہے اور کفران کی راہ کونسی ہے ۔

تفسیر نور الثقلین میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث بھی اس تفسیر کے لئے ایک واضح دلیل ہے ۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا :شکر نعمة اجتناب المحارم

شکرانِ نعمت گناہوں سے بچنے کا نام ہے ۔ [(۵)]

یہیں سے شکر اور نعمت میں اضافے کے درمیان تعلق واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب بھی انسانوں نے نعمت الٰہی کو بالکل مقاصد نعمت کے تحت صرف کیا تو انہوں نے عملی طور پر ثابت کردیا کہ وہ اہل ہیں اور یہ اہل بیت سے زیادہ سے زیادہ فیض اور فزون تر نعمت کا سبب بنی ۔

اصولی طور پر شکر دو طرح کا ہے :

۱ ۔ شکر تکوینی اور

۲ ۔ شکر تشریعی

شکر تکوینی یہ ہے کہ ایک موجود خود کو حاصل نعمات کو اپنے رشد و نمو کے لئے استعمال کرے ۔ مثلاً باغیاں دیکھتا ہے کہ باغ کے فلاں حصے میں درخت خوب پھل پھول رہے ہیں اور ان کی جتنی زیادہ خدمت کی جائے اتنے ہی زیادہ شگوفے پھوٹتے ہیں ۔یہی امر سبب بنتا ہے کہ باغبان باغ کے درختوں کے اس حصے کی خدمت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور اپنے کارکنوں کو ان کی نگہبانی کی نصیحت کرتا ہے کیونکہ درکت زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ اے باغبان ! ہم اس بات کے اہل ہیں کہ تو اپنی نعمت و احسان ہم پر زیادہ کرے ۔

وہ بھی اس پکار کا مثبت جواب دیتا ہے ۔

بسوزند چوب درختان بی بر سزا خود ہمین است مر بی بری را

بے ثمر درختوں کی لکڑیاں جلیں کیونکہ بے ثمری کی ہی سزا ہے ۔

جہانِ شکر کی بھی یہی حالت ہے ۔ فرق یہ ہے کہ درخت میں خود اختیاری نہیں ہے اور وہ فقط تکوینی قوانین کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں لیکن انسان اپنے ارادہ و اختیار کی طاقت سے اور تشریعی تعلیم و تربیت سے استفادہ کرتے ہوئے اس راہ پر استفادہ کرتے ہوئے اس راہ پر آگاہی سے قدم رکھ سکتے ہیں ۔

لہٰذا وہ شخص کہ جو طاقت کی نعمت کو ظلم و سرکشی کا وسیلہ بنایا ہے گویا زبان حال سے پکار رہا ہوتا ہے کہ خداوند! میں اس نعمت کے لائق نہیں اور جو شخص اپنی صلاحیت کو حق و عدالت کی راہ میں کام میں لاتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ پروردگارا: میں اس لائق ہوں، لہٰذا اضافہ فرما ۔

یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ جس وقت ہم شکر الٰہی بجالاتے ہیں، چاہے وہ فکر و نظر سے ہو، چاہے زبان سے اور چاہے عمل سے، شکر کی یہ توانائی خود ہر مرحلے میں ایک نئی نعمت ہے اور اس طرح سے شکر کرنا ہمیں اس کی نئی نعمتوں کا مرہون منت قرار دیتا ہے اور یوں یہ ہر گز ہمارے بس میں نہیں کہ اس کے شکر کا حق ادا کر سکیں ۔ جیسا کہ امام سجاد علیہ السلام کی پندر مناجاتوں میں سے مناجاتِ شاکرین میں ہے:

کیف لی بتحصیل الشکر و شکرکی ایاک یفتقر الیٰ شکر ، فکلمات قلت لک الحمد و جب علی لذلک ان اقول لک الحمد

میں تیرے شکر کا حق کیسے ادا کرسکتا ہوں کہ جب یہ شکر ایک اور شکر کا محتاج ہے اور جبمیں "لک الحمد" کہتا ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ اس شکر گزاری کی توفیق پر کہوں :"لک الحمد"

لہٰذا انسان کے لئے مرحلہ شکر کا افضل ترین مقام یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی نعمتوں پر شکر سے عاجزی کا اظہار کرے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

فیمااوحی اللہ عز وجل الیٰ موسیٰ اشکر نی حق شکر ی فقال یا رب و کیف اشکرک حق شکرک و لیس من شکر اشکرک بہ الا و انت انعمت بہ علی قال یاموسی الان شکر تنی حین علمت ان ذٰلک منی ۔

خدا نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرا حق شکر ادا کرو تو انہوں نے عرض کیا: پروردگارا میں تیرا حقِ شکر کس طرح ادا کروں جب کہ میں جب بھی تیرا شکر بجا لاتا ہوں تو یہ توفیق بھی خود میرے لئے ایک نعمت ہوگی ۔

اللہ نے فرمایا: اب تونے میرا حق شکر ادا کیا جب کہ تونے جانا کہ حتی یہ توفیق بھی میری طرف سے ہے ۔ (۶)

بندہ ہمان نہ کہ زتقصیر خویش عذر بہ درگاہ خدا آورد

ورنہ سزا وار خداوندیش کس نتواند کہ بجا آورد

اچھا بندہ وہی ہے کہ جو اپنی کوتاہیو ں کا عذر بارگاہ الٰہی میں پیش کردے ورنہ اس کی خداندی کا حق کوئی بجا نہیں لاسکتا ہے۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۶۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۶۔

۳۔۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۶۔

۴۔سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۷۱۰۔

۵۔نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۹۔

۶۔ اصول کافی جلد ۴ ص ۸۰ (باب الشکر)۔

شکر نعمت کے بارے میں چند اہم نکات

۱۔ حضرت علی (علیہ السلام) نہج البلاغہ میں اپنے حکمت آمیز کلمات میں فرماتے ہیں:

اذا وصلت الیکم اطراف النعم فلا تنفروا و اقصاھا بقبلۃ الشکر

جس وقت نعمات اِلٰہی کا پہلا حصہ تم تک پہنچ جائے تو کوشش کرو کہ شکر کے ذریعے باقی حصے کو بھی اپنی طرف جذب کرو نہ یہ کہ شکر گزاری مین کمی کرکے اسے اپنے آپ سے دور بھگا دو۔ (۱)

۲۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے نعمتوں پر صرف خدا کی سپاس گزاری اور تشکر کافی نہیں بلکہ ان لوگون کو بھی شکریہ ادا کرنا چاہئیے کہ جو اس نعمت کا ذریعہ بنے ہیں اور ان کی زحمات و مشقات کا حق بھی اس طریقے سے ادا کرنا چاہئیے اور اس طرح انہیں اس راہ میں خدمات کی تشویق دلانا چاہئیے۔ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

جب روز قیامت ہوگا تو اپنے بعض بندوں سے فرمائے گا: کیا تمنے فلاں شخص کا شکریہ ادا کیا ہے۔

تو وہ عرض کرے گا: پروردگارا: میں نے تیرا شکریہ ادا کیا ہے۔

اللہ فرمائے گا: چونکہ تو اس کا شکر بجا نہیں لایا تو گویا تونے شکر بھی ادا نہیں کیا۔

پھر امام (علیہ السلام) نے فرمایا: اشکر کم للہ اشکر کم للناس

تم میں سے خدا کا زیادہ شکر کرنے والے وہ ہیں جو لوگوں کا زیادہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ (۱)

۳۔ خدا کی نعمتوں کی افزائش کہ جس کا شکرگزاروں سے وعدہ کیا گیا ہے صرف اس لئے نہیں ہے کہ انہیں نئی نئی مادی نعمتیں بخشی جائیں بلکہ خود شکر گزاری کہ جو خدا کی طرف خاص توجہ اور اس کی ساحت ِمقدس سے نئے عشق کے ساتھ ہو ایک عظیم روحانی نعمت ہے کہ جو انسانی نفوس کی تربیت اور انہیں فراین الٰہی کی اطاعت کی طرف رغبت دلانے کے لئے بہت مؤثر ہے۔ بلکہ شکر ذاتی طور پر زیادہ سے زیادہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی بناے پر علماء عقائد علم کلام میں "وجوب معرفت الٰہی" کو ثابت کرنے کے لئے "وجوب شکر منعم" کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

۴۔ معاشرے میں تحریک پیدا کرنے اور پیش رفت کے لئے روح شکر گزاری کا حیاء بہت اہم کردار کرتا ہے ۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے علم و دانش سے یا فداکاری اور شہادت سے یا کسی دوسرے طریقے سے اجتماعی اہداف کی پیش رفت کے لئے خدمت کی، ان کی قدر دانی اور ان کا تشکر معاشرے کو آگے بڑھانے کا بہت اہل عامل ہے ۔

جس معاشرے میں تشکر اور قدر دانی کی روح مردہ ہو اس میں خدمت کے لئے لگاؤ اور گرم جوشی بہت کم ہوتی ہے ۔ اس کے بر عکس جس معاشرے میں لوگوں کی زحمتوں اور خدمتوں کی زیادہ قدر دانی کی جاتی ہو وہاں نشاط و مسرت زیادہ محسوس کی جاسکتی ہے اور ایسی قومیں زیادہ ترقی کرتی ہیں ۔

اسی حقیقت کی طرف توجہ کے سبب ہمارے ہاں گزشتہ بزرگوں کی زحمتوں کی قدر دانی کے اظہار کے لئے ان کے سو سالہ ، ہزار سالہ روز ولادت وغیرہ کے موقع پر اور دیگر مناسب مواقع پر پر گرام منعقد کئے جاتے ہیں اور ان کی خدمات کے تشکر اور سپاس گزاری سے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

مثلاً ہمارے ملک میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب کو جو اڑھائی ہزار سالہ تاریک دور کا اختتام ہے او رایک دورِ نو کا آغاز ہے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال او رہر ماہ بلکہ ہر روز شہدائے انقلاب کی یاد تازہ کی جاتی ہے ، انہیں ہدیہ عقیدت وسلام پیش کیا جاتا ہے ۔

ان تمام لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے جو ان کی طرف منسوب ہے اور ان کی خدمات کو سرہاجاتا ہے تو یہ امر سبب بنتا ہے کہ دوسروں میں فداکاری اور قربانی کا عشق پیدا ہو او رلوگوں میں فداکاری کا سطح بلند تر ہو اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس نعمت کا تشکر اس میں اضافے کا باعث ہو او رایک شہید کے خون سے ہزاروں شہداء پیدا ہو اور ”لازیدنکم“ زندہ مصداق بن جائیں ۔

۱۔ نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۳۔

۲۔ اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۸۱ حدیث ۳۰۔

آیات ۱۰،۹،۸

۸۔﴿وَقَالَ مُوسَى إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾۔

۹۔﴿أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَايَعْلَمُهُمْ إِلاَّ اللهُ جَائَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ﴾۔

۱۰۔﴿قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ﴾۔

ترجمہ

۸۔ موسیٰ نے (بنی اسرائیل سے) کہا: اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں تو (خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ) خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

۹۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی کہ جو تم سے پہلے تھے۔ قوم نوح، عاد، ثمود، اور وہ جو ان کے بعد تھے وہی کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے۔ ان کے پیغمبر ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے لیکن انہوں نے (تعجب اور استہزاء سے) اپنے منہ پر ہاتھ رکھا کہ ہم اس چیز کے کافر ہیں جس کے لئے تم مامور ہو اور جس کی طرف تم بلاتے ہو اس کے بارے میں ہمیں شک ہے۔

۱۰۔ ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ کہ جو تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے گناہ بخش دے اور تمہیں مقرر و وعدہ گاہ تک باقی رکھے۔ انہوں نے کہا: (ہم یہ باتیں نہیں سمجھتے ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ) تم تو ہمارے جیسے انسان ہو اور تم چاہتے ہو کہ ہمارے آباء و اجداد جن کی پوجا کرتے تھے اس سے باز رکھو تم ہمارے لئے کوئی واضح دلیل لاؤ۔

تفسیر

کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟

زیر نظر پہلی آیت شکر گزاری اور کفران نعمت کی بحث کی تائید و تکمیل ہے اور یہ آیت حضرت موسیٰ بن عمران کی زبانی گفتگو کے ضمن میں نقل ہوئی۔ فرمایا گیا ہے: موسیٰ نے بنی اسرائیل کو یاددہانی کروائی کہ اگر تم روئے زمین کے تمام لوگ

کافرہ وجائیں (اور خدا کی نعمت کا کفران کریں) تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

﴿وَقَالَ مُوسَى إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾۔(۱)

در حقیقت شکر نعمت اور خدا پر ایمان تمہارے لئے نعمت میں اضافے، تمہارے تکامل و ارتقاء اور تمہاری عزت و افتخار کا سبب ہے۔ ورنہ خدا تو ایسا بے نیاز ہے کہ اگر پوری کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامنِ کبریائی پر کوئی گرد نہیں پڑ سکتی کیونکہ وہ سب بے نیاز ہے۔ یہاں تک کہ وہ تشکر و ستائش کا محتاج بھی نہیں کیونکہ وہ ذاتی طور پر لائق حمد ہے (حمید)۔

اگر اس کی ذات پاک میں نیاز و احتیاج ہوتی تو وہ واجب الوجوب نہ ہوتا۔ لہٰذا اس کے غنی ہونے کا مدہوم یہ ہے کہ تمام کمالات اس میں جمع ہیں جو ایسا ہے وہ ذاتی طور پر تعریف کے لائق ہے کیونکہ "حمید" کا معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لائق حمد ہے۔

اس کے بعد چند آیات میں بعض گزشتہ اقوام کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ وہی اقوام کہ جنہوں نے نعماتِ الٰہی پر کفرانِ نعمت کا راستہ اختیار کیا اور رہادیانِ الٰہی کی دعوت پر ان کی مخالفت کی اور کفر کی راہ اپنائی۔ ان آیات میں ان کی منطق اور ان کے انجام کی تشریح کی گئی ہے تاکہ گزشتہ آیت کے مضمون پر تاکید ہو جائے ارشاد ہوتا ہے: کیا تم تک ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی ہے کہ جو تم سے پہلے تھے ﴿أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾۔

ہو سکتا ہے کہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا آخری حصہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کی طرف سے مسلمانوں کو خطاب کی صورت میں ایک مستقل بیان ہو۔ بہر حال نتیجے کے لحاظ سے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی قومیں اور وہ کہ جو ان کے بعد تھیں ﴿قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِم﴾۔

وہی کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں پہچانتا اور اس کے علاوہ کوئی ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے ﴿لاَيَعْلَمُهُمْ إِلاَّ اللهُ﴾۔(۲)

اس کے بعد کی سرگزشت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف آئے لیکن انہوں نے تعجب و انکار کی بناء پر اپنے منہ ہاتھ رکھ کر کہا کہ جن چیزوں کے لئے تم بھیجے گئے ہو ہم ان سے کفر کرتے ہیں ﴿جَائَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِى أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ﴾۔ کیونکہ "ہم ہر اس چیز

کے بارے میں شک رکھتے ہیں کہ جس کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہو " اور اس شک کے ہوتے ہوئے کس طرح ممکن ہے کہ ہم تمہاری دعوت قبول کرلیں ﴿وَإِنَّا لَفِی شَکٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَیْهِ مُرِیبٍ﴾ ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے پہلے انبیاء کے بارے میں کفر اور بے ایمانی کا اظہار کیا لیکن اس کے بعد انہوں نے کہا ہمیں شک ہے اور لفظ " مریب " کے ساتھ اپنی بات مکمل کی ، یہ دونوں چیزیں آپس میں کیا مناسبت رکھتی ہیں ؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تردد و شک کا اظہار درحقیقت عدم ایمان کی علت ہے کیونکہ ایمان کے لئے یقین کی ضرورت ہے اور شک اس میں رکاوٹ ہے ۔

گزشتہ آیت میں چونکہ مشرکین اور کفار نے شک کو بنیاد قرار دیتے ہوئے عدم ایمان کا اظہار کیا لہٰذا بعد والی آیت میں بلا فاصلہ مختصر سی عبارت میں واضح دلیل پیش کرکے ان کے شک کی نفی کی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ کیا اس خدا کے وجود میں شک کرتے ہو کہ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے ﴿ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِی اللهِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ ۔

"فاطر" دراصل شگاف کرنے والے کے معنی میں ہے لیکن یہاں پیدا کرنے والے کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ جو ایک حساب شدہ پرگرام کے تحت کسی چیز کو پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی حفاظت کرتا ے کیونکہ اس کے وجود کی برکت اور نور ہستی سے ظلمت ِعدم چھٹ جاتی ہے اور شگافتہ ہو جاتی ہے جیسے سپیدہ سحر ظلمت ِشب کا پردہ چاک کردیتا ہے اور جیسے کھجور کا خوشہ اپنے غلاف کو شگافتہ کردیتا ہے اسی لئے عرب اسے "فطر" (بروزِ "شتر") کہتے ہیں ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فاطر" جہان کے ابتدائی مادہ کے ٹکڑے میں شگاف کرنے کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ جدید سائنس کہتی ہے کہ مادہ عالم مجموعی طور پر باہم پیوستہ چیزتی کہ جو بعد میں شگافتہ ہو کر مختلف کرّوں کی شکل میں ظاہر ہوئی ۔

بہر حال قرآن دیگر اکثر مواقع کی طرح خدا کے وجود اور صفات کو ثابت کرنے کے لئے یہاں نظام ِعالمِ ہستی اور آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ذکر کرتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا شناسی کے مسئلے میں اس سے زیادہ زندہ اور زیادہ روشن کوئی دلیل نہیں ۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نظام کا ہر گوشہ اسرار سے معمور ہے کہ جو زبان ِحال سے پکا پکار کر کہتا

ہے کہ سوائے ایک قادرِ حکیم اور عالمِ مطلق کے کوئی بھی ایسی قدرت پیش نہیں کرسکتا ۔ اسی بناء پر جس قدر انسانی علم ترقی کررہا ہے اتنے ہی اس نظام کے دلائل آشکار ہورہے ہیں اور یہ امر ہمیش ہر لحہ خدا سے نزدیک کرتا ہے ۔

واقعاً قرآن کسی قدر عجائب و غرائب کا حامل ہے کہ جس خدا شناسی اور توحید کی بحث کو اسی ایک جملے میں استفہامِ انکاری کی صورت میں ذکر کیا ہے ۔"﴿افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت و الارض﴾"

وہ جملہ کہ جس کے لئے تجزیہ و تحلی لاور وسیع بحث کے لئے ہزارہا کتابیں بھی کافی نہیں ہیں ۔

اس کے بعد منکرین کے لئے دوسرے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے ۔ یہ اعتراض پیغمبرانِ الٰہی کی رسالت کے بارے میں ہے (کیونکہ انہیں توحید کے بارے میں بھی شک تھا اور دعوتِ پیغمبر کے بارے میں بھی) ۔

یہ مسلم ہے کہ دانا و حکیم پروردگار اپنے بندوں کو ہرگز رہبر کے بغیر نہیں رہنے دیتا بلکہ " وہ انبیاء بھیج کر تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تہیں گناہوں اور آلوگیوں سے پاک کرے اور تمہارے گناہ بخش دے " ﴿یَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ﴾ ۔(۳)

اور اس کے علاوہ "تمہیں معین زمانے تک باقی رکھے "تاکہ تم اپنے کمال اور ارتقاء کی راہ طے کرسکو اور اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو﴿وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى﴾ ۔

در حقیقت دعوت انبیاء کے دو اہداف تھے ۔ ایک گناہوں کی بخشش یعنی انسا ن کے جسم و روح اور زندگی کی پاکیزگی اور دوسرا مقررہ مدت تک زندگی کہی بقا ۔ اور یہ دونوں در اصل ایک دوسرے کی علت و معلوم ہیں کیونکہ وہی معاشرہ باقی رہ سکتا ہے جو گناہ و ظلم سے پاک ہو ۔

تاریخ میں بہت سے ایسے معاشرے تھے جو ظلم و ستم ، ہوس بازی اور طرح طرح کے گناہوں کی بناء پر" جوان مرگ"کا شکار ہوگئے اور قرآن اصطلاح میں وہ "اجل مسمی"تک نہ پہنچ سکے ۔

امام صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں ایک جامع اور جاذبِ نظر حدیث منقول ہے ۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:﴿من یموت بالذنوب اکثر مما یموت بالاجال، ومن یعیش بالاحسان اکثر ممن یعیش بالاعمال﴾

جو لوگ گناہوں کی وجہ سے مرجاتے ہیں ان کی تعداد طبعی موت مرنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے اور وجو نیکی کے باعث زندہ رہتے ہیں (اور طویل عمرپاتے ہیں) ان کی تعداد عام عمر کے ساتھ زندہ رہنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے ۔(۴)

امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے:

ان الرجل یذنب الذنب فیحرم صلٰوۃ اللیل و ان العمل السیء اسرع فی صاحبہ من السکین فی اللحم۔

بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے اور نیک اعمال سے مثلاً نماز تہجد سے محروم ہو جاتا ہے۔ (جان لو کہ) برا کام انسان کی تباہی و بربادی میں گوشت کے لئے چھری سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ (۵)

ضمناً اس آیت میں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دعوت ِ انبیاء پر ایمان لانا اور ان کے پروگراموں پر عمل کرنا "اجل معلق" کو روکتا ہے اور حیات ِ انسانی کو "اجل مسمی" تک جاری و ساری رکھتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی ایک دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن کی توانائی کے مطابق اختتام ِ عمر تک پہنچے اور دوسری ''اجل معلق " ہے مختلف عوامل یا رکاوٹوں کی وجہ سے انسانی عمر کا راستے ہی میں ختم ہو جانا اور ایسا عام طور پر خود اس کے بغیر سوچے سمجھے کئے گئے اعمال کی وجہ سے اور طرح طرح کے گناہو کے باعث ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم سورہ انعام کی آیہ ۲ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم کفار نے اس حیات بخش دعوت کو قبول نہ کی اکہ جس میں واضح طور پر منطق ِ توحید موجود تھی۔ اور اپنے انبیاء کو ایسا جواب دیا کہ جس سے ان کی ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے آثار جھلکتے تھے۔ کہنے لگے:- تم تو ہم جیسے بشر ہو، اس کے علاوہ کچھ نہیں ﴿قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُنَا﴾۔ علاوہ ازین "تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روکو کہ جس کی ہمارے آباء اجداد پوجا کرتے تھے ﴿تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا﴾۔

بہر حال ان سب امور سے قطع نظر "تم ہمارے لئے کوئی واضح دلیل لاؤ" ﴿فَأتونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ﴾۔

لیکن ہم نے بار ہا کہا ہے (اور قرآن نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے) کہ انبیاء و رسل کا بشر ہونا نہ صرف ان کی نبوت میں مانع نہیں بلکہ ان کی نبوت کی تکمیل کرنے والا امر ہے اور جو لوگ اس امر کی وانبیاء کی نبوت کے انکار کی دلیل سمجھتے تھے ان کا مقصد زیادہ تر بہانہ سازی تھا۔

اسی طرح اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ عام طور پر آنے والی نسل کا علم گزشتگان سے زیادہ ہوتا ہے ان کا آباؤ اجداد کی راہ و رسم کا سہارا لینا ایک اندھے تعصب، بے وقعت بے ہودگی اور خرافات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ تقاضا کہ کوئی واضح دلیل پیش کریں، اس بناء پر نہ تھا کہ انبیاء کے پاس کوئی واضح دلیل نہ تھی بلکہ ہم بار ہا آیاتِ قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ بہانہ جو لوگ واضح دلائل اور "سلطان مبین" کا انکار کرتے تھے اور ہر وقت

نئی دلیل اور کسی نئے معجزے کی فرمائش کرتے رہتے تھے تاکہ اپنے لئے فرار کی راہ پیدا کرسکیں ۔ بہر حال آئندہ آیات میں ہم پڑھیں گے کہ انبیاء ان کا جواب کس طرح دیتے تھے ۔

١۔واضح ہے کہ "ان تکفروا" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاءے ؤء محذوف ہے اور "ان اللہ لغنی حمید" اس پر دلالت کرتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا :ان تکفروا لا تضروا للہ شیئ

٢۔جملہ "لایعلم الا اللہ" ممکن ہے پہلے جملے پر معطوف ہو اور واؤ حذف ہوگئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جملے کے لئے جملہ وصفیہ کی شبیہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی قوموں کے کچھ حالات ہم تک پہنچے ہیں لیکن مسلم ہے کہ بیشتر حصہ ہم تک نہیں پہنچا کہ جس سے صرف خدا ہی آگاہ ہے ۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ میں اس قدر اسرار، خصوصیات اور جزئیات تھیں کہ شاید وہ کچھ کہ جو ہم تک پہنچا ہے اس کے مقابلے میں جو نہیں پہنچا بہت ہی کم او رنا چیز ہے ۔

٣۔اس بارے میں کہ "لیغفرلکم من ذنوبکم" میں "من" کا کیا مفہوم ہے، مفسرین میں اختلاف ہے ۔ بعض اسے تبعیض کے معنی میں لیتے ہیں یعنی "تمہارے بعض گناہوں کو بخش دے گا" ۔ لیکن اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ایمان لانا تمام گناہوں کی بخشش کا باعث ہے، تو یہ احتمال بہت بعید معلو ہوتا ہے ۔ ("الاسلام یجب عما قبلہ" اسلام ماقبل کے گناہ ساقط کردیتا ہے) بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ "من" بدلیت کے معنی میں ہے، اس کے مطابق اس جملے کا معنی یہ ہو گا : "خدا تمہیں دعوت دیتا ہے کہ ایمان لانے کے بدلے تمہاے گناہ بخش دے" ۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "من" زائدہ ہے اور تاکید کے لئے آیا ہے یعنی "خدا تمہیں ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے تمام گناہ بخش دے ۔ یہ آخری تفسیر تمام تفاسیر سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

٤۔سفینة البحار جلد ١ ص ٤٨٨ ۔

٥۔سفینة البحار جلد ١ ص ٤٨٨ ۔

آیات ۱۱، ۱۲

۱۱۔ ﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللهَ يَمُنُّ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلاَّ بِإِذْنِ اللهِ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلْ الْمُؤْمِنُونَ﴾۔

۱۲۔ ﴿وَمَا لَنَا أَلاَّ نَتَوَكَّلَ عَلَى اللهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلْ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۱۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: یہ ٹھیک ہے کہ تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے (اور اسے اہل پاتا ہے) نعمت عطا کرتا ہے (اور اسے مقامِ رسالت پر فائز فرماتا ہے) اور ہم حکم خدا کے بغیر ہرگز معجزہ نہیں لاسکتے (اور ہم تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتے) اور باایمان افراد کی طرح صرف اللہ پر توکل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ ہم اللہ پر کیوں توکل نہ کریں جب کہ اس نے ہمیں ہماری (سعادت کی) راہوں کی طرف رہبری کی ہے اور ہم تمہاری ایذا سانیوں پر یقینا صبر کریں گے (اور اپنی رسالت کی انجام دہی سے دستبردار نہیں ہوں گے) اور توکل کرنے والوں کی صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے۔

صرف اللہ پر توکل کرو

ان دو آیات میں انبیاء کے ہٹ دھرم دشمنوں کی بہانہ سازیوں کا جواب دیا گیا ہے کہ جن کا ذکر گزشتہ آیات میں کیا گیا تھا۔ وہ کہ جو کہتے تھے کہ تم نوعِ بشر میں سے کیوں ہو، ان کے جواب میں پیغمبرانِ گرامی نے کہا یقینا ہم تمہی جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے اور اسے نعمت عطا کرتا ہے ﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللهَ يَمُنُّ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾۔

یعنی یہ امر فراموش نہ کرو کہ اگر بشر کی بجائے فرشتے کا انتکاب ہوتا تو اس کے پاس بھی اپنی طرف سے کچھ نہ ہوتا۔ تمام نعمات کہ جن میں سے ایک رسالت و رہبری کی ہے، خدا کی طرف سے ہیں۔ تو جو ایسا مقام فرشتے کو دے سکتا ہے وہ انسان کو بھی دے سکتا ہے۔

واضح ہے کہ اللہ کی طرف سے ایسی نعمت کی عطا بلا وجہ نہیں ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدا کی مشیت اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہے یعنی ہم جہاں بھی پڑھیں کہ "خدا جسے چاہتا ہے" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا جسے چاہتا ہے

اور اہل پاتا ہے" یہ ٹھیک ہے کہ مقام رسالت بالآخر خدائی نعمت ہے لیکن اہلبیت (علیہ السلام) بھی ذات پیغمبر میں حتماً موجود ہوتی ہے۔

اس کے بعد دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے تیسرے سوال کا جواب دیا گیا ہے گویا آباؤ اجداد کی سنت کو بطور دلیل پیش کرنا اس قدر کمزور اور بے بنیاد تھا کہ ہر عاقل انسان تھوڑے سے غور و فکر سے اس کی کمزوری کو جان لیتا ہے۔ علاوہ ازہم قرآن کی دیگر آیات میں اس کا جواب دیا جاچکا ہے۔

بہر حال تیسرے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: معجزات لانا ہمارا کام نہیں۔ ہم کوئی جادو گر نہیں کہ ایک طرف بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی من پسند کے معجزے کی فرمائش کرے اسے پیش کرتے رہیں اور معجزہ بے ارزش کھیل کود ہو کر رہ جائے بلکہ "ہم کوئی معجزہ حکم الٰہی کے بغیر نہیں لاسکتے" ﴿وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلاَّ بِإِذْنِ اللهِ﴾۔

علاوہ ازیں ہر پیغمبر لوگوں کے تقاضا کے بغیر بھی اس قدر معجزہ پیش کردیتا ہے جوکافی ہوتا کہ وہ ایک کی حقانیت کے اثبات کی سند ہو۔ اگرچہ ان کے دعوت کے مضامین اور انکا مکتب خود تنہا عظیم ترین معجزہ ہے لیکن بہانہ تراش عام طور پر ان باتوپر کان دھرتے اور ہر روز ایک نئی فرمائش کرتے ہیں اور پیغمبر اسے قبول نہ کریں تو شور و غوغا برپا کردیتے ہیں۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ ان کی دھمکیوں کا بھی قاطع جواب دیا جائے انبیاء اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے: "تمام باایمان افراد کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے" وہی خدا کہ جس کی قدرت کے مقابلے میں تمام قدرتیں ناچیز اور حقیر ہیں ﴿وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلْ الْمُؤْمِنُونَ﴾۔

پھر مسئلہ توکل کو ایک واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتے: ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں اور تمام مشکلات میں اس کی پناہ کیوں نہ لیں، ہم ناچیز طاقتوں اور دھمکیوں سے کیوں ڈریں جب کہ اس نے ہماری ہدایت سعادت کی راہوں کی طرف کی ہے ﴿وَمَا لَنَا أَلاَّ نَتَوَكَّلَ عَلَى اللهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا﴾۔

اس نے جب کہ ہمیں سعادت کی راہوں کی طرف ہدایت، کی افضل ترین نعمت عطا کی ہے تو یقینا وہ ہر قسم کی جارحیت، کارشکنی اور مشکل میں ہمیں اپنی حمایت کے زیر سایہ رکھے گا۔

پھر وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے: اب جب کہ ہمارا سہارا خدا ہے ایسا سہارکہ جوناقابلِ شکست ہے اور سب سے بلند ہے تو "ہم یقینی طور پر تمہاری سب اذیتوں کے مقابلے میں پامردی اور صبر و شکیبائی دکھائیں گے" ﴿وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى مَا آذَيْتُمُونَا﴾۔

اور وہ اپنی بات یوں ختم کرتے: تمام توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ مومنین اور متوکلین

۱۔ مومنین اور متوکلین: زیر بحث پہلی آیت میں ہے کہ مومنین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیئے اور دوسری آیت میں ہے کہ متوکلین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیئے۔ گویا دوسرا جملہ پہلے کی نسبت زیادہ وسعت کا حامل ہے یعنی مومنین کے لئے تو آسان ہے کیونکہ خدا پر ایمان ہو تو یہ ایمان اس کی قدرت، حمایت اور اس پر توکل کے ایمان سے جدا نہیں ہو سکتا حتی کہ غیر مومنین اور سب لوگوں کے پاس خدا کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ کیونکہ جس کی طرف بھی نگاہ کریں اسکے پاس خود اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں تمام نعمتیں، طاقتیں اور عنایتیں اس کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہیں پس انہیں بھی اس کے آستان پر سر جھکانا چاہیئے اور اس سے طلب کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ توکل انہیں اللہ پر ایمان کی دعوت بھی دے گا۔

۲۔ انبیاء اور معجزات

زیر بحث آیات ایسے لوگوں کے لئے واضح جواب ہیں کہ جو انبیاء سے معجزکی نفی کرتے ہیں یا قرآن حکیم کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے معجزات کا انکار کرتے ہیں۔ یہ آیات ہمیں سمجھاتی ہیں کہ انبیاء یہ ہرگز نہیں کہتے تھے کہ ہم معجزہ نہیں لائیں گے بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم حکم خدا اور اذن الٰہی کے بغیر یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ معجزہ اس کا کام ہے، اس کے اختیار میں ہے اور جب وہ قرینِ مصلحت سمجھتا ہے ہمیں معجزہ دیتا ہے۔

۳۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ

"توکل" دراصل "وکالت" کے مادہ سے وکیل انتخاب کرنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک اچھا وکیل وہی ہے کو کم از کم چار صفات کا حامل ہو:

۱۔ کافی علم و آگاہی ۔ ۲۔ امانت داری ۔ ۳۔ طاقت و قدرت ۔ ۴۔ ہمدردی

شاید یہ امر بھی یا دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ مضتلد کاموں کے لئے ایک مدافع کا انتخاب اس موقع پر ہوتا ہے کہاں انسان ذاتی طور پر دفاع پر قادر نہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس موقع پر دوسری قوت سے استفادہ کرتا ہے اور اس کی طاقت و صلاحیت سے اپنی مشکل حل کرتا ہے۔

لہذا خدا پر توکل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ انسان زندگی کی مشکلات و حوادث، مخالفین کی دشمنیوں اور سختیوں، پیچیدگیوں اور کبھی اہداف کے راستے میں حائل رکاوٹوں میں جب خود انہیں دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے پنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور خود بھی ہمت و کوشش سے باز نہ رہے بلکہ جہاں کسی کام کو خود انجام دینے کی طاقت رکھتا ہو وہاں بھی مؤثر حقیقی خدا ہی کو جانے کیونکہ ایک موحد کی چشم بصیرت کے دریچے سے دیکھا جائے تو تمام قدرتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔

" توکل علی اللہ " کا نقطہ مقابل یہ ہے کہ اس کے غیر پر بھروسہ کیا جائے۔ یعنی کسی غیر پر تکیہ کرکے جینا، دوسرے سے وابستہ ہونا اور اپنی ذات میں استقلال و اعتماد سے عاری ہونا۔

علماء اخلاق کہتے ہیں کہ خدا کی توحید افعالی کا ثمرہ مستقیم توکل ہے کیونکہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ ایک موحد کی نظر میں ہر حرکت، ہر کوشش، ہر جنبش اور عالم میں صورت پذیر ہونے والی ہر چیز آخرکار اس جہان کی پہلی علت یعنی ذات پاک خدا سے ارتباط رکھتی ہے۔ لہذا ایک مؤحد کی نگاہ میں تمام طاقتیں اور کامیابیاں اسی کی طرف سے ہیں۔

توکل کا فلسفہ

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ:

اولاً: توکل علی اللہ زندگی کے سخت حوادث و مشکلات میں اس ناقابلِ فنا منبع قدرت پر توکل انسان کی استقامت و مقاومت کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانون نے میدانِ احد میں سخت ضرب لگائی اور دشمن میدان چھوڑنے کے بعد راستے میں سے پلٹ آئے تاکہ مسلمانوں پر آخری ضرب لگائیں اور یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو

قرآن کہتا ہے کہ صاحب ایمان افراد اس خطرناک لمحے میں وحشت زدہ ہوئے جب کہ وہ اپنی فعال قوت کا ایک اہم حصہ کھو چکے تھے بلکہ "توکل" اور قوتِ ایمانی نے ان کی استقامت کے نمونے متعدد آیات میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے آلِ عمران کی آیت ۱۲۲ میں قرآن کہتا ہے:

توکل علی اللہ نے مجاہدین کے دو گروہوں کو میدانِ جہاد میں سستی سے بچایا۔

سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۲ مین دشمن کے حملوں اور نقصانات کے مقابلے میں توکل اور صبر کا باہم ذکر ہوا ہے۔

آلِ عمران کی آیہ ۱۵۹ میں اہم کاموں کی انجام دہی کے لئے پہلے مشورے کا، پھر پختہ ارادے کا اور پھر توکل علی اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے:انه لیس له سلطان علی الذین اٰمنوا وعلی ربهم یتوکلون

شیطانی وسوسوں کا صرف وہ لوگ مقابلہ کرسکتے ہیں اور اس کے نفوذ سے بچ سکتے ہیں کہ جو ایمان اور توکل کے حامل ہوں ۔(نحل۔ ۹۹)

ان آیات سے مجموعی طورپر معلوم ہوتا ہے کہ شدید مشکلات میں انسان ضعف اور کمزوری محسوس نہ کرے بلکہ اللہ کی بے پایاں قدرت پر بھروسہکرتے ہوئے اپنے آپ کو کامیاب اور فاتح سمجھے ۔ گویا توکل امید آفرین ، قوت بخش ، تقویت پہنچانے والااور استقامت مین اجافے کا سبب ہے ۔ توکل کا مفہوم اگر گوشہ نشینی اختیار کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا ہوتا تو مجاہدین اور اس قسم کے لوگوں میں تحرک پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا ۔

اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ عالم اسباب اور طبیعی عوامل کی طرف توجہ روحِ توکل سے مناسبت نہیں رکھتی تو وہ انتہائی غلط فہمی میں بتلاہیں کیونکہ طبیعی عوامل کے اثرات کو ارادہ الٰہی سے جدا کرنا ایک طرح کا شرک ہے ۔ کیا ایسا نہیں کہ عوامل طبیعی کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور سب کچھ اسی کے ارادے اور فرمان کے تحت ہے ۔ البتہ اگر عوامل کو ایک مستقل طاقت سمجھا جائے اور انہیں اس کے ارادے کے مد مقابل قرار دیا جائے تو یہ وہ مقام ہے جو روح توکل سے مطابقت نہیں رکھتا ۔

کیسے ممکن ہے کہ توکل کی ایسی تفسیر کی جائے حالانکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو متوکلین کے سید و سردار ہیں اپنے اہداف کی پیش رفت کے لئے کسی موقع، صحیح منصوبہ، مثبت تکنیک اور مختلف ظاہری وسائل سے غفلت نہیں برتتے تھے ۔

یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ توکل کا وہ منفی مفہوم نہیں ہے ۔

ثانیاً:توکل علی اللہ انسان کو ان وابسگتیوں سے نجات دیتا ہے کہ جو ذلت و غلامی کا سر چشمہ ہیں اور اسے آزادی اور خود اعتمادی بخشتا ہے ۔

”توکل “ اور ”قناعت “ ہم ریشہ ہیں اور فطرتاً ان دونون کا فلسفہ بھی کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے ۔ اس کے باوجود ان میں فرق بھی ہے ۔یہاں ہم چند ایک اسلامی روایات پیش کرتے ہیں جن سے توکل کا حقیقی مفہوم اور اصلی بنیاد واضح ہو سکے ۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:ان الغنی و العز یجولان فاذا ظفرا بمواضع التوکل او طنا

بے نیازی اور عزت محوِ جستجو رہستی ہیں جہاں توکل کو پالیتی ہیں وہیں ڈیرے ڈال دیتی ہیں اور اسی مقام کو اپنا وطن بنا لیتی ہیں ۔ (۱)

اس حدیث میں بے نیازی اور عزت کا اصلی وطن "توکل" بیان کیا گیا ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: میں نے وحی الٰہی کے قاصد جبرئیل سے پوچھا کہ توکل کی اہے تو اس نے کہا :

العلم بان المخلوق لایضر ولاینفع ، ولا یعطی ولایمنع ، واستعمال الیأس من الخلق فاذا کان العبد کذٰلک لم یعمل لا حد سوی اللہ فھٰذا ھو التوکل ۔

جب بندہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ مخلوق نقصان پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ اور عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے اور وہ مخلوق کے ہاتھ سے آنکھ اٹھا لیتا ہے تو پھر وہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے کام نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی سے امید نہیں باندھتا تو یہ ہے حقیقتِ توکل ۔ (۲)

کسی نے حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام سے پوچھا :ماحد التوکل ؟

تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:ان لاتخاف مع اللہ احداً (سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۸۲) ۔

یہ کہ تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی سے نہ ڈرے ۔ (۳)

۱۔اصول کافی، جلد ۲، باب " " حدیث ۳ ۔

۲۔ بحار الانوار، جلد ۱۵، حصہ ۲ ص ۱۴ چاپ قدیم

۳۔توکل کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے کتاب " انگیزہ پیدائش رجوع کریں ۔

آیات ۱۷،۱۶،۱۵،۱۴،۱۳

۱۳ ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ﴾۔

۱۴۔ ﴿وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ﴾۔

۱۵۔ ﴿وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ﴾۔

۱۶۔ ﴿مِنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ﴾۔

۱۷۔ ﴿يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ﴾۔

ترجمہ

۱۳۔ جنہوں نے اپنے رسولوں سے کفر کیا انہوں نے کہا: یقیناً ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے مگر یہ کہ ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ تو ایسے موقع پر ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی کی کہ میں ظالموں کو ہلاک کردوں گا ۔

۱۴۔ اور تمہیں ان کے بعد زمین میں سکونت بخشوں گا یہ (کامیابی) اس کے لئے ہے کہ جو میرے مقام (عدالت) سے ڈرتا ہو اور میرے عذاب کا خوف رکھتا ہو۔

۱۵۔ انہوں نے (خدا سے) فتح و کامرانی کا تقاضا کیا اور ہر جبار منحرف نا امید اور نابود ہوا ۔

۱۶۔ اس کے پیچھے جہنم ہوگی اور اسے متعفن پانی پلایا جائے گا ۔

۱۷۔ وہ اسے بڑی مشکل سے گھونٹ گھونٹ کرکے پئے گا اور وہ اسے خوشی سے پینے کو تیار نہیں اور ہر جگہ سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے عذابِ شدید ہے ۔

تفسیر

منحرف جابروں کا طرز عمل اور ان کا انجام

بے منطق افراد کا طریقہ ہے کہ جب وہ اپنی بات اور عقیدے میں کمزوری پر آگاہ ہوتے ہیں تو پھر دلیل کا راستہ چھوڑ کر طاقت اور ظلم کا سہارا لیتے ہیں ۔ اس جگہ پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہٹ دھرم اور بہانہ ساز کافر قوموں نے جب انبیاء کی متین ورسا منطق کہ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، سنی تو انہوں نے اپنے انبیاء سے کہا: ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے مگر یہ کہ ہمارے دین (بت پرستی) کی طرف پلٹ آو

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾ ۔

یہ جاہل مغرور گویا ساری زمین کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور اپنے انبیاء کو ایک شہری کے حقوق ملنے کے بھی قائل نہیں تھے ۔ اسی لئے کہتے تھے "ارضنا" (ہماری زمین) حالانکہ خدا نے زمین اور اس کی تمام نعمتیں صالح اور نیک لوگوں کے لئے پیدا کی ہیں اور یہ خودسر، جابر اور متکبر در حقیقت اس میں کوئی حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ سب کچھ اپنا سمجھیں ۔

ہوسکتا ہے "لتعودنّ فی ملتنا" (ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ) سے غلط فہمی پیدا ہو کہ انبیاء قبلِ رسالت بت پرستی کے مذہب پر تھے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اس کے کہ وہ معصوم تھے اور قبل رسالت بھی تھے ان کی عقل ودرایت اس سے کہیں زیادہ تھی وہ ایسا احمقانہ کام کرتے پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کرتے ۔

ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ اعلانِ نبوت سے قبل انبیاء پر تبلیغ کی ذمہ داری نہ تھی شاید ان کی خاموشی کے سبب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ مشرکین کے ہم عقیدہ تھے ۔

اس سے قطع نظر اگرچہ خطاب خود انبیاء کو ہے لیکن در حقیقت ان کے پیروکاروں پر بھی محیط ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان کے پیروکار پہلے مشرکین کے مذہب پر تھے اور مشرکین کی نظر صرف انہی پر ہے ۔ نیز اصطلاح کے مطابق " لتعودنّ" عمومی تعبیر ہے اور ربابِ تغلیب میں سے ہے (یعنی حکم اکثریت کو عمومیت پر محمول کرنا) ۔ (۱)

بعض دوسری قرآنی آیات کی طرف رجوع کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "عود" جب "فی" کے ساتھ ہو تو بھی بازگشت کا معنی دیتا ہے (غور کیجئے گا)

قرآن مزید کہتا ہے کہ خداوند عالم ایسے مواقع پر پیغمبروں کی دلجوئی کرتا اور انہیں اطمینان دلاتا" اور ان کی طرف وحی کرتا کہ میں یقینا ظالموں کو ہلاک کروں گا" ﴿فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ﴾ ۔

لہٰذا ان دھمکیوں سے ہرگز نہ ڈرو اور تمہارے آہنی ارادے کی راہ میں ذرہ بر سستی بھی حائل نہیں ہونا چاہیئے ۔

ظالم منکرین چونکہ انبیاء کو اپنے علاقے سے جلا وطن کردینے کی دھمکی دیتے تھے تو خدا تعالیٰ اس کے مقابلے میں ان سے وعدہ کرتا ہے کہ " ہم تمہیں اس علاقے میں ان کی نابودی اور تباہی کے بعد سکونت بخشیں گے" ﴿وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ ۔

لیکن یہ توفیق و کامیابی سب کو نصیب نہیں ہوتی " یہ ان کے لئے ہے جو میرے مقام سے ڈریں اور احساسِ ذمہ داری کریں اور اسی طرح انحراف، ظلم اور گناہ پر ہونے والی تہدیدِعذاب سے ڈریں اور اسے سنجیدگی سے لیں "﴿ذَٰلِکَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِی وَخَافَ وَعِیدِ﴾۔

لہذا عنایت اور نعمت اور لطف و کرم نہ حساب کتاب کے بغیر ہے اور نہ بلاوجہ بلکہ ایسے افراد کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ پروردگار کے مقامِ عدل کے مقابلے میں نہ ظلم و ستم کرتے ہیں اور نہ دعوتِ حق کے جواب میں دشمنی کرتے ہیں۔

اور ایسے موقع پر کہ جب انتہا ہو گئی تھی اور وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی ذمہ داری انجام دے چکے تھے، جنہیں ایمان لانا تھا لا چکے تھے اور باقی اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور مسلسل انبیاء و رسل کو دھمکیاں دے رہے تھے "تو انہوں نے خدا سے فتح و کامرانی کا تقاضا کیا "﴿وَاسْتَفْتَحُوا﴾۔تو خدا نے بھی ان سچے مجاہدوں کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اس طرح سے کہ "منحرف جابر نا امید، زیاں کار اور نابود ہو گئے "﴿وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیدٍ﴾۔

خاب " خیبۃ" (بر وزن "غیبۃ") کے مادہ سے مطلوب ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے کہ جو تقریبا نا امیدی کا مفہوم دیتا ہے۔

"جبار" یہاں متکبر اور سرکش کے معنی میں ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے اسے کوئی حکم دیا۔ اس نے نافرمانی کی اور فرمانِ پیغمبر پر عمل نہیں کیا تو آپ نے فرمایا:

﴿دعوها فانها جبارة ﴾اسے چھوڑو یہ سرکش عورت ہے۔ (۲)

لیکن لفظ "جبار" کبھی کبھی خدا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس کا ایک اور معنی ہے اور وہ ہے "محتاجِ اصلاح موجود کی اصلاح کرنے والا "یا" وہ کہ جو ہر چیز پر مسلط ہے "۔ (۳)

لفظ "عنید" در اصل "عند" (بر وزن "رند") سے سمت کے معنی میں ہے۔یہاں انحراف اور راہِ حق کے علاوہ کی طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

کل جبار عنید من ابی ان یقول لااله الاالله

جبارِ عنید وہ ہے کہ جو لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کرے۔ (نور الثقلین جلد ص ۵۳۲)۔

ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے: العنید المعرض عن الحق

عنید وہ ہے جو حق سے روگردانی کرے۔ (نور الثقلین جلد ص ۵۳۲)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ "جبار" صفت ِانسانی یعنی روحِ سرکشی کی طرف اشارہ ہے اور "عنید" افعال ِانسانی میں اس صفت کے اثر کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسے حق سے منحرف کردیتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے جہان میں ان جباران ِعنید کے نتیجہ عمل پر انہیں ملنے والی سزاؤں کے بارے میں دو آیات میں پانچ چیزوں کی طرف اشارہ کیاگیا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں:

۱)اس ناامیدی اور خسران کے پیچھے یا ایسے شخص کے پیچھے جہنم اور جلانے والی آگ ہوگی ﴿مِنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ﴾۔

لفظ "وراء" اگرچہ پس پشت کے معنی میں (لفظ "امام" کے مقابلے میں) ہے لیکن ایسے مواقع پر نتیجہ اور انجام کار کے معنی میں ہے جیساکہ فارسی میں بھی اس معنی میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اگر فلاں غذا کھاؤ تو اس کے پیچھے بیماری ہے یا اگر فلاں شخص سے دوستی کرو تو اس کے پیچھے بد بختی اور پشیمانی ہے یعنی اس کا نتیجہ اور معلول اسی طرح ہے۔

۲)اس جلانے والی آگ میں جب وہ پیا سا ہوگا تو ہم اسے آب ِ"صدید" پلائیں گے ﴿وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ﴾۔

جیساکہ علماء لغت نے کہا ہے کہ "صدید" ایک طرح کی میل کچیل کو کہتے ہیں کہ جو چمڑے اور گوشت کے درمیان جمع ہوجاتی ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میل اور خون کی طرح بدبو دار متعفن اور بد رنگ پانی اسے پلایا جائے گا۔

۳) یہ گنہگار، مجرم اور جبار عنید جب دیکھے گا کہ اسے پینے کے لئے ایسا پانی ملا ہے تو بڑی تکلیف کرکے مشکل سے اسے گھونٹ گھونٹ پئے گا اگرچہ ہر گز اسے پینا نہیں چاہے گا "بلکہ ہم اس کے حلق میں یہ پانی ڈالیں گے" ﴿يَتَجَرَّعُهُ وَلاَيَكَادُ يُسِيغُهُ﴾۔(۴)

۴)اسے اس قدر عذاب، تکلیف اور ناراحتی کا سامنا ہوگا کہ "ہر طرف سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں" تاکہ اپنے اعمال کا انجام بھگتے گا ﴿وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ﴾۔ اگرچہ ظاہراً یوں لگتا ہے کہ جو کچھ عذاب بیان کیا گیا ہے اس سے بڑھ کر نہیں ہوگا لیکن قرآن مزید کہتا ہے: اس کے پیچھے عذابِ شدید ہے ﴿وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ﴾۔

اس طرح جس قدر شدید عذاب اور برا انجام فکر انسانی میں آسکتا ہے حتیٰ کہ جو کچھ نہیں آسکتا وہ ان خود غرض ظالموں اور بے ایمان و گنہگاروں جابروں کے انتظار میں ہے۔ ان کا بستر آگ ہے، ان کے پینے کے لئے متعفن اور نفرت آور پانی ہے اور ان کے لئے طرح طرح کا عذاب ہے اور اس کے باوجود وہ مریں گے نہیں بلکہ زندہ رہیں گے اور اس کا مزہ چکھیں گے۔

یہ ہرگز تصور نہیں کرنا چاہئیے کہ اس قسم کی سزائیں غیر عادلانہ ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں کے اعمال کا نتیجہ اور طبیعی اثر ہے بلکہ ان کے کام اس طرح دوسرے گھر میں مجسم ہوتے ہیں کہ جہاں عمل اپنی مناسب شکل میں مجسم ہو گا۔

اگر ہم اپنے زمانے کے بعض ظالموں کے اعمال اور جرائم پر نظر کریں کہ جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے یا ایسے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا صحیح طور پر مطالعہ کریں تو بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ یہ سزائیں بھی ان کے لئے بہت کم ہیں۔

۴۔ اسی تباہ کن جنگ ہی کو لیجئے کہ جس کا سامنا ہمیں اس وقت یہ بحث کرتے ہوئے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا ماحصل ایک ستم گر حکمران کی خود خواہی یا زیادہ صحیح الفاظ مین ایک پاگل جبار عنید کی خود سری کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کے لئے کسی عاقلانہ مقصد کا تصور نہیں ہوسکتا۔ اس میں کیسے کیسے مظالم کئے گئے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم عاجز ہیں۔ ہم نے خود ملک کے مغربی اسپتالوں میں مجروحین جنگ کو دیکھا ہے۔ معصوم بچوں سے لے کر بوڑھوں اور عورتوں تک زخمی حالت میں دیکھا ہے ان میں سے بہت سے اپنی آنکھیں اور ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتے ہیں اور واقعاً ان کی ایسی حالت ہے کہ ان پر ایک نظر کی جائے تو انسان ہل کر رہ جائے۔ تو غور کیجئے کہ جس وقت ایک ظالم اور ستم گر لاکھوں انسانوں کو مصائب میں اس طرح تڑپائے تو اس کے لئے کیسی سزا اور عذاب ہونا چاہئیے۔

۱۔اس غلط فہمی کو کا ایک اور جواب بھی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "عود" کا مادہ اگر "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہو تو بازگشت اور لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو حالت کی تبدیلی کے معنی میں ہے اور بازگشت کا معنی نہیں دیتا۔ لہٰذا "لتعودن فی ملتنا" کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی حالت کو بدل دو اور اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین کو قبول کرلو۔ لیکن دیگر آیات مثلاً کلما ارادو ا ان یخرجوا منھا اعید وا فیھا (سجدہ: ۲۰)

۲۔تفسیر فخر رازی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

۳۔مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۲۵۹ (اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں۔

۴-"یسیغہ" "اساغۃ" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے "پینے کی چیز حلق میں ڈالنا"۔

چند اہم نکات

۱۔ مقامِ پروردگار سے کیا مراد ہے؟

۱۔ مقامِ پروردگار سے کیا مراد ہے؟ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ظالموں پر کامیابی اور ان کی نابودی کے بعد زمین پر حکومت ان افراد کا حصہ ہے کہ جو "مقامِ الٰہی" سے ڈریں۔ یہاں لفظ "مقام" سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مختلف احتمالات پیش کئے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تمام احتمالات صحیح ہوں آیت سے سب مراد ہوں:

الف: اس سے مراد محاسبہ کرتے وقت پر وردگار کی حیثیت ہے۔ جیسا کہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے

۔ مثلاً ﴿و امامن خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوٰى﴾

مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے ڈرتا رہا اور جی کو نا جائز خواہشوں سے روکتا رہا۔ (نازعات ۔ ۴۰)

۔ اور ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾

اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اس کے لئے دو باغ ہیں (رحمن ۔ ۴۶)۔

ب: "مقام" "قیام" کے معنی میں ہے اور "قیام" "نظارت و نگرانی" کے معنی میں ہے یعنی جو اللہ کی طرف سے اپنے اعمال کی شدید نظارت سے ڈرتا ہے اور احساسِ مسئولیت کرتا ہے۔

ج: "مقام" اجرائے عدالت اور احقاق، حق کے لئے قیام کرنے کے معنی میں ہے یعنی جو پروردگار کی اس حیثیت سے ڈرتے ہیں۔

بہرحال جیس اکہ ہم نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب معانی جمع ہوں۔ یعنی وہ لوگ کہ جو خدا کو اپنے اوپر ناظر و نگران سمجھتے ہیں اور اس کے حساب اور اجزائے عدالت سے ڈرتے ہیں اور ان کا یہ خوف اصلاحی ہے کہ جو انہیں ہر کام میں احساس ذمہ داری کی دعوت دیتا ہے اور انہیں ہر قسم کی نا انصافی، ظلم اور گناہ سے روکتا ہے، کامیابی اور روئے زمین پر حکومت آخر کار انہی کا حصہ ہے۔

۲۔ "استفتحوا" کا مفہوم

اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض اسے فتح و کامرانی کے تقاضا کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس اس کا شاہد سورہ انفال کی آیہ ۱۹ میں ہے: ﴿ان تستفتحوا فقد جائكم الفتح﴾

اے مومنین ! اگر تم فتح و کامرانی کا تقاضا کرتے ہوئے تو یہ فتح و کامرانی تمہارے پاس آگئی ہے ۔

بعض قضاوت کا تقاضا کرنے کا معنی لیتے ہیں ۔یعنی انبیاء نے خدا سے تقاضا کیا کہ ان کے اور کافروں کے درمیان فیصلہ کرے ۔ اس کا شاہد سورہ اعراف کی آیہ ۸۹ ہے :﴿ربنا افتح بيننا و بين قومنابالحق و انت خير الفاتحين﴾

خدا وند!ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۔

۳۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت

تواریخ اور تفسیر میں آیاہے کہ ایک دن جابر حکمراں ولید بن یزید عب الملک اموی نے اپنے مستقبل کے لئے قرآن سے فال نکالی ۔ اتفاقاً ابتدائے صفحہ میں یہ آیت اس کے سامنے آگئی :"وا ستفتحوا وخاب کل جبار عنید" ۔

وہ بہت زیادہ پریشان ہوا ۔ اسے سخت غصہ آیا ۔یہاں تک کہ اس لعین نے وہ قرآن جو اس کے ہاتھ میں تھا پارہ پارہ کردیا پھر یہ اشعار پرھے :

اتوعد کل جبار عنید ؟ فها انا ذاک جبار عنيد

اذا ماجئت ربک يوم حشر فقل يا رب مزقنی الولید

کیا تو ہے کہ جو ہر جبار عنید کو دھمکاتا ہے ؟

تو یہ لے میں وہی جبار عنید ہوں

جب روز حشر اپنے پروردگار سے ملنا

تو کہہ دینا خداوندا !مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا

زیادہ وقت نہ گزارا کہ یہ لعین اپنے دشمنوں کے ہاتھوں بدترین طریقے سے مارا گیا ۔ انہوں نے اس کا سر کاٹ کر اسی کے محل کی چھت پر لٹکادیا اور پھر وہاں سے ہٹا کر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا ۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۵۷۹) ۔

آیت ۱۸

۱۸۔ ﴿مَثَلُ الَّذِینَ کَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ کَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیحُ فِی یَوْمٍ عَاصِفٍ لاَیَقْدِرُونَ مِمَّا کَسَبُوا عَلَی شَیْءٍ ذَلِکَ هُوَ الضَّلاَلُ الْبَعِیدُ ﴾۔

ترجمہ

جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان لوگوں کے اعمال خاکستر کی مانندہیں کہ جنہیں ایک طوفانی دن میں تیز آندھی کا سامنا کرپڑے تو ان میں یہ طاقت نہیں کہ جو انہوں نے انجام دیا ہے اسے اپنے ہاتھ میں لیں اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے ۔

تیز آندھی اور خاکستر

اس آیت میں بے ایمان افراد کے اعمال کے لئے بہت رسا او رنہایت عمدہ مثال بیان کی گئی ہے یہ آیت کفار کے انجام کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : جنہوں نے اپنے پر وردگار سے کفر کیا ان کے اعمال اس خاکستری مانندہیں جسے ایک طوفانی روز تیز آندھی کا سامنا کرناپڑے﴿مَثَلُ الَّذِینَ کَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ کَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیحُ فِی یَوْمٍ عَاصِفٍ﴾ ۔

جیسے کہ ایک طوفانی روزتیز آندھی کے سامنے راکھ اس طرح بکھر جاتی ہے کہ کوئی شخص اسے جمع نہیں کرسکتا اسی طرح منکرین ِ حق کے بس میں نہیں کہ جو اعمال وہ انجام دے چکے ہیں انہیں اپنے ہاتھ میں لے سکیں ۔ وہ سب تباہ و برباد ہوجائیں گے اور ان کے ہاتھ خالی رہ جائیں گے﴿لاَیَقْدِرُونَ مِمَّا کَسَبُوا عَلَی شَیْءٍ﴾۔اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے ﴿ذَلِکَ هُوَ الضَّلاَلُ الْبَعِیدُ﴾۔

چند اہم نکات

ان کے اعمال کو گرد و غبار کی مانند خاکستر سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے

۱۔ بکھر جانے والی راکھ :

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان کے اعمال گردو غبار کی مانند کوئی مفید نہیں ہیں انہیں خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ یعنی باقی ماندہ تھوڑی سی آگ ہے ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے ان کے اعمال کا ظاہر ہو اور اندر سے کچھ نہ ہو۔

ایک چھوٹے سے برتن میں مٹی ہو تو ہو سکتا ہے اس میں ایک خوبصورت پھول آگے لیکن اگر بہت ساری خاکستر ہو تو وہ اس قدر فضول ہے کہ اس میں سے فضول قسم کی گھاس تک نہیں اُگتی ۔

۲۔ کافروں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں :

کفار کے اعمال کو خاکستر کے ذرات میں کوئی پیوند یا جوڑ نہیں ہوتا یہاں تک کہ پانی کی مدد سے بھی انہیں ایک دوسرے سے نہیں جوڑا جا سکتا اور اس کا ہر ذرہ دوسرے سے تیزی سے لگ ہو جاتا ہے ۔

گویا یہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ مومنین کے اعمال باہم متصل اور پیوستہ ہوتے ہیں، ان کا ہر عمل دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور توحید و وحدت کی روح نہ صرف مومنین کے درمیان موجود ہے بلکہ ایک صاحبِ ایمان فرد کے اعمال کے درمیان بھی موجود ہے لیکن بے ایمان افرد کے کاموں میں ایسا کوئی بہاؤ اور اتصال نہیں ہوتا ۔

۳۔ ایک طوفانی دن اور آندھی :

تیز آندھی چلے تو راکھ بکھر جاتی ہے لیکن ”فی یوم عاصف“ (ایک طوفانی دن) کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے ۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے چلنے والی تیز ہوا راکھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر پھینک دے کہ جو زیادہ دور نہ ہو ۔ لیکن اگر دن طوفانی ہو صبح سے شام تک آندھیاں چلیں اور ہر طرف سے طوفان ہو تو ظاہر ہے اس قسم کی راکھ اس طرح سے منتشر ہوگی کہ اس کا ہر ذرہ کہیں بہت دور جا پڑے گا ۔ اس طرح سے کہ کسی کے بس میں نہ ہوگا کہ اسے جمع کر سکے ۔

۴۔ پتوں اور راکھ کے بکھر جانے میں فرق ہے :

اگر آندھی گھاس پھوس کے ڈھیر یا پتوں پر چلے اور انہیں مختلف جگہوں اور دور دراز کے مقامات پر بکھیر دے تو پھر بھی ایک اندازہ ہو سکتا ہے لیکن اگر راکھ کے چھوٹے چھوٹے ذرے بکھر جائیں تو وہ آنکھوں سے اس طرح محو ہوں گے کہ گویا بالکل نابود ہو گئے ہیں ۔

۵۔ تیز آندھی کے اثرات :

نظامِ آفرینش میں ہوا بلکہ تیز آندھی کے بہت سے اصلاحی آثار ہیں اس کے تخریبی آثار استثنائی پہلو رکھتے ہیں ۔ بہر حال اس کے مندرجہ ذیل آثار قابلِ توجہ ہیں :

الف : ہوا آندھی مختلف نباتات کے بیج مختلف جگہوں پر پھیلادیتی ہے اور ایک باغبان اور کسان کی طرح سارے کرہ ارض پر بیج بکھیر دیتی ہے ۔

ب: پودوں کی تلقیح کرتی ہے اور نر کے بیج نباتات کے مادہ حصوں پر چھڑکتی ہے ۔

ج: بادلوں کو سمندروں کی سطح سے ہانک کر خشک زمینوں کی طرف لے جاتی ہے ۔

د: بلند پہاڑوں کو آہستہ آہستہ رگڑ کر نرم اور بار آور کردیتی ہے ۔

ر: قبطی منطقوں کا موسم منطقہ استواء کی طرف اور خطِ استواء کا موسم سرد علاقوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور کرہ زمین میں حرارت کو اعتدال پر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔

س: سمندر کے پانی میں موجیں پیدا کرتی ہے اور اسے زیر و زبر کرتی ہے اس طرح اس میں ہوا پہنچتی ہے جب کہ سمندر کا پانی کھڑا اور جامد رہے تو متعفن ہو جائے ۔

اس طرح نباتات اور تمام زندہ موجودات ہوا کے چلنے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔

لیکن خاکستر کم وزن ، کھوکھلی اور سیاہ رو ہوتی ہے ۔ اس میں کوئی زندہ موجود نہیں رہ سکتا ، یہ سرسبز اور بار آور نہیں ہوتی ۔ اس کے ذرات ایکدوسرے سے بالکل جدا جدا ہوتے ہیں ۔ جب یہ خاکستر ہوا کا سامنا کرتی ہے تو فوراً ہی منتشر ہوجاتی ہے اور اس کا بے خاصیت ظاہر بھی نظروں سے محو ہو جاتا ہے ۔

۲۔ ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں ؟

یہ امر قابل غور ہے کہ بے ایمان افراد کے اعمال بے وقعت کیوں ہیں وہ اپنے اعمال سے کچھ حاصل کیوں نہیں کرپاتے ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر توحیدی نگاہ سے دیکھا جائے اور اس کے معیاروں کے مطابق تحقیق کی جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز کہ جو عمل سے شکل پذیر ہوتی ہے وہ نیت ، ہدف اور طرز عمل ہے ۔ اگر پروگرام ، ہدف اور

مقصد صحیح ہو تو عمل بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر کوئی اچھا عمل غلط مقصد اور بے وقعت ہدف کے لئے انجام دیا جائے تو وہ لا یعنی اور بے مفہوم ہو کر رہ جائے گا اور اس کی حیثیت تیز آندھی کلے سامنے خاکستر کی سی ہوگی۔

غلط نہ ہو گا کہ اگر اس بحث کو ہم ایک زندہ مثال کے ذریعے واضح کریں۔

اس وقت حقوق انسانی کے نام پر مغربی دنیا میں اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بعض کام کئے جاتے ہیں۔ انبیاء بھی حقوقِ انسانی کے تحفظ کا پرگرام لے کر آئے تے لیکن دونوں کے ماحصل اور ثمرہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

جہاں خوار طاقتیں جب حقوقِ انسانی کا دم بھرتی ہیں تو یقینا ان کا مقصد انسانی اور اخلاقی نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد اپنے جرائم اور استعماری طور طریقوں پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے کچھ جاسوس کہیں قابو آجائیں تو وہ حقوق انسانی کے نام پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن جب انہی کے ہاتھوں لاکھوں دیت نامی خاک و خوں میں غلطیاں ہوں یا ہمارے اسلامی ممالک میں وہ اپنے جرائم اور قباحتوں میں مصروف ہوں تو حقوقِ انسانی کو فراموش کردیتے ہیں بلکہ انہوں نے تو حقوقِ انسانی جھوٹے اور ظالم حکمرانوں سے تعاون کی نذر کررکھے ہیں۔

لیکن ایک سچے پیغمبر یا علی (علیہ السلام) جیسے وصی پیغمبر کے نزدیک حقوق انسانی انسانوں کی حقیقی آزادی کا نام ہے۔ وہ انسانوں کی غالمی کے طوق اور زنجیر توڑنے کی جد جہد کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مظلوم انسان کو دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں اور اس کی نجات کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

گویا جہاں خوار طاقتوں کا عمل خاکستر کی مانند ہے جسے تیز آندھی کا سامنا ہے اور انبیاء و اوصیاء کا عمل بابرکت زمین کی طرح ہے جس سے طرح طرح کی پاکیزہ نباتات پیدا ہوتی ہیں اور پھل پھول اُگتے ہیں۔

یہیں سے مفسرین کی ایک بحث واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ کہنا چاہئیے کہ ان کے سارے اعمال ہیں حتی کہ ان کے وہ اعمال بھی جو ظاہراً اچھے لیکن باطناً شرک و بت پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

۳۔ مسئلہ احباط

۳۔ مسئلہ احباط: جیسے ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں حبطِ اعمال یعنی برے اعمال یا کفر و بے ایمانی کی وجہ سے اچھے اعمال ختم ہو جانے کا مسئلہ علماء اسلام کے درمیان اختلافی ہے لیکن حق یہ ہے کہ بے ایمانی

اور کفر پر اصرار اور ہٹ دھرمی نیز بعض اعمال مثلاً حسد، غیبت اور قتلِ نفس کی ایسی بری تاثیر ہے جو نیک اعمال اور حسنات کو برباد کردیتی ہے۔ زیر نظر آیت بھی حبطِ اعمال کے امکان پر ایک اور دلیل ہے۔(جلد ۲ تفسیر نمونہ صفحہ ۶۶ (اردو ترجمہ)

۴۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لئے بھی جزاء ہے؟

مندرجہ بالا مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ علوم اور ایجاداتو انکشافات کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے سائنسدانوں نے طاقت فرساز حمتیں جھیلی ہیں اور بہ محرومیوں کو جر داشت کیا ہے تاکہ ایجاد اور انکشاف کرسکیں تاکہ اپنے ہم نوع لوگوں کے دوش سے بھاری بوجھ اتار سکیں مثلاً بجلی ایجاد کرنے والے اڈیسون نے اس قیمتی ایجاد کے لئے کیسی جانکاہ زحمتیں جھیلی ہیں۔

اس ایجاد کی برکت سے سرسبز کھیتیوں کو ٹیوب ویل سے پانی ملا ہے، درخت سرسبز ہوئے ہیں اور کھیت آباد ہوئے خلاصہ یہ کہ دنیا کاچہرہ ہی بدل گیا ہے۔

اسی طرح پاسور ہے کہ جس نے جراثیم کو دریافت کرکے لاکھوں انسانوں کو موت کے خطرے سے نجات دلادی ہے

۔

کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے سب افراد اس فرض کی بناء پر قعرِ جہنم میں گراجائیں کہ وہ ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن وہ افراد جنہوں نے عمر بھر انسانوں کی خدمت کا کوئی کام نہیں کیا ان کا مقام بہشت ہو۔

اس کا جواب یہ کہ:

اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط عمل کو دیکھنا کافی نہیں بلکہ عمل کی قدر و قیمت اس کے محرک، سبب اور مقصد کے ساتھ بنتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہسپتال، سکول یاکوئی اور مفید عمارت تعمیر کرتے ہیں اور اظہار بھی یہ کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اس معاشرے کی انسانی خدمت ہے جس کے وہ مرہونِ منت ہیں حالانکہ اس پردے کے پیچھے کوئی اور مطلب چھپا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد مقام و منصب ی امال و ثروت کا حصول ہوتا ہے یا وہ اپنے بچاؤ کے لئے ایسا کرتے ہیں یا وہ عوامل کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مادی مفادات کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ دوسروں کی نظروں سے بچ کر خیانت کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اس کے بر عکس ممکن ہے کوئی شخص پورے خلوص سے یا سوفی صد انسانی اور روحانی جذبہ سے کوئی چھوٹا سا کام انجام دے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ "عظیم لوگوں" کے عمل اور کردار کے محرک کی بھی تحقیق کی جائے۔ اگر تحقیق کی جائے تو ان کا عمل یقینا چند اشکال سے خارج نہیں ہے۔

الف: کبھی کسی ایجاد کا حقیقی مقصد تخریب ہوتا ہے (جیسے اٹامک نرجی کی دریافت پہلے پہل ایٹم بم بنانے کے لئے ہوئی)۔

پھر اس کے ساتھ نوعِ انسان کو کچھ فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں کہ جو دریافت یا ایجاد کرنے والوں کو حقیقی مقصد نہیں ہوتا یا پھر اسے ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ایجادات کرنے والوں کی ذمہ داری پوری طرح واضح ہوجاتی ہے۔

ب: کبھی ایجاد و انکشاف کرنے والے کا مقصد مادی فوائد یا نام و نمود اور شہرت کا حصول ہوتا ہے۔ ایسا شخص در حقیقت ایک تاجر کی طرح ہے کہ جو زیادہ آمدنی کے لئے زیادہ نفع بخش چیزیں بناتا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی چیزیں کچھ لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہیں اور ملک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے جب کہ اس کا مقصد سوائے آمدنی کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور اگر کسی اور کام میں زیادہ آمدنی ہو تو وہ اسے شروع کردیتا ہے۔ البتہ ایسی تجارت یا پیدا وار اگر شرعی قوانین کے مطابق ہو تو غلط اور حرام کام نہیں ہوگا لیکن کوئی مقدس عمل بھی شمار نہیں ہوگا۔

ایسی ایجادیں اور دریافتیں تاریخ میں کم نہیں ہیں کہ جو اس قسم کے طرز فکر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگر یہ لوگ دیکھیں کہ ایسے کسی کام کی نسبت دوسرے راستے میں آمدنی زیادہ ہے اگرچہ وہ معاشرے کے لئے مضر ہو (مثلاً دوا سازی کی صنعت میں ۲۰٪ منافع ہے اور ہیروئن سازی میں ۵۰٪) تو یہ دوسرے کو ترجیح دیں گے۔

ایسے لوگ نہ خدا سے کوئی مطالبہ رکھتے ہیں نہ اپنے ہم نوع انسانوں سے۔ ان کا اجر وہی فائدہ اور شہرت ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جو انہوں نے پا لیا ہے۔

ج: ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کے محرکات اور اسباب یقینا انسانی نہیں یا اگر وہ اللہ کے معتقد ہیں تو ان کے اہداف اور محرکات الٰہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی سالہا سال تجربہ گاہوں کے گوشے میں غربت و محرومی سے گزار دیتے ہیں۔

اس امید پر کہ اپنی نوع کی کچھ خدمت کر سکیں اور جہان انسانیت کو کوئی ہدیہ اور سوغات پیش کر سکیں، کسی تکلیف زدہ کے پاؤں کی زنجیر کھول سکیں اور کسی رنجیدہ خاطر کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں دور کر سکیں۔

ایسے افراد اگر ایمان اور الٰہی محرم رکھتے ہوں تو پھر ان کے بارے میں کوئی بحث نہیں اور اگر وہ ایمان اور الٰہی محرک نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرم انسانی اور لوگوں کی خدمت ہو تو اس میں شک نہیں کہ انہیں خداوند عالم کی طرف مناسب اجر اور جزا ملے گی۔ ہو سکتاہے انہیں یہ جزا دنیا میں ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے جہان میں ملے یقینا خداوند عالم و عادل انہیں محروم نہیں کرے گا۔ لیکن کسی طرح اور کس طرز پر، اس کی تفصیلات ہم پر واضح نہیں۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ "خدا اس قسم کے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا" (البتہ اگر وہ ایمان قبول نہ کرنے میں جاہل قاصر ہو تو پھر مسئلہ بہت واضح ہے)۔

اس مسئلہ دلیل حکم عقلی کے علاوہ وہ اشارات ہیں جو آیات یا روایات میں آئے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ " ان اللہ یضیع اجر المحسنین "[(۱)]

کے مفہوم میں ایسے افراد شامل نہ ہوں۔ کیونکہ قرآن میں لفظ "محسنین" کا اطلاق صرف "مومنین" نہیں ہوا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کے پاس آئے تو انہیں پہچانے بغیر عزیز مصر سمجھتے ہوئے کہنے لگے: انانراک من المحسنین

ہم تجھے نیکو کاروں میں سے سمجھتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ بھی فرمان الٰہی ہے: ﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً ومن یعمل مثقال ذرۃ شرّاً یرہ﴾

جو شخص بھی ذرہ بھر اچھا کام کرے گا اسے دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ بھر برا کام کرے گا اسے دیکھے گا۔

ایک حدیث میں علی بن یقطین کی وساطت سے امام کاظم علیہ السلام سے مروی ہے:

بنی اسرائیل میں ایک صاحب ایمان تھا۔ اس کا ہمسایہ کافر تھا۔ کافر اپنے صاحب ایمان ہمسائے اچھا سلوک کرتا تھا۔ جب وہ دنیا سے گیا تو خدا نے اس کے لئے ایک گھر بنایا تاکہ جہنم کی آگ کی تپش سے رکاوٹ ہو اور اس سے کہا گیا کہ یہ اپنے مومن ہمسائے سے تیرے نیک کے سلوک کے سبب سے ہے[(۲)]

عبد اللہ بن جدعان زمانہ جاہلیت کے مشہور مشرکین اور قریش کے سرداروں میں سے تھا۔ اس کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ سے منقول ہے:

اہل جہنم میں کمترین عذاب ابن جدعان کو ہو گا ۔

لوگوں نے پوچھا : یارسول اللہ ! کیوں

آپ نے فرمایا:انه کان یطعم الطعام

کیونکہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا تھا ۔ (۳)

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

یمن سے کچھ لوگ رسول اللہ سے بحث و تمحیص کے لئے آپ کی خدمت میں آئے ا ۔ ان میں سے ایک شخص تھا جو زیادہ باتیں کرتا تھا اور آپ سے بڑی سختی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا تھا ۔ آنحضرت کو اتنا برا لگا کہ ناپسندیدگی کے آثار آپ کے چہرہ مبارک پر پوری طرح ظاہر ہوئے ۔ اس وقت جبرائیل آئے اور یہ پیام الٰہی آپ تک پہنچایا کہ خدا فرماتا ہے : یہ شخص سخی ہے ۔ یہ بات سنتے ہیں رسول اللہ کا غصہ ختم ہوگیا ۔ اس کی طرف رخ کرکے آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے مجھے اس قسم اس قسم کا پیغام دیا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوت تو میں تجھ پر اس قسم کی سختی کرتا کہ تو دوسروں کے لئے عبرت بن جاتا ۔ اس شخص نے پوچھا : کیا آپ کے پروردگار کو سخاوت پسند ہے ؟ فرمایا : ہاں ۔ تو اس نے عرض کیا:میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سو اکوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول اور فرستادہ ہیں اور اسی خدا کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے آج تک میں نے کسی شخص کو اپنے ہاں سے محروم نہیں پلٹا یا ۔ (۴)

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بعض آیات اور بہت سے روایات سے معلم ہوتا ہے کہ ایمان یایہاں تک کہ ولایت قبولِ اعمال یا جنت میں داخلے کی شرط ہے لہذا اگر بے ایمان افراد سے بہترین اعمال سرزد ہوں تو وہ بارگاہ الٰہی میں مقبول نہیں ہوں گے ۔

لیکن اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ "قبولیت اعمال "کا ایک مفہوم ہے اور مناسب اجر ملنا دوسرا مسئلہ ہے لہذ علماء اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ مثلاً حضور قلب کے بغیریابعض گناہوں مثلاً غیبت سے نماز مقبولِ بارگاہ خدا نہیں ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسی نماز شرعاً صحیح ہے ، فرمان الٰہی کی اطاعت ہے اور اسے ذمہ داری ادا ہوجاتی ہے اور مسلم ہے کہ فرمانِ الٰہی کی اطاعت اجر و جزا کے بغیر نہیں ہوگی ۔

لہذا عمل کی قبولیت در اصل عمل کا عالی مرتبہ ہوتا ہے ۔ زیر بحث مسئلے میں بھی ہم یہی بات کہتے ہیں کہ اگر انسانوں اور عوام کی خدمات ایمان کے س اتھ ہوں تو ان کا مدہوم عالی ہوگا لیکن ایسانہ ہوتو بھی بالکل بے معنی اور بغیر اجر کے

نہیں ہوں گی ۔ جنت میں داخلے کے بارے میں بھی یہی جواب دیں گے کہ عمل کا اجر ضروری نہیں کہ جنت میں داخلے پر منحصر ہو۔(بحث کا نچوڑ اور تفصیلی بحث مناسب ہے کہ اس مسئلے کی فقہی مباحث میں ہو) ۔

۱۔یوسف ۔ ۹۰ اور بعض دیگر سورتیں ۔

۲۔ بحار الانوار جلد ص ۳۷۷ چاپ کمپانی۔

۳۔ بحار الانوار جلد ص ۳۷۷ چاپ کمپانی۔

۴۔سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۰۷۔

آیات ۱۹،۲۰

۱۹۔﴿أَلَمْ تَرَى أَنَّ اللهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ﴾۔

۲۰۔﴿وَمَا ذَلِکَ عَلَى اللهِ بِعَزِيزٍ﴾۔

ترجمہ

۱۹۔کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔

۲۰۔اور یہ کام خدا کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔

تفسیر

خلقت حق کی اساس پر ہے

گزشتہ آیت میں باطل ک اذکر ہے۔ وہ باطل کہ خاکستر کی طرح ہے۔ وہ خاکستر کہ جو پراگندہ ہے اور آندھی سے ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ زیر نظر پہلی آیت میں حق کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ حق کے استقرار سے متعلق ہے۔

روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے دنیا کے تمام طالبان حق کے لئے نومنے کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے﴿أَلَمْ تَرَى أَنَّ اللهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ﴾۔

”حق“ جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے در اصل ”مطابقت“ اور ہم آہنگی“ کے معنی میں ہے لیکن کے اس کے استعمال کے مواقع مختلف ہیں۔

بعض اوقات حق ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو حکمت کے موافق اور نظم و نسق کے مطابق کیا گیا ہو جیسا کہ قرآن میں ہے:هو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نور ماخلق ذٰلک الاباالحق

وہ وہی ہے کہ جس نے خورشید کو روشنی او رچاند کو نور افشانی کا ذریعہ قرار دیا ہے اس نے یہ کام حکمت اور حساب وکتاب کے بغیر انجام نہیں دیا۔

(یونس ۔ ۵)

کبھی اس ذات کو حق کہا جاتا ہے جو اس قسم کا کام انجام دے۔ جیسے اللہ کے لئے اسی لفظ کا اطلاق ہوا ہے:

فذٰلکم اللہ ربکم الحق

تمہارا یہ خدا تمہارا پروردگار ہے ۔ (یونس ۔ ۳۲)

کبھی ایسے اعتقاد کو حق کہا جاتا ہے جو حقیقت کے مطابق ہو ۔ مثلاً

﴿فهدی الله الذی أمنوا لما اختلفوا فیه من الحق﴾

جن اعتقاد میں اختلاف کرتے ہیں خدا نے ایمان والوں کو ان میں حق کی ہدایت کی ہے ۔ (بقرہ ۔ ۲۱۳)

کبھی ایسی گفتگو اور عمل کو حق کہا جاتا ہے کہ جو ضروری مقدار کے مطابق ہو اور اس وقت انجام دیئے جب ضروری ہو ۔ مثلاً ﴿حق القول منی لاملئن جهنم﴾

مجھ سے یہ قول حق صادر ہوا ہے کہ میں جہنم کو (گنہگاروں سے) بھر دوں گا ۔ (سجدہ ۔ ۱۳)

بہر حال "حق" کے مقابل باطل "ضلال" ۔ "لعب". بیہودہ اور اس قسم کے دیگر کام ہیں لیکن زیر بحث آیت میں بلا شبہ اس پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے ۔ یعنی عالم آفرینش کے عمارت اور آسمان و زمین سب نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی خلقت میں نظم و نسق، حساب وکتاب اور حکمت وہدف ہے ۔ خدا کو انہیں خلق کرنے کی احتیاج تھی نہ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اور نہ ان سے وہ اپنی ذات کی کسی کمی کو دور کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے بلکہ یہ وسیع و عریض جہان مخلوقات کی پرورش اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکامل و ارتقاء بخشنے کی منزل ہے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس بات کی دلیل ہے کہ اسے تمہاری اور تمہارے ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہے کہ "اگر وہ ارادے کرے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق لے آئے" ایسی مخلوق کہ جو ساری کی ساری ایمان رکھتی ہو اور تمہارے غلط کاموں میں سے کسی کو انجام نہ دے ﴿إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيأت بِخَلْقٍ جَدِيدٍ﴾۔

اور یہ کام خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے ﴿وَمَا ذَلِکَ عَلَى اللهِ بِعَزِيزٍ﴾ ۔

اس گفتگو کی شاہد سورہ نساء کی یہ آیت ہے:

﴿فان تکفروا فان لله مافی السمٰوات و الارض و کان الله غنیاً حمید ان یشاء یذهبکم ایهاالناس و یأت بأخرین و کان الله علیٰ ذٰلک قدیرا﴾ ۔

اگر تم کافر ہو جاؤ تو اس سے خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہے اور خدا بے نیاز اور لائق حمد ہے اے لوگو! وہ جب چاہے تمہیں لے جائے اور دوسرا گروہ لے آئے اور یہ کام خدا کے لئے آسان ہے ۔ (نساء ۱۳۱ ۔ تا ۔ ۱۳۳)

مذکورہ بالا آیت کے متعلق یہ تفسیر ابن عباس سے بھی نقل ہوئی ہے ۔

ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے یعنی خدا کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں کہ سب انسانوں کو لے جائے اور دوسری مخلوق پیدا کرنے تو کیا اس قدرت کے باوجود مسئلہ معاد دوسرے جہان کی طرف تمہاری بازگشت میں تمہیں شک ہو سکتا ہے ؟

آیات ۲۱،۲۲،۲۳

۲۱۔﴿وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللَّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ﴾۔

۲۲۔﴿وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾۔

۲۳۔﴿وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ﴾۔

ترجمہ

۲۱۔اور (قیامت کے روز) وہ سب خدا کے سامنے ظاہر ہوں گے تو اس وقت ضعفاء (نادان پیرو کار) متکبرین سے کہیں گے: ہم تمہارے پیرو کار تھے۔ تو کیا (اب جب تمہاری پیروی کی وجہ سے ہم عذاب ِخدا میں گرفتار ہوئے ہیں) تم تیار ہو کہ عذاب الٰہی کا کچھ حصہ قبول کرو اور اہم سے اسکا بوجھ اٹھا لو۔ تو وہ کہیں گے کہ اگر خدا نے (عذاب سے رہائی کی طرف)ہماری ہدایت کی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت کرتے (معاملہ اس سے آگے نکل گیا ہے)چاہے ہم بے قرار ہوں یا صبر کریں، ہمارے لئے کوئی فرق نجات کی راہ موجود نہیں ہے۔

۲۲۔ اور جس وقت کام تمام ہو گیا تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا اور میں نے تم سے (باطل)وعدہ کیا اور خلاف ورزی کی۔ میں تم پر کوئی تسلط نہیں رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے قبول کر لی ۔ لہٰذا مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو سرزنش نہ کرو، میں تمہارا فریادرس ہوں نہ تم میرے فریادرس ہو۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا (اور میری اطاعت کو اطاعت خدا کے ہم پلہ قرار دیا) اور یہ تم پہلے ہی سے کرتے تھے، میں اس سے بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۲۳۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہ باغات بہشت میں داخل ہوں گے۔ ایسے باغات کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان میں رہیں گے اور وہاں ان کا تحیہ سلام ہو گا۔

تفسیر

شیطان اور اس کے پیرو کاروں کی صریح گفتگو

گزشتہ چند آیات میں ہٹ دھرم اور بے ایمان منحرفین کے لئے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ زیر بحث آیات اسی مفہوم کا تسلسل ہیں ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے : روز قیامت تمام جابر، ظالم اور کافر بارگاہ خداوندی میں پیش ہوں گے چاہے وہ تابع ہوں یا متبوع اور پیرو ہوں یا پیشوا ﴿وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ ۔[۱]

اس وقت ضعفاء یعنی نادان پیرو کار کہ جو اندھی تقلید کی وجہ سے اپنے آپ داوی ضلالت میں سرگرداں کر چکے تھے مستکبرین سے کہ جو ان کی گراہی کے سامل تھے، کہیں گے : ہم تمہارے پیرو تھے ۔ اب جب کہ ہم تمہاری رہبری کے باعث ان کے سب عذابوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں، کیا ممکن ہے کہ تم بھی ان عذابوں کا کچھ حصہ قبول کر لو تاکہ ہمیں تخفیف مل جائے﴿فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللهِ مِنْ شَيْءٍ﴾۔

لیکن وہ کہیں گے : اس کیفرِ کردار اور عذاب سے اگر خدا ہماری ہدایت نجات کی طرف کتا تو ہم بھی تمہاری راہنمائی کرتے﴿قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللهُ لَهَدَيْنَاكُمْ﴾ ۔

لیکن افسوس کہ معاملہ اس سے آگے نکل چکا ہے "چاہے ہم بے قرار ہوں اور جزع و فزع کریں چاہے صبر کریں ہمارے کوئی راہ، نجات نہیں ہے "﴿سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت :

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت : اس آیت کے سلسلے میں جو پہلا سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ کیا لوگ اس جہان میں علم، خدا کے سامنے ظاہر نہیں ہیں کہ جو مذکورہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں سب کے سب بارگاہ خدا میں ظاہر ہوں گے ؟

اس سوال کے جواب میں بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ وہ خود اور ان کے سب اعمال بارگاہِ خدا میں ظاہر ہیں لیکن قیامت میں یہ ظہور سب محسوس کریں گے ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں مراد قبروں سے نکلنا اور حساب و کتاب کے لئے عدل الٰہی کی عدالت کے سامنے پیش ہونا ہے ۔

یہ دونوں تفسیریں خوب ہیں اور کوئی مانع نہیں کہ دونوں ہی آیت کے مفہوم میں داخل ہوں ۔

۲۔ "﴿لو هدانا الله لهديناكم﴾" کا مفہوم

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد اس جہان میں عذاب الٰہی سے نجات کے طریقے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ بات مستکبرین اپنے پیروکاروں کے جواب میں کہیں گے کہ جب پیرو ان سے عذاب کا کچھ حصہ قبول کرنے کا تقاضا کریں گے سوال و جواب کا تقاضا ہے کہ مراد عذاب سے رہائی کے طریقے کی ہدایت ہو۔

اتفاق سے یہی تعبیر (ھدایت) نعمات ِبہشت تک پہنچنے کے بارے میں بھی نظر آتی ہے ۔ اہل جنت کی زبانی ہے :

﴿وقالوا الحمد لله الذى هدانا لهذا و ماكنا لنهتدى لولا ان هدنا الله﴾

وہ کہیں گے : شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ان نعمتوں کی طرف ہدایت کی ہے اور اگر اس کی توفیق وہدایت نہ ہوتی تو ہمیں ان کی راہ نہ ملتی ۔ (اعراف۔۴۳)

یہ احتمال بھی ہے کہ رہبران ضلالت سے جب ان کے پیرو کار تقاضا کریں گے تو اپنے تئیں گناہ سے بری کرنے کے لئے گراہی کے تمام علمبرداروں کی طرح کہ جو اپنی خراب کاری دوسروں کے سر تھونپ دیتے ہیں ، وہ بڑی ڈھٹائی سے کہیں گے : ہم کیا کریں اگر خدا ہمیں سیدھے واستے کی ہدایت کرتا تو ہم بھی تمہیں ہدایت کرتے یعنی ہم تو مجبور تھے اور ہمارا اپنا تو کوئی ارادہ ہی نہ تھا ۔

یہی شیطان کی منطق ہے کہ جس نے اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لئے خدائے عادل کی طرف جبر کی نسبت دیتے ہوئے کہا:﴿فبما اغوينى لاقعدن لهم صراطك المستقيم﴾

اب جب کہ تونے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی تیرے سیدھے راستے میں بیٹھا ان کی تاک میں رہوں گا (اور انہیں منحرف کروں گا)(اعراف۔ ۱۶) ۔

لیکن توجہ رہے کہ مستکبرین چاہیں نہ اوچاہیں صریح آیاتِ قرآن اور واضح روایات کی رو سے اپنے پیرو کاروں کے گناہ کی ذمہ داری کو بوجھ بہر حال انہیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا کیونکہ وہ انحراف کی بانی اور گمراہی کے عامل تھے البتہ پیر وکاروں کی ذمہ داری اور عذاب و سزا میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔

۳۔ اندھی تقلید کی مذمت

مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ:

اولا۔ وہ لوگ جو آنکھ کان بند کرکے اس کے اور اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں کہ گویا ہر شخص کے ہاتھ اپنی باگ دوڑ تھمادیتے ہیں وہ بے وقعت اور بے حیثیت لوگ ہیں قرآن ان کے لئے "ضعفاء" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

ثانیا۔ ان کا اور ان کے پیشواؤں کا انجام ایک ہی ہے اور وہ بے چارے سخت ترین حالات میں بھی اپنے گمراہ رہبروں کاتعاون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے رہبروں کی سزا اور عذاب میں ذرہ بھر تخفیف نہیں کروا سکیں بلکہ شاید تمسخر سے انہیں جواب دیں گے کہ بے کار واویلا کرو کیونکہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۴۔ "برزو" اور محیص" کا مفہوم

برزوا" در اصل "بروز" کے مادہ سے ظاہر ہونے اور پردے سے باہر آنے کے معنی میں ہے۔ نیز اس کا معنی میدانِ جنگ میں صف سے باہر نکل کر حریف کے مقابلے میں آکھڑے ہونا بھی ہے۔ اصطلاح یہ لفظ مبارزہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"محیص" "محص" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے عیب یا تکلیف سے نجات پانا۔

اس کے بعد جابروں، گنہگاروں اور شیطان کے پیروکاروں کی روز قیامت روحانی اور نفسیاتی عذا اور سزا کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جب صالح اور غیر صالح بندوں کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا او رہر ایک اپنے قطعی انجام کا پہنچ جائے گا تو شیطان اپنے پیرو کاروں سے کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا تھا اور میں نے بی تم سے وعدہ کیا تھا (جیسا کہ تم خود جانتے ہو وہ فضول اور بے قیمت وعدہ تھا) پھر میں نے اپنے وعدے کے خلاف کیا

﴿وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ﴾۔

گویا اس طرح شیطان بھی دیگر راہِ ضلالت کے ہبر مستکبرین کا ہم آواز ہوتا ہے اور اپنے ان بد بخت پیرو کاروں پر ملامت و سرزنش کے تیر چلاتا ہے پھر مزید کہتا ہے: میں تم پر کوئی جبری طور پر مسلط نہ تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں نے

تمہیں دعوت دی اور تم نے اپنی مرضی سے اسے قبول کیا ﴿وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلاَّ أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي﴾ ۔ "لہٰذا مجھے سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو" کہ تم نے میری شیطنت آمیز اور ظاہر الفساد دعوت کو کیوں قبول کیا ﴿فَلاَتَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ﴾۔ تم نے خود یہ کام کیا ہے لہٰذا لعنت تم پر ہو ۔

بہر حال "پروردگار کے قطعی حکم اور عذاب کے سامنے نہ میں تمہاری فریاد رسی کرسکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کرسکتے ہو" ﴿مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ﴾۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری طرف سے مجھے شریک قرار دینے اور میری اطاعت کو اطاعت ِ الٰہی کے ہم پلہ قرار دینے سے بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں ﴿إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِي مِنْ قَبْلُ﴾ ۔

اب میں سمجھا ہوں کہ "اسی اطاعت میں شرک کرنے نے" مجھے بھی بد بخت کیا ہے اور تمہیں بھی ، وہی بد بختی اور بے چارگی کہ جس کی تلافی کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے ، جان لوکہ " ظالموں کے لئے یقیناً دردناک عذاب ہے "۔ ﴿إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ ۔

چند اہم نکات

۱۰۔ شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب

"شیطان" کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے اور اسمیں جنوں اور انسانوں میں سے تمام طاغوطی اور وسوسہ گر شامل ہیں لیکن اس آیت اور گزشتہ آیت میں جو قرائن موجودہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یقیناً مراد شخصی طور پر ابلیس ہے کہ جو تمام شیطانوں کا گروشمار ہوتا ہے ۔ اسی لئے تمام مفسرین نے اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے ۔ (۲)

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی وسوسے انسان کے اختیار وارادہ کو ہر گز سلب نہیں کرتے ۔ بلکہ ان کی حیثیت ایک دعوت دینے والے سے زیادہ نہیں اور یہ انسان ہے جو اپنے ارادے سے شیطان کی دعوت قبول کرتا ہے ۔ البتہ ممکن ہے شیطانی کاموں کے لئے طبیعت ہموار ہو جانے اور انسانی مقاصد کے خلاف مسلسل کام کرنے سے انسان ایسے مقام تک جاپہنچے جس سے وسوسوں کے مقابل ایک طرح کی سلبِ اختیار کی حالت پیدا ہوجائے جیسے ہم بعض منشیات کے عادی لوگوں کو دیکھتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا اصل سبب اختیاری ہے لہٰذا نیجہ کچھ ہو اختیاری ہی شمار ہو گا ۔

سورہ نحل کی آیہ ۱۰۰ میں ہے : ﴿انما سلطانه على الذين يتولونه و الذين هم مشركون﴾

شیطان کا تسلط صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اپنے لئے اس کی سرپرستی قبول کرلی ہے اور جنہوں نے اطاعت میں اسے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔

ضمناً شیطان ان لوگوں کو دندان شکن جواب دیتا ہے جو اپنے گناہ اس کی گردن پر ڈال دیتے ہیں، اپنے انحرافات کا عامل اسے شمار کرتے ہیں اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ شیطان بعض گنہگاروں کی اس عامیانہ منطق سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔ در اصل انسان پر حقیقی تسلط اس کے ارادے اور عمل کا ہے نہ کہ کسی اور چیز کا۔

۲۔ روز حشر شیطان کا اپنے پیرو کاروں سے رابطہ

اس عظیم محضر میں شیطان کس طرح اپنے تمام پیرو کاروں سے رابطہ قائم کرسکے گا اور کس طرح انہیں ملامت کرے گا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یقینا خدا اسے یہ طاقت دے گا۔ در اصل شیطان کے پیرو کاروں کے لئے یہ ایک طرح کا روحانی اور نفیاتی عذاب ہے۔ یہ اس جہان میں اس راستے پر چلنے والوں کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے کہ وہ ابھی سے اپنا اور اپنے رہبر کا انجام دیکھ لیں۔ بہرحال خدا کسی طرح سے شیطان اور اس کے پیروں کے درمیان یہ ارتباط فراہم کرے گا۔

۳۔ گمراہی کے دیگر پیشواون کا طرز عمل

یہ امرجاذب نِظر ہے کہ روز قیامت ایسی ملاقات صرف شیطان اور اس کے پیروکاروں کے درمیان نہ ہوگی بلکہ ضلالت و گمراہی کے تمام پیشوا اس جہاں میں ایسا ہی کریں گے۔ وہ اپنے پیروکاروں کا ہاتھ (خود ان کی مرضی سے) پکڑیں گے۔ انہیں بلاؤں اور بلاؤں اور بدبختیوں کی موجوں کی طرف کھینچ لے جائیں گے اور جب وہ دیکھیں گے کہ حالات برے ہیں تو انہیں چھوڑ کر چلتے بنیں گے۔

یہاں تک کہ ان سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور انہیں ملامت کریں گے۔ بزبان اصطلاح انہیں دنیا و آخرت کے خسارے میں گرفتار کریں گے۔

۴۔ "مصرخ" کا مطلب

"مصرخ" اصراخ" کے مادہ سے اصل میں "صرخ" مدد کے لئے پکارنے اور فریاد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس بناء پر " مصرخ " فریادرس کے معنی میں ہے اور " مستصرخ" اس شخص کے معنی میں ہے جو فردرسی چاہے۔

۵۔ شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد

شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد شرکِ اطاعت ہے نہ کہ شرکِ عبادت۔

۶۔ "ان الظالمین لھم عذاب الیم "کس کا جملہ ہے:

یہ جملہ شیطان کی باتوں کا آخری حصہ ہے یا پروردگار کی طرف سے مستقل جملہ ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ لیکن زیادہ ترجیحی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے مستقل جملہ ہے کہ جو شیطان کی اپنے پیروکاروں سے گفتگو کے بعد ایک اصلاحی و تربیتی درس کے طور پر آیا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں سرکش و بے ایمان جابر افراد کی حالت اور ان کا دردناک انجام بیان کرنے کے بعد مومنین کی حالت اور ان کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دئیے وہ باغات بہشت میں داخل ہوں گے، وہ باغات کے جن کے درختوں کے نیچے پانی نہریں جاری ہیں ﴿وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ﴾۔

"تحیت" دراصل "حیات" کے مادہ سے لیا گیا ہے بعد ازاں یہ لفظ افراد کی سلامتی اور حیات کی دعا کے لئے استعمال ہونے لگا۔ہر قسم کی سلام و دعا کہ جو ابتدائے ملاقات میں کہی جاتی ہے، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں "تحیت" وہ خوش آمدید او ردرود و سلام جو اللہ تعالیٰ نے صاحب ایمان پر بھیجا ہے اور انہیں اپنی نعمتِ سلامتی کا ہم آغوش قرار دیتا ہے۔

سلامتی ہر قسم کی ناراحتی اور درد و غم سے سلامتی

سلامتی ہر قسم کی جنگ و نزع سے سلامتی

اس مفہوم کی بناء پر " تحیتھم "کی اضافت کی طرف ہے اور اس کا فاعل خدا تعالیٰ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مراد وہ تحیہ و سلام ہے جو مومنین ایک دوسرے سے کہیں گے یا فرشتے ان سے کہیں گے۔

بہر حال لفظ " سلام "جو بطور مطلق آیا ہے، اس کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کی سلامتی پر محیط ہے اور ہر قسم کی ناراحتی اور تکلیف سے سلامتی پر مشتمل ہے چاہے روحانی ہو یا جسمانی۔ ۳

۲۔ سلام و تحیت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم، سورہ نساء آیت ۸۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں (ص ۵۴ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کیجئے گا)۔

آیات ۲۴،۲۵،۲۶،۲۷

۲۴۔﴿أَلَمْ تَرَى كَيْفَ ضَرَبَ اللهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِى السَّمَاءِ﴾۔

۲۵۔﴿تُؤْتِى أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾۔

۲۶۔﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾۔

۲۷۔﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِى الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللهُ مَا يَشَاءُ﴾۔

ترجمہ

۲۴۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے کلمہ طیبہ (اور گفتار پاکیزہ) کو پاکیزہ درکت سے تشبیہ دی ہے کہ جس کی جڑ (زمین میں) ثابت ہے اور جس کی شاخ آسمان میں ہے۔

۲۵۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے بر وقت اپنے پھل دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۶۔ اور (اسی طرح) کلمہخبیثہ کو ناپاک درخت سے تشبیہ دی ہے کہ زمین سے اکھڑ چکا ہے اور اس کے لئے قرار و ثبات نہیں ہے۔

۲۷۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اللہ ان کی گفتار اور اعتقاد کے ثبات کی وجہ سے ثابت قدم رکھے گا، اس جہان میں بھی اور آخرت میں بھی۔ نیز اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے (اور ان سے اپنا لطف و کرم چھین لیتا ہے) اور خدا جو کام چاہے (اور قرین مصلحت سمجھے) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

"شجرہ طیبہ" اور "شجرہ خبیثہ"

یہاں حق و باطل، ایمان وکفر اور طیب و خبیث کو ایک نہایت عمیق اور پر معنی مثال کے ذریعے مجسم کرکے بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات اس سلسلے کی گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے کس طرح پاکیزہ کلام کے لئے مثال دی ہے اور اسے طیب و پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے ﴿أَلَمْ تَرَى كَيْفَ ضَرَبَ اللهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾۔
پھر اس شجرہ طیبہ یعنی پاکیزہ و بابرکت درخت کی خصوصیات بیان کی گئی ہے اور مختصر عبارت میں اس کے تمام پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
اس سے پہلے کہ ہم قرآن میں موجود اس شجرہ کی خصوصیات کا مطالعہ کریں" ہمیں دیکھنا چاہئیے کہ "کلمہ طیبہ" سے مراد کیا ہے۔
بعض مفسرین نے اس کو کلمہ توحید اور جملہ " لا الہ الا اللہ " سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسرے اسے اوامر و فرمین الٰہی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ بعض اسے ایمان سمجھتے ہیں کہ جو لا الہ الا اللہ کا معنی و مفہوم ہے۔ بعض دوسروں سے اس کی " مؤمن "" سے تفسیر کی ہے اور بعض نے اس کا مفہوم اصلاحی و تربیتی روش اور رائحہ عمل بیان کیا ہے۔ (۱)
لیکن "کلمہ طیبہ" کے مفہوم و معنی کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں یہ تمام تفاسیر شامل ہیں کیونکہ لفظ "کلمہ" کے وسیع معنی میں تمام موجودات شامل ہیں۔ اسی بناء پر مخلوقات کو "کلمۃ اللہ "کہا جاتا ہے۔ (۲)
نیز "طیب" ہر قسم کی پاک و پاکیزہ چیز کو کہتے ہیں۔
نتیجہ کلام یہ ہے کہ اس مثال کے مفہوم میں ہر پاک سنت، حکم، پروگرام، روش، عمل، انسان شامل ہے۔ مختصر یہ کہ ہر پاک و بابرکت موجود کلمہ طیبہ ہے اور یہ سب ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہیں کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں:
۱۔ وہ موجودہ کہ جو نشو و نما کا حامل ہے نہ کہ بے روح، جامد اور بے حرکت ہے۔ بڑھنے اور پھلنے پھولنے والا ہے۔ دوسروں کی اور اپنی پرورش و اصلاح کرنے والا ہے۔ لفظ " شجرہ "اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔
۲۔ یہ درخت پاک و طیب ہے لیکن کس لحاظ سے، اس سلسلے میں کسی خاص پہلو کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ لہذا اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ہر پہلو سے پاکیزہ ہے۔ اس کا پھل پاکیزہ ہے، اس کے شگوفے اور پھول پاکیزہ ہیں، اس کا سایہ پاکیزہ ہے اور اسے خارج ہونے والی گیس پاکیزہ ہے۔
۳۔ یہ درخت ایک منظم نظام کا حامل ہے۔ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری ہے۔ اصولی طور پر اس میں جڑ اور شاخ ک اوجود اس میں موجود منظم نظام کی دلیل ہے۔

۴۔ اس کی جڑ اور ریشہ ثابت و مستحکم ہے۔ اس طرح سے کہ طوفان اور تند و تیز آندھیاں اسے اس کی جگہ اکھاڑ نہیں سکتیں۔ اس میں ایسی توانائی ہے کہاس کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی شاخیں سورج کی کرنوں کے نیچے اور آزاد ہوا میں محفوظ ہیں کیونکہ جو شاخ جتنی اونچی ہو اسے اتنی ہی قوی تر جڑ کی ضرورت ہے ﴿أَصْلُهَا ثَابِتٌ﴾۔

۵۔ اس شجرہ کی شاخیں کسی پست اور محدود ماحول میں نہیں ہیں بلکہ وہ آسمان کی بلندیوں میں ہیں۔ یہ شاخیں ہوا کا سینہ چیز کی بلندی پر جا پہنچیں ہیں۔ جیا ہاں "اس کی شاخیں آسمان میں ہیں" ﴿وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾۔

واضح ہے کہ شاخیں جس قدر بلند ہوں گی، زمین کے گرد و غبار سے اتنی ہی دور ہوں گی اور ان کے پھل اتنے ہی زیادہ پاکیزہوں گے اور ایسی شاخیں سورج کی کرنوں اور پاکیزہ ہوا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور ان کا اثر طیب پھلوں پر بہتر بہتر ہو گا۔ (۳)

۶۔ یہ شجرہ طیبہ پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ یہ ان درختوں کی مانند نہیں کہ جو بے ثمر ہوتے ہیں "یہ درخت اپنا پھل دیتا ہے" ﴿تُؤْتِي أُكُلَهَا﴾۔

۷۔ اور ایہ ایسا درخت ہے جو ایک دو فصلوں میں پھل نہیں دیتا بلکہ ہر موسم میں اس پر پھل لدے ہوتے ہیں تو جب بھی اس کی جانب ہاتھ بڑھائے محروم نہیں لوٹے گا ﴿كُلَّ حِينٍ﴾۔

۸۔ اس کا یہ پھل کسی پروگرام کے بغیر نہیں بلکہ قوانین فطرت کے مطابق سنتِ الٰہی کے تحت اور "اپنے پروردگار کے اذن سے" ہے اور سب کے لئے عام ہے ﴿بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾۔

اس "شجرہ طیبہ" کی یہ خصوصیات آپ کے سامنے ہیں اب غور کیجئے کہ یہ برکات کس درخت کو حاصل ہیں۔ یقینا یہ خوبیاں او رمرکتیں کلمہ توحید اور اس کے معنی میں موجود ہیں، ایک موحد اور صاحب معرفت انسان کو حاصل ہیں اور ایک اصلاحی اور پاکیزہ لائحہ عمل میں موجود ہیں اور یہ سب مفاہیم محکم و ثابت جڑوں کے حامل ہیں، سب میں ایسی فراواں شاخیں ہیں جو آسمان سے باتیں کرنے والی ہیں اورمادی آلوگیوں او رکثافتوں سے دور ہیں۔ سب ثمر آور، نور افشاں اور فیض بخش ہیں۔

جو شخص جو وقت بھی ان کے پاس آئے اورہاتھ ان کے شاخسارِ وجود کی طرف پھیلائے ان کے لذیز و معطر اور قوت بخش پھلوں سے اپنا دامنِ مراد بھر لے گا۔ حوادث کی تیز آندھیاں اور سخت طوفان انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں

سکتے اور ان کا افق فکر چھوٹی سی دنیا میں محدود نہیں ہے وہ زمان و مکان کے حجاب چاک کرکے ابدیت کی طرف آگے بڑھتے ہیں ۔

ان کا پروگرام ہوا و ہوس کے تابع نہیں بلکہ سب کے سب اذن پروردگار سے اس کے فرمان کے مطابق آگے بڑھے اور حرکت کرتے ہیں اور یہی ان کے ثمر بخش ہونے کا سرچشمہ ہے ۔

پروردگار کے ان کلمات ِطیبہ عظیم و با ایمان جوانمردوں کی زندگی برکت کا باعث ہے اور ران کی موت ہے اور ران کی موت حرکت کا سبب ہے ا، ان کے آثار، ان کے کلمات ، ان کی باتیں ، ان کے شاگرد، ان کی کتابیں، ان کی پرافتخار تاریخ حتیٰ کہ ان کی خاموش قبریں سب کی سب الہام بخش ، سرچشمہ ہدایت ، انسان ساز اور تربیت کنندہ ہیں ۔

جی ہاں ! خدا اس طرح سے لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ سمجھ جائیں " ﴿وَيَضْرِبُ اللهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴾ ۔

یہاں مفسرین کے درمیان ایک سوال پیدا ہوا اور وہ یہ ہے کی کوئی درخت مذکورہ بالاصفات کا وجودِ خارجی رکھتا ہے کہ جس سے کلمہ طیبہ کو تشبیہ دی گئی ہے ایسا درخت موجود ہے اور روہ کھجور کا درخت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مجبوراً" کل حین "کی تفسیر "چھ ماہ، بیان کی ہے ۔

لیکن کسی وجہ سے بھی ضروری نہیں کہ ہم اس قسم کے درخت کے وجود پر اصرار کریں بلکہ مختلف زبانوں میں ایسی بہت تشبیہیں موجود ہیں جو بالکل وجودِ خاجی نہیں رکھیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ قرآن ایسے آفتاب کی مانند ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آفتاب ہمیشہ غروب کرتا ہے) یا کہا جاتا ہے کہ میرا ہجر ایسی رات کی طرح ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتی (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شب ختم ہو جاتی ہے) ۔

بہرحال تشبیہ کا مقصد چونکہ حقائق کو مجسم کرنا ہے اور عقلی مسائل کو محسوس کے قالب میں ڈھالنا ہے لہٰذا ایسی تشبیہات میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ پوری طرح دلنشیں ، مؤثر اور جاذب ہیں ۔

اس کے باوجود دنیا میں ایسے درخت موجود ہیں جن کی شاخوں پر سے سارا سال پھل ختم نہیں ہوتے یہاں تک کہ ہم نے خود گرم علاقوں میں بعض ایسے درخت دیکھے ہیں کہ ان پر پھل بھی موجود تھا اور تازہ پھول بھی اُگے ہوئے تھے اور نئے پھل کے آثار بھی موجود تھے جب کہ موسم سردیوں کا تھا ۔

مسائل سمجھنے اور افہام و تفہیم کا بہترین طریقہ چونکہ موازنہ کرنا ہے لہٰذا شجرہ طیبہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: رہی مثال کلمہ خبیثہ کی، تو وہ خبیث، ناپاک اور بے ریشہ درخت کی مانند ہے کہ جو زمین سے اکھڑ چکا ہے اور طوفان آتے ہیں تو روزانہ کسی اور کونے میں جا گرتا ہے اور اسے قرار و ثبات یسر نہیں ﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴾ ۔

"کلمہ خبیثہ" وہی کفر و شرک کا کلمہ ہے، گھٹیا، قبیح اور رہری گفتار ہے، گمراہ کن اور غلط پروگرام ہے اور ناپاک و آلودہ انسان ہیں خلاصہ یہ کہ ہر خبیث اور ناپاک چیز کلمہ خبیثہ ہے۔

واضح ہے کہ ہر ناکارہ اور قبیح و منحوس درخت کہ جس کی جریں اکھڑ گئی ہوں اس میں نہ نشو و نما ہوگی، نہ ترقی و تکامل، نہ پھل پھول، نہ سایہ و منظر اور نہ ثبات و قرارده تو ایک لکڑی جو سوائے جلانے اور آگ لگانے کے کسی کام کی نہیں بلکہ راستے کی رکاوٹ ہے۔ ایسا درخت کبھی گزند پہنچاتا اور مجروح کرتا ہے ی الگوں کے لئے تکلیف و آزار کا باعث بنتا ہے ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ شجرہ طیبہ کی تعریف میں قرآن تفصیل سے بات کرتا ہے لیکن جب شجرہ خبیثہ کے ذکر کا موقع آتا ہے۔ تو ایک مختصر سا جملہ کہہ کر گزر جاتا ہے۔ صرف اتنا کہتا ہے۔﴿اجتثت من فوق الارض مالها من قرار﴾

یہ زمین سے اکھڑا ہوا ہے اور اسے ثبات و قرار نہیں ہے۔

کیونکہ جس وقت یہ ثابت ہوگیا کہ یہ درخت جڑ کے بغیر ہے تو پھر شاخ و برگ اور پھل پھول کے ذکر کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ علاوہ ایں یہ ایک طرح کی لطافتِ بیان ہے کہ انسان محبوب کا ذکر کوتا ہے تو اس کی تمام خصوصیات بیان کرتا ہے لیکن جب "مبغوض" کے ذکر کا موقع آتا ہے تو بس ایک نفرت انگیز جملہ کہہ کے آگے بڑھ جاتا ہے ۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین اس درخت کے متعلق کہ جو مشبہ بہ کے طور پر آیا ہے کے بارے میں سوال اٹھا تے ہیں کہ یہ کونسا درخت ہے۔

بعض نے اسے "حنظل" سمجھا ہے کہ جس کا پھل بہت تلخ اور برا ہوتا ہے

بعض نے اسے "کشوت" (بروزن "سقوط") کہا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ سا پودا ہے، جو بیابانوں میں خاردار بوٹوں سے لپٹ کر اوپر چلا جاتا ہے۔ نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ پتے (توجہ رہے کہ " شجر "لغت میں درخت کو بھی کہا جاتا ہے اور پودے کو بھی)۔

لیکن جیسا کہ ہم نے "شجرہ طیبہ "کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر تشبیہ میں " مشبہ بہ " ان تمام صفات کے ساتھ وجود خارجی رکھتا ہو بلکہ یہاں مقصد کلمہ شرک، انحرافی طرز عمل اور خبیث لوگوں کی حقیقی چہرہ کو مجسم طور پر پیش کرنا ہے اور بتانا ہے کہ وہ ان درختوں کی طرح ہیں جن کی ہر چیز خبیث او ناپاک ہے اور ان کا ثمر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ راستے میں مزاحم ہوتے ہیں اور درد سر کا باعث بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے ناپاک درخت کم نہیں کہ جو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہوں اور بیابان میں طوفان اور تیز آندھی کی زد پر ہوں۔

مذکورہ بالا آیت میں دو ناطق مثالوں کے ذریعے ایمان و کفر، مومن و کافر اور کلی طور پرہ رپاک و ناپاک وجود کو مجسم شکل میں ذکر کیا گیا ہے لہذ آخری زیر نظر آیت میں نتیجہ کار اور ان کا انجام آخر ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ایمان لانے والوں کو خدا ان کی ثابت و پائدار گفتار و اعتقاد کے سبب ثابت قدم رکھتا ہے، اس جہاں میں بھی اور اس جہاں میں بھی ﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾۔

کیونکہ ان کا ایمان سطحی اور متزلزل نہیں ہوتا نہ ان کی شخصیت کھوکھلی اور متلون ہوتی ہے بلکہ وہ ایک شجرہ طیبہ ہیں کہ جس کی جڑیں ثابت و پائدہیں اور جس کی شاخیں آسمان کی طرح بلندہیں اور چونکہ کوئی شخص لطف ِخدا سے بے نیاز نہیں، دوسرے لفظوں میں ہر نعمت بالآخر اس کی ذات ِپاک کی طرف لوٹتی ہے لہذا یہ سچے ثابت قدم مومنین لطفِ خد اکے بھروسہ ہر حادثے کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح استقامت دکھاتے ہیں۔ لغزش کہ جس سے زندگی میں بچا نہیں جاسکتا ان کے راستے میں آتی ہے تو خدا ان کی حفاظت کرتا ہے۔ شیاطین ہر طرف سے انہیں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دنیا کی زرق برق چیزوں کے ذریعے انہیں پھسلانے کی سعی کرتے ہیں مگر ان کا خدا انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ جہنمی طاقتیں اور سنگدل ظالم انہیں طرح طرح کی دھمکیوں کے ذریعے جھکانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں اثبات ِقدم عطا کرتا ہے کیونکہ ان کی جڑ اور بنیاد ثابت و مستحکم ہوتی ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ یہ خدائی حفاظت وثبات ان کی ساری زندگی پر محیط ہے ۔ اس جہاں کی زندگی پر بھی اور اس جہاں کی زندگی پر بھی ۔یہاں وہ ایمان و پاکیزگی پر باقی رہتے ہیں اور ان کا دامن آلودگیوں کے عار و ننگ سے پاک ہوتا ہے اور وہاں وہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے ۔

پھر ان کے مقابل افراد کے بارے میں فرمایا گیاہے : اور خدا ظالموں کوگمراہ کرتا ہے اور خدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے ﴿وَيُضِلُّ اللهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللهُ مَا يَشَاءُ﴾ ۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ جہاں جہاں بھی ہدایت و ضلالت کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے اس کے لئے پہلے انسان خود قدم اٹھاتا ہے ۔ خدا کا کام تو تاثیر پیدا کرتا ہے جو اس نے ہر عمل میں کی ہے نیز خدا کا کام نعمتیں عطا کرنا اور انہیں سلب کرتا ہے اور ایسا وہ اہلیت اور عدم اہلیت کی بناء پر کرتا ہے (غور کیجئے گا) ۔

”یضل اللہ “ کے بعد ” ظالمین “کی تعبیر اس امر کے لئے بہترین قرینہ ہے یعنی جب تک کوئی شخص ظلم و ستم سے آلودہ نہ ہو اس سے نعمت ہدایت سلب نہیں ہوگی لیکن جب کوئی ظلم و ستم سے آلودہ ہوجاتاتو گناہ کی تاریکی اس کے وجود پر چھا جاتی ہے او رہدایت الٰہی کا نور اس کے دل سے نکل جاتا ہے او ریہ بالکل ارادہ و اختیار کی آزادی ہے ۔ ایسا شخص اگر فوری طور پر اپنی سمت درست کرلے تو نجات کا راستہ اس کے سامنے کھلا ہوا ہے لیکن گناہ میں مستحکم ہو جانے کے بعد پلٹنا بہت ہی مشکل ہے ۔

۱۔ مجمع البیان ، قرطبی ، فی ظلال اور تفسیر کبیر از فخر رازی کی طرف رجوع کریں ۔

۲۔ لفظ ”کلمہ “ اور اس کے مفہوم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ میں سورہ انعام کی آیہ ۱۱۵ کے ذیل میں ہم بحث کر چکے ہیں (دیکھئے ص ۳۳۱ اردو ترجمہ) ۔

۳۔ ایسی تاثیر خصوصاً ایک درخت کے پھلوں پر خوب واضح ہے ۔ وہ کہ جو درخت کی اوپر کی شاخوں پر لگنے والے پھلوں کی کی نسبت بہتر اور خوب پکے ہوئے ہوتے ہیں اور زیادہ عمدہ ہوتے ہیں ۔

۴۔تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۴۰ و ۵۴۱۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟

بہت سی روایات میں ہے کہ جب انسان قبر میں پہنچتا ہے اور فرشتے اس سے اس کی حقیقت کے متعلق سوال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے ایمان کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اس کا یہی معنی ہے:

﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾

ان میں سے بعض روایات میں صراحت کے ساتھ لفظ "قبر" آیا ہے۔[۱]

جبکہ بعض دوسری روایات میں ہے کہ شیطان موت کے وقت صاحبِ ایمان کے پاس آتا ہے اور کبھی داہنی طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے اسے گمراہ کرنے کے لئے وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خدا اسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ مومن کو گمراہ کرے "يثبت الله الذين اٰمنو کا یہی مفہوم ہے۔

امام صادق علیہ السلام کی اس روایت کا بھی یہ مفہوم ہے:

﴿ان الشيطان ليا تى الرجل من اولياء ناعند موته عن يمينه و عن شماله ليضله عما هو عليه فيأبى الله عزو جل له ذٰلک قول الله عزو جل يثبت الله الذين اٰمنوا بالقول الثابت فى الحيٰوة الدنيا و فى الآخرة﴾۔[۲]

مفسر عظیم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دارِ آخرنہ لغزش کی جگہ ہے اور نہ عمل کی بلکہ صرف نتائج اعمال کا سامنا کرنے کا مقام ہے لیکن وہ لمحہ کہ جب موت آپہنچے اور حتیٰ کہ عالم برزخ (وہ جہان کہ جو اس عالم اور عالمِ آخرت کے درمیان ہے) میں تھوڑا بہت لغزش کا امکان ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں لطفِ الٰہی انسان کی مدد کو آپہنچتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسے ثابت قدم رکھتا ہے۔

۲۔ ثبات و استقامت کا اثر

شجرہ طیبہ اور شجرہ خبیثہ کی تمام صفات میں سے کہ جو مندرجہ بالا آیات میں ذکر ہوئی ہیں سب سے زیادہ ثبات و عدم ثبات کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ شجرہ طیبہ کے ثمر کے طور پر آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا

صاحب ِ ایمان افراد کو اپنے ثابت قدم و مستحکم عقیدے کی بناء پر دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے ۔ اس سے ثبات اور اس کی تاثیر کے مسئلے کی انتہائی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ۔

عظیم لوگوں کی کامیابی کے عوامل کے بارے میں بہت گفتگو ہوتی ہے لیکن ان تمام میں سے استقامت و پامردی کا درجہ پہلا ہے ۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھ بوجھ اور استعداد کے لحاظ سے درمیانے درجے کے ہوتے ہیں یا عمل میں پیش قدمی کے لحاظ سے اوسط درجے کے ہوتے ہیں لیکن انہیں زندگی میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں ان کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی کامیابیوں کی وجہ سے ثبات و استقامت کو ختم کرنے پر صرف ہوتی ہے ۔ اصولی طور پر حقیقی مومنین کو زندگی کے سخت حوادث اور طوفان کے مقابلے میں ان کے ثبات و استقامت کے حوالے سے پہچانا چاہئیے ۔

۳۔ روایات اسلامی میں شجرہ طیبہ اور شجرہ خبیثہ

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ "طیبہ "اور خبیثہ "کہ جنہیں دو درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے ایک وسیع مفہوم رکھتے ہیں اور یہ ہر طرح کے شخص، پروگرام، مکتب، فکر و نظر، سوچ بچار اور گفتار و عمل پر محیط ہے لیکن بعض اسلامی روایات میں اس کی خاص حوالوں سے تفسیر کی گئی ہے ۔ واضح ہے کہ مفہوم ِ آیت ان میں منحصر نہیں ہے ۔

ان میں سے ایک روایت امام صادق علیہ السلام مروی ہے آپ "اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء "کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسول اللہ اصلھا و امیر المومنین فرعھا ،

و الائمه من ذریتهما اغصانها ، و علم الائمه ثمر ها ، و شیعتهم المؤمنون ورقها، هل فیها فضل؟

قال : قلت لا واللہ ،

قال و اللہ ان المومن لیولد فتورق ورقة فیها و ان المؤمن لیموت فتسقطو رقة منها ۔

رسول اللہ اس درخت کی جڑ ہیں ۔ امیر المومنین علی (علیہ السلام) اس کا تنا ہیں اور وہ امام جو ان دونوں کی ذریت میں سے ہیں اس کی ٹہنیاں ہیں اور آئمہ کا علم اس درخت کا پھل ہے اور ان کے صاحب ِ ایمان شیعہ اس کے پتے ہیں ۔

پھر امام نے فرمایا کیا کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے ؟

راوی کہتا ہے : میں نے کہا نہیں ، خدا کی قسم ۔

فرمایا: و اللہ جس وقت ایک صاحبِ ایمان پیدا ہوتا ہے تو اس درخت پر ایک پتے کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جس وقت کوئی حقیقی مومن مرجاتا ہے اور جس وقت کوئی حقیقی مومن مرجاتا ہے تو اس درخت کا ایک پتہ گر جاتا ہے۔ (۳)

ایک روایت میں یہی مضمون امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس میں ہے:

راوی نے سوال کیا: "تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا" کا کیا مفہوم ہے۔

امام (علیہ السلام) نے فرمایا: آئمہ کے علم کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر سال اور ہر علاقے میں تم تک آپہنچتا ہے۔ (۴)

ایک اور روایت میں ہے:

"شجرہ طیبہ" رسول اللہ، علی، حسن اور حسین اور ان کے فرزندانِ گرامی ہیں اور "شجرہ خبیثہ" بنی امیہ ہیں۔ (۵)

نیز بعض روایات میں یہ بھی شرط ہے کہ "شجرہ طیبہ" کھجور کا درخت ہے اور "شجرہ خبیثہ" حنظل" (تُمّہ) کا درخت ہے۔ (۶)

بہر حال ان تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اور جو کچھ ہم نے آیہ کے عمومی معنی میں ذکر کیا ہے اس میں ہم آہنگی موجود ہے کیونکہ یہ تو اس عمومی مفہوم کے مصادیق میں سے ہیں۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۴۰ و ۵۴۱۔

۲۔ نور الثقلین، جلد ۲ ص ۵۳۵۔

۳۔ نور الثقلین، جلد ۲ ص ۵۳۵۔ و ص ۵۳۸۔

۴۔ نور الثقلین، جلد ۲ ص ۵۳۵۔ و ص ۵۳۸۔

۵۔ المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر در منثور۔

آیات ۲۸،۲۹،۳۰

۲۸۔﴿أَلَمْ تَرَى إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾۔

۲۹۔﴿جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾۔

۳۰۔﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ﴾۔

ترجمہ

۲۸۔ کیا تونے (انہیں) نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو نا شکری میں بدل دیا او راپنی قوم کو ہلا کت کے گڑھے کی طرف کھینچ لے گئے۔

۲۹۔ (دار البوار وہی) جہنم ہے کہ جس کی آگ میں وہ داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

۳۰۔ انہوں نے خدا کے ہمسر قرار دیئے تاکہ (لوگوں کو) اس کی راہ سے (منحرف اور)گمراہ کریں۔ ان سے کہہ دو (کہ چنددن)دنیا کی زندگی (اور اس کی لذتوں سے) فائدہ اٹھا لو مگر بالآخر تمہیں (جہنم کی) آگ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر

کفرانِ نعمت کا انجام

ان آیات میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف سے ہے۔ در اصل ان میں شجرہ خبثہ کے ایک موقع کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے نعمت ِ الٰہی میں تبدیل کردیا ہے ﴿ أَلَمْ تَرَى إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللهِ كُفْرًا ﴾۔

اور بالآخرہ انہوں نے اپنی قوم کو دار البوار او رہلاکت کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا ﴿وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾۔

یہ وہی شجرہ خبیثہ کی جڑیں اور کفر و انحراف کے رہبر ہیں جن کے دامن میں نعمتیں تھیں مثلاً وجود، پیغمبر کی سی نعمت کہ جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہ تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان سے استفادہ کرتے اور شب بھر میں سو سال کی مسافت طے کرلیتے لیکن اندھے تعصب، ہٹ دھرمی، خود غرضی اور خود پسندی کے سبب وہ اس عظیم ترین نعمت سے استفادہ نہ

کرسکے ۔ وہ نہ فقط خود کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوئے بلکہ اپنی قوم کو بھی وسوسہ میں مبتلا کیا اورہلاکت و بدبختی کی انہیں سوغات دی ۔

بزرگ مفسرین نے منابعِ اسلامی میں آنے والی روایات کے پیش نظر کبھی اس نعمت کو وجودِ پیغمبر کہا ہے ، کبھی آئمہ اہل بیت (علیہ السلام) اور کفرانِ نعمت کرنے والے کبھی بنو امیہ قرار دیئے ہیں ۔ کبھی بنی مغیرہ اور کبھی زمانہ پیغمبر کے سب کفار لیکن آیت کا مفہوم یقینا وسیع ہے اور یہ کسی معین گروہ کے لئے مختص نہیں ہے اور اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی کسی نعمت کا کفران کریں ۔

ضمناً مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ خدائی نعمتوں خصوصاً عظیم ہادیوں اور رہبری کی نعمت کہ جو اہم ترین نعمتوں میں سے ہے ، سے استفادہ کرنا خود انسان کے فائدے میں ہے ۔ اب ان نعمتوں کا کفران اور آخری رہبری سے منہ پھیرنا سوائے ہلاکت اور دار البوار میں گرنے کے اور کچھ نہیں ہے ۔

اس کے بعد قرآن "دار البوار" کی تفسیر کرتا ہے : یہ جہنم ہے کہ وہ جس کے جلاڈالنے والے شعلوں میں جاگریں گے اور یہ بدترین ٹھکانا ہے ﴿جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ۔(۱)

اگلی آیت میں کفرانِ نعمت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ،کہ جس کے وہ مرتکب ہوتے تھے ۔ارشاد ہوتا ہے :انہوں نے خدا کے لیے شریک قراردیئے تاکہ اس طریقے سے لوگوں کو اس کی راہ سے گمراہ کریں ﴿وجعلوا لله انداً ليضلوا عن سبيله﴾شرک وکفر اختیار کرکے اور لوگوں کو دین و طریق حق سے منحرف کرکے وہ لوگوں پر چند روزہ مادی اقتدار کوئی حاصل کرتے ہیں ۔ اے رسول ! ان سے کہو: اس ناپائیدار اور بے وقعت مادی زندگی سے فائدہ اٹھا لو لیکن یہ جان لو کہ تمہارا انجامِ کار آگ ہے ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ﴾۔نہ تمہاری یہ زندگی ہے بلکہ بدبختی ہے اور نہ تمہارا یہ اقتدار کوئی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تباہ کاری مصیبت ہے لیکن اس کے باوجود اپنے انجام کے بدلے تم اس سے فائدہ اٹھا لو ۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے :﴿قل تمتع بكفرك قليلاً انک من اصحابِ النار﴾

کہہ دو : اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالے آخر کار تو اصحابِ نار میں سے ہے ۔(زمر ۔ ۸)

---

۱ ۔"یصلون" "صلی"مادہ سے آگ جلانے ، آگ میں جلنے، آگ میں مبتلا ہونے اور آگ میں جل کر کباب ہونے کے معنی میں ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ نعمت کو کفر میں بدل دیا:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نعمت ِ الٰہی کا کفران کیا لیکن زیر بحث آیت میں ہے: انہوں نے نعمت ِ خدا کو کفر میں تبدیل کیا اور کفران کیا"۔ ہوسکتا ہے یہ خاص تعبیر دو میں ایک وجہ کی بناء پر ہو:

الف: مراد ہے "شکر نعمت" کو "کفران" میں تبدیل کرنا یعنی ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ پروردگار کی نعمتوں پر شکر گزار ہوں لیکن انہوںنے اس شکر کو کفران میں تبدیل کردیا۔ حقیقت میں لفظ شکر مقدر ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا،

الذین بدلوا شکر نعمتہ اللہ کفراً

ب: مراد یہ ہے کہ انہوں نے خود نعمت کو کفر میں تبدیل کردیا۔ در حقیقت خدائی نعمتیں وسیلہ ہیں۔ ان سے استفادہ کا طریقہ کود انسان کے ارادہ سے وابستہ ہے۔ جیسا کہ ممکن ہے نعمتوں سے ایمان، خوش بختی اور نیکی کی راہ میں فائدہ اٹھایا جائے اسی طرح اہیں کفر، ظلم اور برائی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یہ نعمتیں خام مال کی طرح ہیں جن میں سے مختلف قسم کی چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں اگر اصل میں یہ خیر و سعادت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔

۲۔ نعمت سے سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے:

کفران ِ نعمت صرف یہ نہیں کہ انسان خدا کی ناشکری کرے بلکہ نعمت سے ہر طرح کا انحرافی فائدہ حاصل کرنا اور سوئے استفادہ کفران ِ نعمت ہے۔ اصولی طور پر کفرانِ نعمت کی حقیقت یہی ہے۔ ناشکری اور شکر ادا نہ کرنا تو دوسرے مرحلے کی بات ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ نعمت کو اس مقصد کے مطابق صرف نہ کرنا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے کفران ِ نعمت ہے اور زبانی شکر گزاری ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ ہزار مرتبہ زبان سے "الحمد للہ" کہیں لیکن عملی طور پر نعمت سے سوء استفادہ کریں تو کفرانِ نعمت اور کیا ہے۔

دورِ حاضر میں نعمت کو کفران میں تبدیل کرنے کے انتہائی واضح نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

فطرت کی بہت سے قوتیں انسان کی خداداد بصیرت اور پیش قدمی کی وجہ سے انسان کے ہاتھ لگی ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرنا اب انسان کی دسترس میں ہے۔

سائنسی انکشاف اور صنعتی ایجادات نے پوری دنیا کا رخ ہی بدل کر دکھ دیا ہے ۔ ان انکشافات و ایجادات نے انسان کے کندھوں بہت بھاری بوجھ اتار کر کار خانوں کے پہیوں پر ڈال دیا ہے ۔ آج نعمات ِ الٰہی ہر دور سے زیادہ ہیں ۔ آج انسان اپنے افکار اور عالم کو پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہے ۔ ساری دنیا کی خبروں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے ۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ اس دور میں لوگ ہر زمانے سے زیادہ خوشحال ہوتے ، مادی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی۔

آج خدا نے ان عظیم نعمتوں کو کفر میں تبدیل کرنے کا راستہ اپنا یا گیا ہے ۔ مادے کے عجیب و غریب توانائیوں کو ظلم و طغیان کی راہ میں استعمال کیا جارہاہے ۔ انکشافات و ایجادات کو برائی اور تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے ۔ ہر نیا صنعتی شاہکار پہلے تکریبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس کی تعمیری پہلو کی نوبت بعد کی بات ہو جاتی ہے ۔

خلاصہ یہ کہ یہ عظیم نا شکری ہے جو انبیاء الٰہی کی اصلاحی اور تربیتی تعلیمات سے دور رہنے کا نتیجہ ہے اور ایسا کرنے والے اپنی قوم کو نعمات ِ الٰہی کا کفران کر کے اسے دار البوار کی طرف کھینچے لے جارہے ہیں ۔

۳۔ " انداد" کا مفہوم :

"انداد" جمع ہے "ند" کی ۔ اس کا معنی ہے "مثل " لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور زبیدی نے تاج العروس میں (بعض اہل لغت سے) نقل کیا ہے "ند" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز سے شاہت جوہری رکھتی ہو لیکن " مثل" کا اطلاق ہر قسم کی شباہت پر ہوتا ہے ۔ لہٰذا "ند" کا استعمال " مثل " کی نسبت زیادہ عمیق ، رسا اور عمدہ ہے ۔

اس معنی کے مطابق زیر نظر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ کفر کی کوشش تھی کہ خدا کے کچھ ایسے شریک بنائیں کہ جنہیں جوہر ِذا میں خدا کا شبیہ قرار دیں تاکہ مخلوق کو خدا کی پرستش سے روک سکیں اور اس طرح اپنے منحوس مقاصد پورے کر سکیں ۔

بعض اوقات وہ قربانیوں کا کچھ حصہ ان کے لئے قرار دیتے اور کبھی نعمات الٰہی کا کچھ حصہ (جیسے بعض جانور) بتوں کے لئے مخصوص کردیتے اور کبھی پرستش وعبادت کے ذریعے انہیں خدا کا ہم پلہ خیال کرتے ۔ سب سے بڑھ کر و قبیح یہ بات تھی کہ زمانہ جاہلیت میں مراسم حج میں کہ جو دین ِ ابراہیمی کے مطابق تھا اس میں انہوں نے بہت سی خرافات شامل کردی تھیں یہاں تک کہ " لبیک " کہتے ہوئے یوں کہتے تھے :

لبیک لاشریک لک ،

الا شریک هولک ،

تملکه و ماهلک ،

میں تیری دعوت کو قبول کرتا ہوں ، اے خدا کہ جس کا کوئی شریک نہیں ۔

سوائے اس شریک کے کہ جو تیرا شریک ہے ۔

اس کا بھی تو مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی ۔[1]

۱۔ تفسیر فخر الدین رازی ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

آیات ۳۴،۳۳،۳۲،۳۱

۳۱۔ ﴿قُلْ لِعِبَادِی الَّذِینَ آمَنُوا یُقِیمُوا الصَّلاَةَ وَیُنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلاَنِیَةً مِنْ قَبْلِ أَنْ یَأْتِیَ یَوْمٌ لاَبَیْعٌ فِیهِ وَلاَخِلاَلٌ﴾۔

۳۲۔ ﴿اللهُ الَّذِی خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنْ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَکُمْ وَسَخَّرَ لَکُمْ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَکُمْ الْأَنهَارَ﴾۔

۳۳﴿وَسَخَّرَ لَکُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَکُمْ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ﴾۔

۳۴۔ ﴿وَآتَاکُمْ مِنْ کُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لاَتُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ کَفَّارٌ﴾۔

ترجمہ

۳۱۔ میرے ان بندوں سے کہہ دو کہ جو ایمان لائے ہیں کہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو انہیں روزی دی ہے اس میں سے پنہاں و آشکار انفاق کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں خرید و فروخت ہے نہ دوستی (نہ مال کے ذریعے عذابِ خدا سے نجات مل سکے گی اور نہ کسی او رمادی رشتے سے)۔

۳۲۔ اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیاہے اور آسمان سے پانی نازل کیا ہے اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل اگائے ہیں اور کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ وہ اس کے حکم سے صفحہ دریا پر چلے اور نہریں بھی تمہارے لئے مسخر کی ہیں۔

۳۳۔ منظم پروگرام کے ماتحت کام کرنے والے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے اور رات او ردن کو (بھی) تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔

۳۴۔ اور تم نے جس چیز کا اس سے تقاضا کیا تھا وہ اس نے تمہیں دے دی اور نعماتِ الٰہی کا شمار کرنے لگو تو ہر گز شمار نہیں کرسکو گے انسان ستمگر اور کفران کرنے والا ہے۔

تفسیر

قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ان لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں گفتگو تھی کہ جنہوں نے نعماتِ الٰہی کا کفران کیا اور آخر کار دار البوار کی طرف کھینچے گئے ۔ زیر نظر آیات میں خدا کے سچے بندوں کا ذکر ہے اور اللہ کی بندوں پر نازل ہونے والی غیر متناہی نعمات کے بارے میں بات کی گئی ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو رزق دیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کریں

﴿قُلْ لِعِبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾۔ اس کے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے کہ اس طرح عذاب سے نجات کے لئے راہ سعادت خرید سکیں اور نہ وہاں کسی کی دوستی کام آئے گی ﴿مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَابَيْعٌ فِيهِ وَلَاخِلَالٌ﴾ ۔

اس کے بعد معرفتِ خدا کے لئے اس کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ایسی معرفت کہ جس سے دلوں میں اس کا عشق زندہ ہو جائے نیز انسان کو اس کی عظمت اور اس کے لطف کے حوالے سے اس تعظیم پر ابھارا گیا ہے ۔ کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ مدد اور لطف و رحمت کرنے والے سے انسان کے دل میں لگاؤ اور محبت پیدا ہوتی ہے ۔ یہی بات چند ایک آیات میں یہاں اس طرح بیان کی گئی ہے :۔

خدا وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ﴿اللهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ ۔ اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا جس کے ذریعے تمہاری روزی کے لئے مختلف ثمرات پیدا ہوتے ہیں ﴿وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ﴾ ۔

" اور اس نے تمہارے لئے کشتی کو مسخر کیا " اس کے ساخت کے مواد کے لحاظ سے بھی کہ جسے طبیعتِ مادہ سے پیدا کیا اور سمندروں پر منظم ہواؤں کی صورت میں اس کی وقتِ محرکہ لحاظ سے بھی ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ ۔ " تاکہ یہ کشتیاں اس کے حکم سے سطح سمندر پر چلیں " اور پانی پر سینہ چیر کر ساحلِ مقصود کی طرف بڑھیں اور انسانوں اور ان کے وسائل ایک سے دوسری جگہ کی طرف آسانی سے اٹھالے جائیں ﴿لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ﴾ ۔

اسی طرح " نہریں بھی تمہارے لئے مسخر کردی گئیں " ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ﴾ ۔ تاکہ ان کے حیات بخش پانی سے تم اپنی فصلوں کی آبیاری کرو اور تم خود اور تمہارے مویشی اس سے سیراب ہوں ۔ نیز اکثر اوقات کے لئے سطح آب کو

ہموارہ رکھا گیا ہے تاکہ چھوٹی بڑی کشتیاں اس میں آمد و رفت کرسکیں ۔ نیز نہریں مسخر کی گئی ہیں تاکہ تم ان کی مچھلیوں بلکہ یہاں تک کہ ان کی گہرائیوں میں موجود اصداف سے استفادہ کرسکو۔

نہ صرف زمینی موجودات کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے بلکہ سورج اور چاند کو جو ہمیشہ مصروفِ کار ہیں انہیں تمہارے فرمان کے زیر گردش قرار دے دیا ہے ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ﴾[1]۔

نہ صرف اس جہان کے موجودات کو تمہارے زیر فرمان کردیا گیا ہے بلکہ ان کے عارضی حالات کو بھی تمہارے لئے مسخر کردیا گیا ہے جیسا کہ "رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا گیا ہے" ﴿سَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾۔

اور تم نے جس چیز کا اس سے تقاضا کیا اور فرد اور معاشرے کی روح اور بدن کے لئے تمہیں جس چیز کی احتیاج ہوئی یا اپنی سعادت کے لئے تمہیں جس چیز کی ضرورت پڑی وہ سب کچھ اس نے تمہارے اختیار میں دے دیا ﴿ وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لاَتُحْصُوهَا﴾۔

کیونکہ پروردگار کی مادی اور معنوی نعمتوں نے تمہارے وجود اور محیطِ زندگی کو اس طرح سے گھیر رکھا ہے ان کا شمار ممکن نہیں اور جن خدائی نعمتوں کو تم جانتے ہو وہ ان کے مقابلے میں جنہیں تم نہیں جانتے دریا کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہیں لیکن خدا کے اس تمام لطف و رحمت کے باجود یہ انسان ظالم ہے اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے ﴿ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾۔

انسان کو ایسی نعمتیں عطا کی گئیں ہیں کہ اگر وہ ان سے صحیح استفادہ کرتا تو سارے جہاں کو گلستان بنا دیتا اور "مدینہ فاضلہ" کی تشکیل کا خواب پورا ہو جاتا لیکن سوئے استفادہ، ظلم و ستم اور کفرانِ نعمت کے سبب وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس کی اس زندگی کا افق تاریک ہو گیا، شہدِ حیات اس کے دہن میں جاں گداز زہر بن چکا ہے اور طاقت فرسا مشکلات نے طوق و زنجیر مشکلات نے طوق و زنجیر کے اسے جکڑ رکھا ہے۔

۱۔"دائبین" "دؤب" کے مادہ سے ایک عادت کے مطابق یا محکم سنت کے مطابق کام جاری رکھنے کے معنی میں ہے۔ سورج اور چاند چونکہ لاکھوں سال سے ایک معین و مستحکم طریقے سے نور افشانی کرنے، زندہ موجودات کی پرورش کرنے، سمندروں میں مدو جزر پیدا کرنے اور کئی دوسری خدمات میں مصروف ہیں لہٰذا ان کے لئے "دائبین" سے بہتر تعبیر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

چند اہم نکات

۱۔ خالق اور مخلوق سے رشتہ

ان آیات میں ایک مرتبہ پھر سچے مومنین کے لائحہ عمل میں سے ”نماز“ اور انفاق“ کا ذکر کیا گیا ہے۔
ہوسکتا ہے کہ بتدائی نظر سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام عملی پروگراموں میں سے یہاں صرف دو کاتذکرہ کیوں کیا گیا ہے۔

اس کی علت یہ ہے کہ اسلام کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کا خلاصہ تین میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱) انسان کا خدا سے رابطہ۔

۲) انسان کا مخلوق سے رابطہ۔

۳) انسان کا اپنی ذات سے رابطہ۔

درحقیقت تیسرا حصہ پہلے حصے اور دوسرے حصے کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ دو پروگرام (نماز اور انفاق) دراصل انہی دو حصوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ ہیں۔

نماز اللہ سے ہر قسم کے رابطے کا مظہر ہے کیونکہ نماز کے دوران یہ رابطہ دوسرے عمل کی نسبت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جب کہ انفاق مخلوقِ خدا سے رشتے کی طرف اشارہ ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر نعمتِ رزق میں سے انفاق کا وسیع مفہوم پیشِ نظر رکھا جائے جس میں ہر طرح کی مادی و روحانی نعمت شامل ہے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس سورہ کی بحث جاری ہے وہ مکی ہے اور اس کے نزول کے وقت ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس انفاق کو زکوٰۃ سے مربوط نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں نزولِ حکم کے بعد زکوٰۃ بھی شامل ہے۔

۲۔ انفاق، پنہاں اور آشکار کیوں؟

ہم بارہا قرآنی آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ سچے مومنین پنہاں بھی انفاق اور صدقہ کرتے ہیں اور آشکار بھی۔ اس طرح سے انفاق کا وسیع معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کیفیت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کیونکہ بعض اوقات مخفی انفاق زیادہ مؤثر اور زیادہ آبرومندانہ ہوتا ہے اور بعض اوقات آشکار ہو تو دوسروں کی تشویق کا باعث بنتا ہے،

اسلامی طرزِ عمل کے لئے نمونہ مہیا کرتا ہے اور شعائرِ دین کی تعظیم و تکریم شمار ہوتا ہے ۔ علاوہ ازیں کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ جسے کچھ دیا جارہا ہو وہ لینے سے ناراحت ہوتا ہے ۔

اس وقت جب کہ ہم خونخوار دشمن سے جنگ میں مصروف ہیں (یا کسی مسلمان قوم کو ایسی حالت کا سامنا ہو) تو اہل ایمان ہر روز جنگ زدگان یا مجروحین یا خود جنگجویان کی امداد کے لئے مختلف قسم کا بہت زیادہ وہ سامان لے کر سرحدوں اور جنگی علاقوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور ان کی خبریں ذرائع ابلاغ سے نشر ہوتی ہیں ایک تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری ملت جنگ کرنے والوں کی پشت پر ہے اور دوسرا ان لوگون کے لئے باعثِ تشویق ہوتا ہے جو اس قافلے سے پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے وہ قافلے سے آملیں ۔ واضح ہے کہ ایسے مواقع پر اعلانیہ انفاق زیادہ مؤثر ہے ۔

ان دونوں میں فرق کے سلسلے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اعلانیہ انفاق واجبات کے ساتھ مربوط ہے کہ جس عام طور پر تظاہر کا پہلو نہیں ہوتا کیونکہ ذمہ داری کی ادائیگی سب پر لازم ہے اور اس میں کوئی پنہاں معاملہ نہیں لیکن مستحب انفاق چونکہ واجب سے زائد چیز ہے لہذا ہو سکتا ہے اس میں تظاہر یا ریا کا معاملہ بہتر ہے کہ اسے مخفی طور پر انجام دیا جائے ۔

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تفسیر کلی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ در حقیقت پہلی تفسیر کی ایک شاخ ہے ۔

۳۔اس دن "بیع " اور خلال "نہیں ہے

ہم جانتے ہیں کہ روز قیامت کی ماہیت و حقیقت یہ ہے کہ ہم اعمال کے نتائج اور ردعمل کا سامنا کریں گے ۔ لہٰذا کوئی شخص وہاں عذاب سے نجات کے لئے کوئی فدیہ نہیں دے گا ۔یہاں تک کہ اگر بالفرض روئے زمین کی ساری دولت اس کے قبضے میں ہو اور وہ اسے چرخ کرکے ذرہ بھر اپنے اعمال کی سزا کم کروانا چاہیئے تو ممکن نہیں کیونکہ دار العمل تو یہی دنیا ہے اوریہاں سے اس کا روزنامچہ مکمل ہو کر لپٹا جاچکا ہے اور وہاں دار الحساب ہے ، وہ محاسبہ کا گھر ہے ۔ اسی طرح مادی دوسری کا رشتہ جس

شخص سے جس صورت میں بھی ہو وہاں نجات بخش نہیں ہوسکتا ۔ (توجہ رہے کہ "خلال" اور" دوستی کے معنی میں ہے)۔

آسان لفظوں میں لوگ اس دنیا وی زندگی میں سزا سے بچنے کے لئے عام طور پر پیسے کا سہارا لیتے ہیں یا پارٹی اور دوستی کا ذریعہ استعمال کرتے ہیں یعنی رشوتوں اور رشتوں کے ذریعے سزا سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگر یہ سمجھیں کہ وہاں بھی اسی طرح کوئی صورت نکل آئے تو یہ ممکن نہیں ۔ یہ ان کی بے خبری اور انتہائی نادانی کی دلیل ہے ۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس آیت میں جس طرح کی دوستی کی نفی کی گئی ہے وہ عالمِ قیامت میں مومنین کی باہمی دوستی کے منافی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے کیونکہ یہ تو ایمان کے زیر سایہ ایک معنوی دوستی مؤدت ہے ۔

باقی رہا مسئلہ شفاعت تو جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اس کا مادی مفہوم نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں وارد ہونے والی صریح آیات کے پیش نظریہ صرف ، منعوی اور روحانی رشتوں کے زیر سایہ بعض اعمال خیر کی وجہ سے حاصل ہونے والی اہلیت کے باعث میسر آتی ہے ۔ اس کی تفصیل ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۴ کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں ۔ [1]

۱۔ تفسیر نمونہ جلد اول ص ۱۸۷ ۔ اور تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۱۵۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں ۔

۴۔ اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں

ان آیات میں دو بارہ زمین و آسمان کی مختلف موجودات کے انسان کے لئے تسخی رہونے کے بارے میں بات کی گئی ہے ۔ اس گفتگو کے چھ حصے ہیں ۔

۱)کشتیوں کی تسخیر

۲)نہروں اور دریاؤں کی تسخیر

۳)سورج کی تسخیر

۴)چاند کی تسخیر

۵)رات کی تسخیر

۶)دن کی تسخیر

ان میں سے بعض کا تعلق آسمان سے ہے اور بعض (رات و دن) کا دونوں سے ۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر یاد دہانی ضروری ہے کہ انسان قرآن کی نگاہ میں اس قدر با عظمت ہے کہ اللہ کے حکم سے تمام موجودات اس کے لئے مسخر ہیں یعنی یا اس کے اختیار میں ہیں اور ان کہ مہار اس کے ہاتھ میں ہے یا ان کی حرکت انسان کی خدمت کے لئے اور اس انسان کو ہر حالت میں اس قدر عظمت حاصل ہے کہ تمام آفرینش کا یہ ایک ہدف عالی بن گیا ہے ۔

سورج اس کے لئے نور افشانی کرتا ہے ، اس کا بستر حیات گرم کرتا ہے، اس کے لئے طرح طرح کی نباتت اور پودے اُسگاتا ہے ، اس کی زندگی کے ماحول کو ضرر رساں جراثیم سے پاک کرتا ہے ، اسے مسرت و شادمانی کا پیغام دیتا ہے اور اسے راہِ حیات کی نشاندہی کرتا ہے ۔

چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے یہ طبیعی ، فطری اور جاوداں تقویم ہے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والا جوار باٹا انسان کی بہت سی مشکلات حل کرتا ہے ۔

سمندروں اور دریاؤں سے جاری نہروں کا پانی اوپر آجات ہے ۔ یہ بہت سے درختوں کی آبیاری کرتا ہے ۔ خاموش، ساکن اور رکے ہوئے سمندروں کو حرکت میں لے آتا ہے اورا سے گندا اور متعفن ہونے بچاتا ہے ۔ اور موجوں کے اٹھنے سے دریاؤں اور سمندوں کے زندہ موجودات کے لئے ضروری آکسیجن یسر آجاتی ہے ۔

ہوائیں بحری جہاز اور کشتیاں سمندر کے سینے پر چلاتی ہیں ۔ وسیع ترین شاہراہ انہیں سمندروں میں رواں دواں ہوتے ہیں ۔

دریااور نہریں انسان کی خدمت گزار ہیں ۔ یہ زراعت کی آبیاری، جانوروں کی سیرابی اور ماحول زندگی کو ترتازہ رکھنے کے لئے ہیں یہاں تک کہ خود ان میں انسان کے لئے مچھلیوں کی صور میں غذائی مواد پل رہا ہوتا ہے ۔

تاریکی شب انسان کو لباس کی طرح ڈھانپ دیتی ہے، اسے سکون و راحت پہنچاتی ہے اور سورج کی جلانے والی حرارت سے اس طرح بچاتی ہے جیسے سائے میں پنکھے کی ہوا رات انسان کو حیات تازہ بخشتی ہے ۔

اسی طرح دن کی روشنی انسان کو اٹھ کھڑا ہونے اور سعی و کوشش کی دعوت دیتی ہے اور اس کے اندر گرمی اور حرارت پیدا کرتی ہے اور ہر مقام پر جنبش و حرکت انسان کی فرمانبردارہیں ۔ ان تمام نعتموں کا بیان اور ان کی وضاحت انسان میں ایک نئی روح پھوکنے کے علاوہ اسے اسکی عظمت سے آگاہ کرتی ہے اور اس میں احساس تشکر ابھارتی ہے ۔

اس گفتگو سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآنی لغت میں تسخیر دو معانی کے لئے آتا ہے ۔

ایک انسان کے مفادات اور مصالح کے لئے مصروف خدمت ہونے (جیسے سورج اور چاند کی تسخیر) اور دوسرا انسانی اختیار ہونے (مثلاً کشتیوں اور دریاؤں کی تسخیر کے معنی میں آیا ہے ۔ اور یہ جو بعض کا خیال ہے کہ یہ آیات موجودہ زمانے میں تسخیر کے اصطلاحی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں (جیسے خلائی سفر کے ذریعے تسخیر ماہتاب)، یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا ۔ کیونکہ بعض قرآنی آیات میں ہے ،وسخر لکم السمٰوٰت ومافی الارض جمیعاًمنه

جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے ۔ (جاثیہ ۔ ۱۳)

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ تما چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور تمام چیزیں زمین میں ہیں انسان کے لئے مسخر ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فضا نوردوں کا تمام آسمانی کرات میں پہنچنا قطعاً محال ہے ۔

قرآن میں بعض دوسری آیات ہیں کہ جو ممکن ہے اس قسم کی تسخیر کی طرف اشارہ ہوں ۔ اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ سورہ رحمن کی تفسیر میں بحث کریں گے ۔

(موجودات کے انسان کے سامنے مسخر ہونے کے بارے میں سورہ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں بھی بحث کی جائے گی)
۔

۵۔ دائبین

ہم کہہ چکے ہیں کہ "دائب" مادہ "دؤب" سے ہے اس کا معنی ہے ایک عادت ی احکم سنت کے مطابق کا جاری رکھنا ۔ البتہ سورج زمی کے گرد حرکت نہیں کرتا بلکہ بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ سورج ہمارے گرد گھومتا ہے لیکن "دائب" کے معنی جگہ میں حرکت کرنے کا مفہوم نہیں ہے بلکہ کسی کام کو مسلسل جاری رکھنے کا مفہوم اس میں مضمر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سورج اور چاند نور افشانی کرتے ہیں اور نشور نما کا ذریعہ ہیں ۔ کرہ زمین اور انسانوں کے لئے ان کا یہ پروگرام مسلسل پوری طرح منظم ہے (اور اس بات کو فراموش نہ کیجئے گا کہ "دأب" کا ایک معنی عادت بھی ہے)۔ [1]

۱۔ البتہ موجودہ زمانے کے ہارین سورج کی دوسری قسم کی گردش کے قائل ہیں ۔ مثلاً وہ اپنے مدار کے گرد گھومتا ہے اور جس نظامِ شمسی سے اس کا تعلق ہے اس کے ساتھ اس کہکشاں کے اندر حرکت کرتا ہے جس میں وہ موجود ہے ۔

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے ؟

زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ :

خدا نے تم پر لطف کیا اور جو کچھ تم نے اس سے طلب کیا اس کا کچھ حصہ تمہیں دیا ۔

(توجہ رہے کہ "﴿من کل ماسألتموہ﴾" میں "من" تبعیضیہ ہے) ۔

یہ اس بناء پر ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان خدا سے کوئی چیز چاہتا ہے کہ جس میں یقینی طور پر اس کا نقصان بلکہ بعض اوقات ہلاکت پنہاں ن ہوتی ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے لیکن عالم، حکیم اور رحیم خدا ہرگز اس قسم کا تقاضا پورا نہیں کرتا اور اس کی بجائے شاید بہت سے مواقع پر انسان اپنی زبان سے خدا سے کوئی چیز طلب نہیں کرتا لیکن زبان حال سے اور اپنی فطرت سے اس کی تمنا کرتا ہے اور خدا اسے دے دیتا ہے اور کوئی مانع نہیں کہ "ما سألتموہ" میں زبان قال کا تقاضا بھی شامل ہو اور زبانِ حال کی آرزو بھی ۔

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا وجود سرتا پا اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے ۔ اگر مختلف طبیعی علوم، علمِ عمرانیات، علم نفسانیات اور علم نباتات وغیرہ کی کتب کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان نعمتوں کا دامن کسی قدر وسیع ہے ۔ اصولی طور پر ایک عظیم ادیب کے بقول ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے ۔

اس سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان کے بدن میں اوسطاً دس ملین ارب زندہ خیلے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک ہمارے فعال بدن کا حصہہے ۔ یہ عدد اس قدر بڑا ہے کہ اگر ہم ان خلیوں کو گننا چاہیں تو سینکڑوں سال درکار ہیں اور پھر یہ تو ہم پر خدائی نعمتوں کا صرف ایک حصہ ہے ۔ لہٰذا اگر ہم واقعاً اس کی نعمتوں کو گننا چاہیں تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں﴿ و ان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوھا ﴾ ۔

انسان کے خون میں دو قسم کے گلوبل ہیں 1(Globules)

ہوتے ہیں ۔ سرخ گلوبل کئی ملین ہیں اور اسی طرح سفید گلوبل بھی ۔ سرخ گلو بل بدن کے خلیوں کی سوخت و ساز کے لئے آکسیجن پہنچاتے ہیں اور سفید گلوبل انسان کی صحت و سلامتی کی حفاظت کرتے ہیں اور جب جراثیم جسم پر حملہ

آور ہوتے ہیں تو یہ اپنا کردار ادا رکتے ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بغیر کسی استراحت اور آرام کے ہمیشہ خدمتِ انسان کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں ۔

۸۔ افسوس کہ انسان " مظلوم " اور "کفار" ہے

گزشتہ مباحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ خدا نے تمام موجودات کو حکم انسان کے سامنے مسخر کردیا ہے اور اس قدر نعمتیں اسے عطا کردی ہیں کہ اب کسی پہلو سے اس کے لئے کوئی کمی نہیں ۔ لیکن یہ انسان نورِ ایمان سے اور تربیت سے دور رہنے کی بناء پر طغیان اور ظلم و ستم کے راستے پر قدم رکھتا ہے اور کفرانِ نعمت میں مشغول ہوجاتا ہے ۔

خود غرض افراد کی کوش ہوتی ہے کہ خدا کی وسیع و عریض نعمتوں کو اپنے لئے منحصر کرلیں اور زمین کے وسائلِ حیات پر اپنا قبضہ جمالیں وہ خود تو تھوڑی سی مقدار کے علاوہ صرف نہیں کرسکتے لیکن اس کے باوجود دوسروں کو ان تک پہنچنے سے محروم رکھتے ہیں ۔

یہ مظالم جو خود غرضی ، استعمار اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کی زندگی کے پر سکون ماحول کو طوفانوں کے سپرد کردیتے ہیں ۔ ان کے باعث جنگیں برپا ہوتی ہیں ، خون بہتا ہے اور اموال و نفوس کی ہلاکت کا سامنا پڑتا ہے ۔

در حقیقت قرآن کہتا ہے : اسے انسان ! ترے دستِ اختیار میں تمام چیزیں اس قدر ہیں جو کافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تو " ظلوم " اور "کفار " نہ بنے، اپنے حق پر قناعت کرے ، دوسروں کے حقوق پر تجاوز نہ کرے اور کسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالے ۔

۱۔ چھوٹے چھوٹے زندہ موجودات جو خون میں تیرے ہیں اور زندگی کے بارے میں بھاری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے ۔

آیات ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵

۳۵۔ ﴿وَ إِذْ قالَ إِبْراهيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِناً وَ اجْنُبْنى وَ بَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنامَ﴾۔

۳۶۔ ﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثيراً مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنى فَإِنَّه مِنِّى وَ مَنْ عَصانى فَإِنَّک غَفُورٌ رَحيمٌ﴾۔

۳۷۔ ﴿رَبَّنا إِنِّى أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتى بِوادٍ غَيْرِ ذى زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِک الْمُحَرَّمِ رَبَّنا لِيُقيمُوا الصَّلاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوى إِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَراتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ﴾۔

۳۸۔ ﴿رَبَّنا إِنَّک تَعْلَمُ ما نُخْفى وَ ما نُعْلِنُ وَ ما يَخْفى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ فِى الْأَرْضِ وَ لا فِى السَّماءِ﴾۔

۳۹۔ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذى وَهَبَ لى عَلَى الْكِبَرِ إِسْماعيلَ وَ إِسْحاقَ إِنَّ رَبِّى لَسَميعُ الدُّعاءِ﴾۔

۴۰۔ ﴿رَبِّ اجْعَلْنى مُقيمَ الصَّلاةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتى رَبَّنا وَ تَقَبَّلْ دُعاءِ﴾۔

۴۱۔ ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لى وَ لِوالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسابُ﴾۔

ترجمہ

۳۵۔ وہ وقت (یاد کرو)جب ابراھیم نے کہا: پروردگارا، اس شہر (مکہ) کو شہر امن قرار دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔

۳۶۔ پروردگارا! انہوں (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ پس جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۳۷۔ پروردگارا! میں نے اپنی اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیاہ زمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ نماز قائم کریں تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف موڑ دے اور انھیں ثمرات میں سے رزق دے شاید وہ تیرا شکر بجا لائیں۔

۳۸۔ پروردگارا! جو کچھ ہم چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں تو اسے جانتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ پر مخفی نہیں ہے۔

۳۹۔ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کئے یقینا میرا خدا دعا سنتا ہے (اور قبول کرتا ہے)۔

۴۰۔ خدایا! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی ایسا کر۔ پروردگارا! (ہماری) دعاء قبول فرما۔

۴۱۔ پروردگارا! مجھے ۔، میرے ماں باپ کو اور تمام مومنین کو اس روز بخش دینا جب حساب قائم ہوگا۔

تفسیر

ابراہیم (علیہ السلام)بت شکن کی اصلاحی دعائیں

گذشتہ آیت میں سچے مومنین اور نعمات الٰہی کا شکر ادا کرنے والوں کے بارے میں گفتگو تھی ۔ زیر بحث آیت میں راہ خدا میں استقامت دکھانے والے اور اس کے عبد شاکر ابراہیم (علیہ السلام) کی کچھ دعائیں بیان کی گئی ہیں تا کہ گذشتہ تمام بحثوں کی تکمیل ہو جائے اور یہ امر خدائی نعمتوں سے بہترین فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے نمونہ بن جائے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : وہ وقت یاد کرو جب جب ابراہیم (علیہ السلام) نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا : پروردگارا ! اس شہر (مکہ) کو سرزمین امن و امان قرار دے ﴿وَ إِذْ قالَ إِبْراهيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِناً﴾ اور مجھ پر میرے بیٹے پر اپنا لطف و عنایت فرما اور بتوں کی پرستش سے دور رکھ ﴿وَ اجْنُبْني وَ بَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنامَ﴾ ۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بت پرستی کتنی بڑی مصیبت اور گھروں کو ویران کرنے والی ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس راستے میں برباد ہونے والوں کو دیکھا ہے ۔

پروردگارا ! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے ﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثيراً مِنَ النَّاسِ﴾ ۔ گمراہی بھی کیسی خطرناک کہ جس میں وہ اپنی عقل و خرد تک گنوا بیٹھتے ہیں ۔

میرے اللہ میں تیری توحید کی دعوت دیتا ہوں اور سب کو تیری طرف پکارتا اور بلاتا ہوں ۔ " جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نا فرمانی کرے اگر وہ قابل ہدایت اور بخشش ہے تو اس کے بارے میں محبت و احسان فرما کیونکہ تو بخشنے والا مہربان ہے " ﴿فَمَنْ تَبِعَني فَإِنَّهُ مِنِّي وَ مَنْ عَصاني فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحيمٌ﴾ ۔

در اصل ان الفاظ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بارگاہ خداوندی میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر میری اولاد بھی راہ توحید سے منحرف ہو جائے اور بت پرستی کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور اگر غیر اس راستے پر گامزن ہو جائیں تو وہ میرے بیٹوں اور بائیوں اور بھائیوں کی مانند ہیں ۔

حضرت کی یہ مؤدبانہ اور انتہائی محبت آمیز تعبیر اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہتے کہ جو شخص میری نافرمانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے اور اسے اسطرح یا اس طرح سزا دے بلکہ کہتے ہیں :- جو شخص میری نا فرمانی کرے تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے ۔

پھر اپنی دعا اوردرخواست جاری رکھتے ہیں: پروردگارا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب وگیاہ سرزمین میں ٹھہرایا ہے تا کہ وہ نماز قائم کریں ﴿رَبَّنا إِنِّی أَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتی بِوادٍ غَیْرِ ذی زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنا لِیُقیمُوا الصَّلاةَ﴾

یہ اس وقت کی بات ہے جب خدا نے انھیں ان کی کنیز ہاجرہ سے فرزند عطا کیا ۔ جس کا نام انہوں نے اسماعیل رکھا ۔ اس پر ان کی پہلی بیوی سارہ کے دل میں حسدپیدا ہو گیا ۔ وہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کی موجودگی برداشت نہ کر سکی ۔ اس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے تقاضا کیا کہ اس ماں بیٹے کو کہیں اور لے جائے ۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمان خدا پر یہ بات مان لی اور اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے کر سرزمین مکہ میں چلے آئے ۔ ان دنوں یہ علاقہ بالکل خشک بنجر اور ویران تھا ۔ آپ نے انہیں وہاں ٹھہرایا اور خدا حافظ کہہ کر چلے آئے ۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس گرم اور تپتی ہوئی زمین پر ماں اور بیٹے کو پیاس لگی ۔ ہاجرہ نے اپنے ننھے سے بچے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی ۔

دوسری طرف خدا کا ارادہ تھا کہ یہ سرزمین ایک عظیم مرکز عبادت بنے اس موقع پر زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا ۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صحرا نورد قبیلہ ”جرہم“ وہاں سے گزارا ۔ اسے سارے ماجرے کا پتہ چلا ۔ اس نے وہیں پڑاو ڈال لیا اور مکہ آہستہ آہستہ ایک آبادی کی شکل اختیار کرنے لگا ۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی دعاء کو اس طرح سے جاری رکھا: اب جبکہ وہ تیرے عظیم گھر کے احترام میں اس جلاڈالنے والے بیابان میں سکونت پذیر ہو گئے ہیں تو تو کچھ لوگو کا دل ان کر طرف موڑدے اور ان کی محبت ان کے دلوں میں ڈال دے ﴿فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوی إِلَیْهِمْ﴾) اور انہیں طرح طرح کی (مادی و معنوی) ثمرات سے بہرہ مند کردے، شاید وہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کرے ﴿وَ ارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَراتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُونَ﴾۔

ایک موحد اور آگاہ انسان جانتا ہے کہ علم الہی کے مقابلے میں اس کا علم محدود ہے اور اس کے مصالح کو صرف خدا جانتا ہے، اکثر وہ خدا سے ایسی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے جو اس کے لئے قرین مصلحت نہیں ہوتیں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جن میں اس کی مصلحت ہے لیکن وہ ان کے لئے درخواست نہیں کرتا اور کبھی اس کے دل کی آرزوئیں ہوتی ہیں کہ جن سب کو وہ زبان پر نہیں لا سکتا لہذا مذکورہ دعاؤں اور تقاضوں کے بعد حضرت ابرہیم (علیہ السلام) یوں عرض کرتے ہیں پروردگارا! تو ان سب چیزوں سے اچھی طرح آگاہ ہے جنہیں ہم چھپاتے ہیں یا آشکار کرتے ہیں ﴿ رَبَّنا

إِنَّکَ تَعْلَمُ ما نُخْفی وَ ما نُعْلِن﴾اور زمین و آسمان میں کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں ہے﴿ وَ ما یَخْفی عَلَی اللَّهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْأَرْضِ وَ لا فِی السَّماء﴾۔

اگر میں اپنے بیٹے اور بیوی کے فراق میں غمگین ہوں تو تو جانتا ہے اور اگر آشکار بھی میری آنکھ سے آنسوں جھلکتے ہیں تو تو انہیں دیکھتا ہے ۔ اور اگر فراق میرے دل پر چھایا ہوا ہے تو بھی تو جانتا ہے اور تیرے حکم کی اطاعت سے میرا دل ساتھ ساتھ مطمئن بھی ہے تو بھی تجھے خبر ہے ۔

اور اگر وقت جدائی میری بیوی مجھ سے کہتی ہے :الی من تکلنی ؟

مجھے کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو ؟

تو اس سے بھی تو آگاہ ہے ۔

تو ان سب چیزوں سے آگاہ ہے ۔ اس سر زمین اور ان کا مستقبل ایک دوسرے سے مضبوطی سے بندھا ہوا ہے ، یہ سب تیری بارگاہ علم میں روشن ہے ۔

اس کے بعد نعمات پروردگار کے شکر کی طرف اشارہ ہے ۔ ان میں سے اہم ترین یہ تھی کہ پروردگار نے عالم پیری میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو دو آبرو مند بیٹے اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے تھے بارگاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں : حمد و سپاس ہے اس اللہ کے لئے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق بخشے﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذی وَهَبَ لی عَلَی الْکِبَرِ إِسْماعیلَ وَ إِسْحاقَ﴾(۱)

جی ہاں ! یقینا میرا خدا دعاؤں کو سنتا ہے﴿إِنَّ رَبِّی لَسَمیعُ الدُّعاءِ﴾ ۔

پھر بھی درخواست اور دعا جاری رکھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں پروردگارا ! مجھے نماز قائم کرنے والا قرار دے اور اے میرے خدا ! میری اولاد میں سے بھی اسی طرح قرار دے﴿رَبِّ اجْعَلْنی مُقیمَ الصَّلاةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتی﴾ ۔پروردگارا ! میری دعاء قبول کرلے﴿رَبَّنا وَ تَقَبَّلْ دُعاءِ﴾ ۔

اور آخری تقاضا ابراہیم (علیہ السلام) نے یہ کیا : پروردگارا ! مجھے ، میرے ماں باپ کو سب مومنین کو اس روز بخش دےنا جس دن حساب قائم ہو

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لی وَ لِوالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنینَ یَوْمَ یَقُومُ الْحِسابُ﴾ ۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا مکہ اس وقت شہر تھا؟

زیر نظر آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ ابراھیم (علیہ السلام) اچانک عرض کرتے ہیں کہ خداوندا! میں اپنے بیٹے کو ایک ایسی سرزمین میں چھوڑ رہا ہوں جہاں پانی ہے نہ آبادی اور نہ زراعت۔

یقینا یہ سرزمین مکہ میں ورود کا آغاز ہے کہ جب پانی تھا نہ آبادی، نہ مکان تھا نہ مکین۔ صرف خانہ خدا کے باقی ماندہ آثار تھے جو وہاں دکھائی دیتے تھے اور کچھ خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑ تھے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اس علاقہ کا یہی ایک سفر نہ کیا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ نے اس سر زمین مقدس پر بارہا قدم رکھا جبکہ تدریجاً مکہ شہر کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ قبیلہ "جرہم" وہاں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ چشمہ زمزم پیدا ہونے پر علاقہ رہائش کے قابل ہو چکا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی یہ دعائیں ان کے کسی بعد کے سفر سے تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کہتے ہیں: خداوندا! اس شہر کو جاء امن و امان قرار دے۔

اور یہ جو وادی "غیر ذی زرع" کہا ہے تو یہ یا گزشتہ زمانے کی بات کر رہے ہیں اور اپنے پہلے سفر کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ سرزمین مکہ ایک شہر بن جانے کے بعد بھی نا قابل زراعت ہے لہذا اس کی ضروریات باہر سے آنا چاہئیں کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے جہاں پانی بہت کم ہے۔

۲۔ مکہ سرزمین امن

یہ بات جاذب نظر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سرزمین میں جو سب سے پہلی دعا کی وہ (امن) کے لئے تھی۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن کی نعمت انسانی زندگی کے لئے، کسی جگہ قیام کرنے کے لئے اور ہر قسم کی تعمیرِ آبادی اور ترقی کے لئے پہلی شرط ہے اور ہے بھی ایسا ہی۔ اگر کسی جگہ امن و امان نہ ہو تو وہ رہنے کے قابل نہیں اگرچہ دنیا کی تمام نعمتیں وہاں موجود ہوں۔ اصولی طورپر وہ شہر، آبادی اور ملک کہ جو امن کی نعمت سے محروم ہو گویا وہ تمام نعمتیں کھو بیٹھا ہے۔

یہاں اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے امن کے بارے میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کو دو طرح سے قبول کیا ہے۔ اسے امنیت تکوینی بھی دی کیونکہ یہ ایسا شہر ہو گیا کہ جس نے پوری تاریخ میں امن

کے لئے تباہ کن حوادث بہت کم دیکھے ہیں اور اسے امنیت تکوینی بھی دی ۔ یعنی خدا نے حکم دیا ہے کہ تمام انسان بلکہ جانور تک اس زمین میں امن و امان میں رہیں ۔ یہاں کے جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہے ۔ (۲)

---

۱ ۔ جب حضرت اسماعیل (علیہ السلام) اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) پیدا ہوئے اس وقت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی عمر کیا تھی ۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) ۹۹ سال کے تھے کہ پہلے فرزند اسماعیل (علیہ السلام) پیدا ہوئے اور ۱۱۲ سال کے تھے جب اسحاق (علیہ السلام) نے آنکھ کھولی ۔ بعض نے اس سے کم اور بعض نے زیادہ عمر لکھی ہے تا ہم یہ مسلم ہے کہ اس وقت آپ کی عمر اتنی تھی کہ معمولاً اس عمر میں بچے کی پیدائش بہت بعید معلوم ہوتی تھی ۔

۲ ۔ اس وقت جبکہ ہم تفسیر کے اس حصہ کو مرتب کر رہے ہیں امت اسلامی پر ایک نہایت اندوہناک سانحہ گزرا ہے ۔ سرزمین حرم پر اطراف خانہ خدا میں سعودی پولیس نے وحشت و درندگی کی انتہا کردی ۔ اس نے ایرانی حاجیوں پر گولی چلائی ۔ سیکڑوں عورتیں بچے بوڑھے شہید ہو گئے ۔ ایک انتہائی منظم پر امن اور باوقار جلوس پر یہ ظلم صرف اس "جرم" پو ہوا کہ وہ عالمی طاغوتی طاقتوں امریکہ ، روس اور اسرائیل کے خلاف اظہار نفرت کر رہے تھے ۔ یہ واقعہ ان دنوں میں ہوا جب خلیج فارس میں امریکہ نے کھلم کھلا فوجی مداخلت شروع کردی ہے تاکہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنی رسوائی سے بدلا لے سکے ۔ ایسے میں جبکہ مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط استعماری ایجنٹوں ، فوجی آمروں اور بادشاہوں نے ایران کی اسلامی حکومت کے خلاف ایکا کر لیا ہے اور سب امریکہ سے تعاون پر کمر بستہ ہیں ۔ سودیوں نے نہ فقط سرزمین کعبہ کو اسلام کے صریح احکام کے خلاف زائرین حرم کے خون سے لالہ زار بنایا بلکہ ایسا پوری دنیا میں ان مظلوموں کے خلاف پراپیگنڈہ کیا ۔ صہیونیت اور استعماری قوتوں کے تمام نشریات ادارے ان مظلوموں کے خلاف استعمال ہوئے ۔ قاتلوں کو امن کا محافظ اور مشرکین اور دشمنان اسلام کے خلاف فریاد کرنے والوں کو امن کا دشمن قرار دیا گیا ۔

سعودی ایسا کیوں نہ کرتے کیوں کہ یہ اسی یزید اور حجاج کے افکار کے وارث ہیں جنہوں نے خانہ خدا کی حرمت پامال کی تھی (ثاقب) (اگست ۱۹۸۷ء) ۔

یہاں تک کہ جو مجرم اس حرم اور خانہ خدا میں پناہ لیں ان کا تعاقب بھی جائز نہیں ۔ ایسے مجرین کا صرف پانی بند کیا جا سکتا ہے تا کہ وہ باہر نکل آئیں اور سر تسلیم خم کردیں ۔

۳۔ ابراہیم (علیہ السلام) بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) معصوم نبی تھے اور ان کے بلاواسطہ بیٹے جو آیت کے لفظ "بنی" کے یقینی مصداق ہیں یعنی اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) بھی معصوم پیغمبر تھے اس کے باوجود وہ تقاضا کرتے ہیں: خدایا مجھے اور انھیں بتوں کی پوجا سے دور رکھ!

یہ بات بت پرستی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تاکید کے لئے دلیل ہے۔ یہاں تک کہ معصوم نبی اور بت شکن بھی اس سلسلہ میں خدا سے دعا کرتے ہیں۔ یہ بعینہ پیغمبر اسلام کی طرف سے اپنی وصیتوں میں حضرت علی (علیہ السلام) یا دوسرے آئمہ کو جو ان کے جانشین تھے انہیں نماز کی تاکید کرنے کے مشابہ ہے جبکہ ان کے بارے میں ترک نماز کا احتمال کا ہرگز کوئی مفہوم نہیں بلکہ اصولی طور پر نماز ان کی سعی و کوشش سے برپا ہوئی ہے۔

تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کس طرح سے کہا کہ پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے حالانکہ وہ پتھر اور لکڑی کے سوا کچھ نہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً بت ہمیشہ پتھر اور لکڑی کے نہیں ہوتے تھے بلکہ کبھی فرعون اور نمرود جیسے افراد لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیتے تھے اور اپنے آپ کو "رب اعلیٰ" "زندہ کرنے والا" اور "مارنے والا" کی حیثیت سے متعارف کرواتے تھے۔

ثانیاً بعض اوقات پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے متولی اور کارندے اس طرح سے آراستہ و پیراستہ کرتے اور ان کے لئے ایسے احترامات بجا لاتے کہ وہ واقعاً سادہ لوح عوام کے لئے گمراہ کن ہو جاتے تھے۔

۴۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے تابع کون ہیں؟

زیر بحث آیات میں ہے کہ ابراہیم کہتے ہیں: خداوندا! وہ لوگ جو میری پیروی اور اتباع کرتے ہیں۔

یہاں سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار صرف وہ لوگ تھے جو ان کے زمانے میں تھے یا ان کے بعد ان کے دین پر تھے یا ساری دنیا کے توحید پرست اور خدا پرست اس میں شامل ہیں کیونکہ ابراہیم (علیہ السلام) توحید اور بت شکنی کی علامت اور نمونہ ہیں۔

قرآنی آیات میں ملت اسلامیہ اور دین اسلام کو ملت و دین ابراہیمی کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا ہے۔[۱]

اس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعاء تمام توحید پرستوں اور راہ توحید میں جد و جہد کرنے والوں کے لئے ہیں ۔

آئمہ اھلبیت (علیہ السلام) سے مروی روایات میں بھی اس تفسیر کی تاکید کی گئی ہے ۔ ان میں سے ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے ۔ آپ (علیہ السلام) فرماتے ہیں :

من احبنا فھو منا اھل البیت قلت : جعلت فداک منکم قال : منا واللہ اما سمعت قول ابراہیم !"من تبعنی فانه منی "

جو شخص ہم سے محبت رکھے (اور اہل بیت کی سیرت پر چلے) وہ ہم میں سے ہے ۔

راوی نے پوچھا : میں آپ پر قربان ، واقعاً آپ میں سے ہے ؟

فرمایا : واللہ ہم میں سے ہے ۔ کیا تم نے ابراہیم کی گفتگو نہیں سنی جو کہتے ہیں من تبعنی انہ منی (جو شخص میری اتباع کرے وہ مجھ سے ہے)[۲]

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ کسی مکتب کی پیروی اور اس کے پروگرام میں سے تعلق کسی خاندان سے روحانی طور پر تعلق ہونے کے مترادف ہے ۔

ایک اور حدیث میں امام امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

نحن اٰل ابراھیم افترغبون عن ملة ابراھیم و قد قال اللہ تعالیٰ فمن تبعنی فانه منی

ہم آل ابراہیم ہیں ۔ تو کیا ابراہیم کی ملت اور دین سے منہ موڑتے ہو ؟ حالانکہ خدا وند عالم (ابراہیم کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا :

جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے ۔

---

۱ . حج ۔۷۸۔

۲ ۔ تفسیر نور الثقلین ، جلد ۲ ص۵۴۸۔

۵۔ وادی - "غیر ذی زرع " اور خدا کا پر امن حرم

جو لوگ مکہ گئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خانہ خدا مسجد حرام اور پورا مکہ مکرمہ چند خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان واقع ہے ۔ گویا پتھروں کو پہلے ایک چلتے ہوئے تنور میں بھونا گیا ہے اور پھر انھیں ان کی جگہ پر نصب کیا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ خشک اور جلا دینے والی زمین عبادت کا عظیم ترین مرکز اور روئے زمین پر توحید کا اولین مرکز ہے علاوہ ازیں خدا کا حرم امن ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے امنیت تکوینی کا بھی حامل ہے اور امنیت تشریعی کا بھی ۔

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسا مرکز ایسی سرزمین پر کیوں بنایا ۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام نے خطبہ قاصعہ میں نہایت خوبصورت اور عمدہ الفاظ میں اس کا فلسفہ بیان فرمایا ہے :۔

وضعه باوعر بقاع الارض حجراً و اقل نتائق الدنيا مدراً.......بين جبال خشنه و رمال دمثة ...... ولو اراد سبحانه ان يضع بيته الحرام و مشاعره العظام بين جنات و انهار و سهل وقرار جم الاشجار ، دانی الثمار ، ملتف البنى ، متصل القرى ، بين برة سمراء و روضة خضراء ، و ارياف محدقه ، و عراص مغدقة و رياض ناظرة و طرق عامره لكان قد صغر قدر الجزاء على حسب ضعف البلاء ، ولو كان الاساس محمول عليهاو الاحجار المرفوع بها، بين زمردة خضراء و ياقوتة حمراء ، ونور وضياء ، لخفف ذالک مصارعة الشک فی الصدور ، و لوضع مجاهدة ابليس عن القلوب ، ولنفى معتلج الريب من الناس ، و لٰكن الله يختبر عباده بانواع الشدائد ، و يتعبدهم بانواع المجاهد ويبتليهم بضروب المكارة ، اخراجا للتكبرمن قلوبهم ، و اسكاناً للتذلل فی نفوسهم ، و ليجعل ذٰلک ابواباً فتحاً الیٰ فضله ، و اسباباً ذللا لعفوه۔

خدا نے اپنا گھر سنگلاخ ترین علاقے ، نہایت بے آب و گیاہ زمین ، سخت پہاڑوں اور ریگستانی علاقے میں قرار دیا ہے ۔

اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنا گھر اور احرام اور حج جیسی عظیم عبادت کا مقام کسی ایسے علاقے میں بنا سکتا تھا کہ جہاں باغات ہوتے ، نہریں بہہ رہی ہوتیں ، زمین ہموار ہوتی ، ہر طرف درخت ہوتے ، جہاں پھلوں پھولوں کی فراوانی ہوتی ، ارد گرد محلات اور آبادیاں ہوتیں گندم کے کھیت ہوتے سبزہ ہی سبزہ ہوتا ، خوبصورت کیاریاں ہوتیں ، پانی سے سیراب چمن ہوتے ، شاداب گلستان ہوتے اور آباد شاہراہیں ہوتیں ۔

لیکن عظیم حج اور عبادت کی آزمائش جس قدر سہل اور آآرام وہ ہوتی اجر و جزا بھی اسی قدر کم ہوتی ۔

نیز ااگر خدا چاہتا تو کعبہ کے ستون اور اس کی عمارت کے پتھر سبز زمرد اور سرخ یاقوت کے ہوتے جن سے روشنی پھوٹتی لیکن یہ چیز سینوں سے شک وشبہات کا ٹکراؤ کم کردیتی اور دلوں سے شیطان کی دوڑ دھوپ کا اثر زایل کردیتی اور لوگوں سے شکوک کے خلجان دور کردیتی مگر اللہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجا گئی ہو اور اور انھیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے دلوں سے غرور تکبر کو نکال باہر کرے اور ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے اور یہ کہ اس آزمائش کی راہ سے اپنے فضل و امتنان کے کھلے ہوئے دروازوں تک انھیں پہونچائے اور سے اپنی معافی اور بخشش کا آسان وسیلہ قرار دے ۔[1]

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ قاصعہ، خطبہ ۱۹۲۔

۶۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں

زیر نظر آیات میں توحید و دعا کے ہیرو اور بتوں، بت پرستی اور ظالموں کے خلاف قیام کرنے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بارگاہ خدا میں سات دعائیں مذکور ہیں۔

پہلی دعاء: توحیدی معاشرے کے عظیم مرکز شہر مکہ کی امنیت کے بارے میں ہے اور یہ دعاء نہایت معنی خیز ہے۔

دوسری دعاء: بتوں کی پرشتش سے دور رہنے کے بارے میں ہے کہ جو تمام دینی عقائد اور پروگراموں کی اساس ہے۔

تیسری دعاء: ان کی اولاد اور ان کے مکتب کے پیرو کاروں کی طرف تمام لوگوں اور خدا پرستوں کے قلبی میلان اور فکری رجحان کے بارے میں ہے کہ جو معاشرے میں کسی انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہو سکتا ہے۔

چوتھی دعاء: شکر گزاری کے مقدمہ کے طور پر اور خالق نعمات کی طرف مزید توجہ کے جزبہ سے انواع و اقسام کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے بارے میں ہے۔

پانچویں دعاء: قیام نماز کی توفیق کے متعلق ہے اور یہ انسان کے خدا کے ساتھ عظیم ترین رشتہ کی علامت ہے اور یہ دعا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے بھی کرتے ہیں۔

چھٹی دعاء: قبولیت دعاء کے بارے میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا وہ دعا قبول کرتا ہے کہ جو پاک دل اور بے آلائش روح سے نکلے۔

ساتویں دعاء: اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا آخری تقاضا اس بارے میں ہے کہ اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہے تو بخشنے والا اور مہربان خدا انہیں اپنے لطف و بخشش سے نوازے اور اسی طرح روز قیامت ان کے ماں باپ اور تمام مومنین کو اپنے لطف و رحمت سے بہرہ ور کرے۔

اس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں امنیت سے شروع ہوتی ہیں اور مغفرت و بخشش پر تمام ہوتی ہیں۔ یہ امر جاذب نظر ہے کہ ان دعاؤں میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) صرف اپنے لئے تقاضا نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے لئے بھی طلب کرتے ہیں کیونکہ مردانِ خدا کبھی بھی صرف اپنے لئے نہیں سوچتے۔

۷۔ کیا ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ کے لئے دعاء کررہے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ آزر بت پرست تھا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس کی ہدایت کے لئے حضرت ابراہیم کی کوششیں موثر ثابت نہ ہو سکیں اور اگر ہم یہ مان لیں کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تھا تو یہ سوال سامنے آئے گا کہ ان آیات میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس کی بخشش کی دعاء کیوں کر رہے ہیں حالانکہ قرآن صراحت سے مومنین کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے روکتا ہے۔ (توبہ۔۱۱۳)۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ آزر کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ جو علماء نے کہا ہے کہ لفظ "اب عربی زبان میں کبھی چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے، زیر بحث آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو یہ بات پوری طرح قابل و قبول معلوم ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ "اب" اور "والد" میں فرق ہے۔ لفظ "والد" کہ جو زیر بحث آیات میں بھی استعمال ہوا ہے صرف باپ کے معنی میں ہے لیکن لفظ "اب" کہ جو آزر کے متعلق آیا ہے چچا کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات اور سورہ توبہ کی آیات کہ جن میں مشرکین کے استغفار کی ممانعت کی گئی ہے کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو ہم نہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آزر یقینا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں تھا۔ [1]

۱۔ مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۲۴۸۔ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات ۴۲،۴۳،۴۴،۴۵

۴۲۔﴿وَ لا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غافِلاً عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّما يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فيهِ الْأَبْصارُ﴾ ۔۔

۴۳۔﴿مُهْطِعينَ مُقْنِعي رُؤُسِهِمْ لا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَ أَفْئِدَتُهُمْ هَواءٌ ﴾۔

۴۴۔﴿وَ أَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتيهِمُ الْعَذابُ فَيَقُولُ الَّذينَ ظَلَمُوا رَبَّنا أَخِّرْنا إِلى أَجَلٍ قَريبٍ نُجِبْ دَعْوَتَکَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ أَ وَ لَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ ما لَكُمْ مِنْ زَوالٍ﴾۔

۴۵۔﴿وَ سَكَنْتُمْ فی مَساكِنِ الَّذينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنا بِهِمْ وَ ضَرَبْنا لَكُمُ الْأَمْثالَ﴾۔

ترجمہ

۴۲۔ اور یہ گمان نہ کرکہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے (ایسا نہیں ہے بلکہ اس نے) ان کے لئے (سزا کو) اس دن کے لئے موخر کیا ہے کہ جس دن (خوف و وحشت کے مارے) آنکھیں پتھرا جائیں گی ۔

۴۳ ۔ وہ گردنیں اوپر کی اور سر اٹھائے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بے حرکت ہو کر رہ جائیں گی (کیونکہ وہ جدھر دیکھیں گے عذاب کی نشایاں نظر آئیں گی) اور ان کے (ڈوبتے ہوئے) دل بالکل ویران ہونگے ۔

۴۴۔ اور لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس روز عذاب الٰہی ان کی طرف آئے گا وہ دن کہ جب ظالم کہیں گے: پروردگارا ! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لئے مہلت دے دے تاکہ ہم تیری دعوت قبول کرلیں اور رسولوں کی اتباع کرلیں (لیکن انہیں فوراً جواب دیا جائے گا کہ) کیا پہلے تم قسم کھا کر نہ کہتے تھے کہ تمہارے لئے زوال و فنا نہیں ہے ۔

۴۵۔ (کیا وہ تمہی نہ تھے کہ) جنہوں نے ان لوگوں کے گھروں (اور محلات) میں سکونت اختیار کی کہ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا جبکہ تم پر یہ امر آشکار ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ہم نے تم سے (گزشتہ لوگوں کے انجام کی) مثالیں بیان کردی تھیں (پھر بھی تم بیدار نہ ہوئے) ۔

تفسیر

جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی

گزشتہ آیات میں یوم حساب کے بارے میں گفتگو تھی ۔ اسی مناسبت سے زیر نظر آیات میں ظالموں اور ستم گروں کی کیفیت مجسم کی گئی ہے اور ان کے انجام کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی ہے ۔ ضمناً مسائل معاد کے اس حصہ کے ذکر سے گزشتہ مباحث توحید کی تکمیل بھی ہوتی ہے ۔

پہلے ظالموں اور ستم گروں کو تہدید کی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : اے پیغمبر! کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں اور ستم گروں کے کام سے غافل ہے ۔ ﴿و لا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غافِلاً عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰالِمُونَ﴾۔

یہ بات در حقیقت ان لوگوں کا جواب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اگر اس عالم کا کوئی عادل خدا ہے تو پھر اس نے ظالموں کو کیوں ان کی حالت پر چھوڑ رکھا ہے ۔ کیا وہ ان کی حالت سے غافل ہے یا پھر کیا وہ جانتا تو ہے لیکن انہیں روکنے کی قدرت نہیں رکھتا ؟

اس سوال کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ خدا ہرگز غافل نہیں ہے ۔ اگر وہ انہیں فوراً سزا نہیں دیتا تو اسک کی وجہ یہ ہے کہ یہ جہان میدان عمل ہے اور یہ انسان کی آزمائش و پرورش کا مقام ہے اور یہ مقصد آزادی عمل کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا ۔ لیکن آخر کا ان کا یوم حساب آ کے رہے گا ۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے : خدا ان کی سزا اور عذاب ایسے دن پر اٹھا رکھا ہے جس میں خوف و وحشت کے مارے آنکھیں پتھرا جائیں گی اور ایک نقطہ پر لگی بے حس و حرکت ہو کر رہ جائیں گی (ا﴿إِنَّما یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فیهِ الْأَبْصارُ ﴾ ۔

اس روز کی سزا اور عذاب اس قدر وحشت ناک ہو گا کہ شدت خوف کے باعث یہ ستمگر اپنی گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ ان کی پلکیں بھی حرکت نہ کریں گی اور شدت اضطراب سے ان کے دل ویران ہو جائیں گے ﴿مُهْطِعینَ مُقْنِعی رُؤُسِهِمْ لا یَرْتَدُّ إِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ وَ أَفْئِدَتُهُمْ هَواءٌ﴾۔

تشخص " شخوص " کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے آنکھوں کا بے حرکت ہو کر ایک ہی نقطہ پر جم کر رہ جانا ۔

" مھطعین " " اھطاء " کے مادہ سے گردن اونچی کرنے کے معنی میں ہے ۔ بعض نے اسے تیز ہونے کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ذلت و عجز کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں ہے لیکن آیت کے دیگر حصوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلا معنی ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

" مقنعی " " اقناع " کے مادہ سے آسمان کی طرف سر بلند کرنے کے معنی میں ہے ۔

" ﴿لا یَرْتَدُّ إِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ﴾ " کا مفہوم یہ ہے کہ وحشت کے مارے ان کی پلکیں ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتیں گویا مردوں کی آنکھوں کی طرح بے کار ہو چکی ہیں ۔

"﴿وَ أَفْئِدَتُهُمْ هَواءٌ﴾" ان کے دلوں کے ویران ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے وحشت ناک خبر سنائی تو اچانک میرا دل بیٹھ گیا اور ویران ہو گیا۔ گویا وہ یوں حواس کھو دیں گے کہ انہیں کسی چیز کی ہوش نہ رہے گی یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائیں گے گویا ان میں نہ دل ہے نہ جان، کوئی چیز انہیں یاد نہیں۔

یہاں ان کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں:۔

آنکھوں کا خیرہ ہونا،

گردنوں کا اونچا ہونا،

سر کا بلند ہونا،

پلکیں نہ جھپک سکنا اور

سب کچھ بھول جانا۔

یہ اضطراب و وحشت کے عالم کی انتہائی عمدہ اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس روز ظالموں کی یہ حالت ہوگی۔ وہ ظالم کہ جو غرور تکبر میں ہر چیز کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے۔ اس دن ان کی بے چارگی کا یہ عالم ہوگا کہ پلکیں بھی نہ جھپک سکیں گے۔ ان ہولناک مناظر سے آنکھیں چرانے کے لئے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوں گے کیونکہ وہ جدھر بھی دیکھیں گے وحشت ناک مناظر ان کے سامنے ہوں گے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے تھے اور دوسروں کو بے عقل تصور کرتے تھے۔ اس روز عقل و ہوش گنواں بیٹھیں گے اور دیوانے معلوم ہوں گے بلکہ ان کی آنکھیں مردوں کی آنکھوں کی طرح ویران اور بے حرکت ہوں گی۔

واقعاً جب قرآن کسی منظر کی تصویر کشی کرتا ہے تو نہایت مختصر عبارت میں کامل ترین تصویر پیش کردیتا ہے۔ زیر نظر آیت بھی اس کا نمونہ ہے۔

اس کے بعد اس لئے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ خدائی عذاب کسی خاص گروہ سے مربوط ہے خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک عمومی حکم دیتا ہے: تمام لوگوں کو اس دن سے ڈرا جس دن پروردگار کا دردناک عذاب بدکاروں کا رخ کرے گا، جس وقت ظالم اپنے اعمال کے وحشت ناک نتائج دیکھیں گے تو پریشان ہوں گے اور ان کی تلافی کے لئے سوچیں گے اور

عرض کریں گے: پروردگارا! ہمیں کچھ دیر کی مہلت دے دے﴿وَ أَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتيهِمُ الْعَذابُ فَيَقُولُ الَّذينَ ظَلَمُوا رَبَّنا أَخِّرْنا إِلى أَجَلٍ قَريب﴾۔ تاکہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "ہم تیری دعوت قبول کریں اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں" ﴿نُجِبْ دَعْوَتَکَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ﴾۔

لیکن فوراً ان کی بات مسترد کردی جائے گی اور انہیں ہولناک پیغام دیا جائے گا کہ ایسا ہونا اب محال ہے، عمل کا دور ختم ہو چکا ہے "کیا تم ہی نہ تھے جو قسم کھایا کرتے تھے کہ تمہاری طاقت زوال پذیر نہیں ہے" ﴿أَ وَ لَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ ما لَكُمْ مِنْ زَوالٍ﴾۔

تم وہی نہیں جو ان کے گھروں اور محلات میں رہتے تھے جنہوں نے ظلم کیا تھا﴿وَ سَكَنْتُمْ فی مَساكِنِ الَّذينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ﴾۔ جبکہ تم پر حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا﴿وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنا بِهِمْ﴾۔

اور ہم نے تم سے گزشتہ امتوں کی ہلا دینے والی مثالیں بیان کیں ﴿وَ ضَرَبْنا لَكُمُ الْأَمْثالَ﴾۔

لیکن ان عبرت انگیز درسوں میں سے کوئی بھی تم پر اثر انداز نہ ہو اور تم نے اسی طرح اپنے شرمناک اعمال اور ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رکھا اور اب جبکہ تم الٰہی کیفر کردار کو پہنچے ہو تو مہلت دئے جانے کا تقاضا کر رہے ہو۔ کیسی مہلت؟ اب موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ پیغمبر اکرم سے خطاب کیوں ہے؟

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کبھی تصور بھی نہیں کرتے کہ خدا ظالموں کے کام سے غافل ہے لیکن اس کے باوجود زیر نظر آیات میں رسول اللہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے۔

یہ درحقیقت بالواسطہ طور پر دوسروں کو پیغام دیا گیا ہے اور یہ بھی فصاحت کا ایک فن ہے کہ کبھی کسی ایک شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن مراد دوسرا شخص یا دیگر اشخاص ہوتے ہیں۔

علاوہ از ایں یہ تعبیر در اصل تہدید کے لئے کنایہ ہے۔ مثلاً کبھی ہم کسی قصوروار سے کہتے ہیں: "فکر نہ کرو ہم تیری تقصیریں بھول چکے ہیں" یعنی موقع پر ہم تیرا حساب چکائیں گے۔

بہر حال اس دنیا کی اساس اس پر ہے کہ تمام افراد کو کافی حد تک مہلت دی جائے تاکہ جو کچھ ان کے اندر رہے ظاہر ہو جائے اور آزمایش اور تکامل کا میدان وسیع ہو ۔ یہ اس لئے ہے کہ کسی کے لئے عذر و بھانہ باقی نہ رہے اور سب کو باز گشت ، اصلاح اور تلافی کا موقع دیا جائے ۔ اسی لئے گنہگاروں کو مہلت دی جاتی ہے ۔

۲۔ "یوم یاتیھم العذاب" سے کون سا دن مراد ہے ؟

زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ رسول اللہ کو اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اس دن سے درائیں جس دن عذاب ان کی طرف آئے گا ۔ اس دن سے کونسا دن مراد ہے ، اس سلسلے میں مفسرین نے تین احتمالات ذکر کئے ہیں :

پہلا ۔ یہ کہ یہ قیامت کا دن ہے ۔

دوسرا ۔ یہ کہ یہ موت آنے کا دن ہے کہ جس دن عذاب الہی کا مقدمہ ظالموں کا رخ کرے گا ۔

تیسرا ۔ یہ کہ کچھ دنیاوی سزاؤں کے نزول کا دن ہے ۔ مثلاً جس روز قوم لوط ، قوم عاد و ثمود ، قوم نوح اور فرعونیوں پر عذاب ہوا ۔ یہ لوگ دریا کی دھاڑتی ہوئی موجوں کا شکار ہوئے ، یا غرقِ طوفان ہوئے یا زلزلوں سے تباہ ہوئے ، یا شدید ویران گر آندھیوں سے برباد ہوئے ۔

اگر چہ بہت سے مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن بعد میں آنے والے جملے واضح طور پر تیسرے احتمال کو تقویت دیتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ مراد دنیاوی نوبود کرنے والے عذاب ہیں ۔ اور ان کا شکار ہونے والے کہتے ہیں کہ پروردگارا ! ہمیں تلافی کے لئے تھوڑی سی مہلت دے دے ۔

" اخرنا " (ہمیں تاخیر میں ڈال دے) ۔ یہ تعبیر دنیاوی زندگی جاری رکھنے کی درخواست کے لئے واضح قرینہ ہے ۔ اگر وہ یہ بات روز قیامت آثار عذاب دیکھ کر کہتے تو انہیں کہنا چاہیے تھا : خداوندا : ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے ، جیسا کہ سورہ انعام کی آیہ ۲۷ میں ہے :﴿وَ لَوْ تَرى إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقالُوا يا لَيْتَنا نُرَدُّ وَ لا نُكَذِّبَ بِآياتِ رَبِّنا وَ نَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنينَ﴾۔

اگر تو انہیں سد عالم میں دیکھے کہ جب وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو تو دیکھے گا کہ وہ کہتے ہیں : کاش ! ہم دنیا کی طرف پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیات کی تکذیب نہ کرتے اور ہم مومنین میں سے ہوجاتے (تو تجھے ان کی حالت پر افسوس ہوگا) ۔

کیونکہ فوراً بعد والی آیت میں ان کا جواب اس طرح دیا گیا ہے: ﴿وَ لَوْ رُدُّوا لَعادُوا لِما نُهُوا عَنْهُ وَ إِنَّهُمْ لَكاذِبُونَ﴾۔ یہ جھوٹ کہتے ہیں اگر لوٹ بھی جائیں تو انہیں اعمال میں مشغول ہو جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا سے ڈرانے کے لئے ہے جبکہ اس سے پہلی آیت "﴿ولا تحسبن الله غافلاً﴾--" میں تو عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے تو یہ امر ایک دوسرے سے کس طرح سے مناسبت رکھتا ہے؟ نیز لفظ " انما " اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں صرف قیامت میں سزا دی جائے گی اور وہاں ان پر عذاب ہوگا نہ کہ اس دنیا میں۔

لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ سے جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ سزا اور عذاب کہ جس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے عذاب قیامت ہے جو سب ظالموں کو لاحق ہوگا لیکن دنیاوی سزائیں ایک تو عمومیت نہیں رکھتیں اور دوسرا بازگشت کے بھی قابل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تباہ کن دنیاوی عذاب مثلاً وہ المناک عذاب جو قوم نوح یا آل فرعون اور ان جیسے لوگوں کو دامن گیر ہوا۔ ایسا عذاب شروع ہوجائے تو توبہ کے دروازہ بند ہو جاتے ہیں اور لوٹ آنے کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب گنہگار لوگ ایسی سزاؤں کا سامنا کرتے ہیں تو اظہار پشیمانی کرتے ہیں لیکن یہ در حقیقت ایک اضطراری ندامت ہوتی ہے جس کا کوئی وزن نہیں۔ لہذا ایسا عذاب شروع ہونے سے پہلے تلافی کے در پے ہونا چاہیے۔ (۱)

۱-مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد سوم سورہ نساء آیہ ۱۸- کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا ؟

قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہے کہ برے عمل کرنے والے اور ظالم مختلف مواقع پر تقاضا کریں گے کہ انہیں اپنے گزشتہ کی تلافی کے لئے پھر سے دنیاوی زندگی مل جائے ۔ ان میں سے بعض آیات روز قیامت سے مربوط ہیں مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۲۸ ۔جس کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے ۔ بعض دیگر آیات وقت موت آپہنچنے سے مربوط ہیں مثلاً سورہ مومنون کی آیہ ۹۹۔ اس میں فرمایا گیا ہے :

حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحاً فیما ترکت

یہی حالت رہتی ہے یہاں تک کہ جب کہ کسی کی موت کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے : خداوندا! مجھے پلٹا دے ۔ شاید میں اپنے کئے کی تلافی کر سکوں اور عمل صالح انجام دوں ۔

کچھ آیات تباہ کن عذاب کے موقع سے مربوط ہیں ۔ مثلاً زیر بحث آیات میں ہے کہ نزول عذاب کے وقت ظالم مہلت کا تقاضا کریں گے ۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ ان تمام مواقع پر جواب نفی میں ہے ۔ اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ ان میں سے کوئی تقاضا بھی حقیقی نہیں ہے یہ سب اس اضطراری حالت اور انتہائی پریشانی کا رد عمل ہیں جو ان بت ترین افراد کو لاحق ہوگی ۔ ان کے یہ تقاضے کسی داخلی انقلاب اور زندگی میں تغیر کے لئے عزم حقیقی کی دلیل نہیں ہیں ۔

یہ تو بالکل ان مشرکین کی سی حالت ہے جو دریاؤں کے ہولناک گردابوں میں پھنس جائیں تو بڑے خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں لیکن طوفان رکتے ہی اور ساحل نجات تک پہنچتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں ۔

اسی لئے قرآن مذکورہ آیات میں صراحت سے کہتا ہے :

﴿ولو ردو العادوا لما نھو عنہ﴾

اگر یہ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ جائیں تو پھر وہی طرز عمل جاری رکھیں گے ان کی روش میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی ۔

یعنی ۔ وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی وسواب بھی ہے ۔

آیات ۵۲،۵۱،۵۰،۴۹،۴۸،٦٤،٣٦

۴٦۔ ﴿وَ قَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَ إِنْ كانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبالُ﴾۔

۴۷۔ ﴿فَلا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقامٍ﴾۔

۴۸۔ ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّماواتُ وَ بَرَزُوا لِلَّهِ الْواحِدِ الْقَهَّارِ﴾۔

۴۹۔ ﴿وَ تَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفادِ﴾۔

۵۰۔ ﴿سَرابِيلُهُمْ مِنْ قَطِرانٍ وَ تَغْشى وُجُوهَهُمُ النَّارُ﴾۔

۵۱۔ ﴿لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ ما كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسابِ﴾۔

۵۲۔ ﴿هذا بَلاغٌ لِلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوا بِهِ وَ لِيَعْلَمُوا أَنَّما هُوَ إِلهٌ واحِدٌ وَ لِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبابِ﴾۔

ترجمہ

۴٦۔ انہوں نے اپنا پورا مکر کیا اور ان کے سارے مکر (اور سازشیں) خدا کے سامنے آشکار ہیں اگر چہ ان کے مکر سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

۴۷۔ اور یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ان وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا جو اس نے اپنے رسولوں سے کئے ہیں کیونکہ خدا قادر و منتقم ہے۔

۴۸۔ وہ دن کہ جب یہ زمین دوسری زمین میں بدل جائے گی اور آسمان (دوسرے آسمانوں میں) تبدیل ہو جائیں گے اور خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں ظاہر ہوں گے۔

۴۹۔ اور تو اس دن مجرموں کو اکھٹا طوق و زنکیر میں دیکھے گا (ایسے طوق و زنجیر جن سے ان کے ہاتھ اور گردنیں اکھٹی بندھی ہونگی)۔

۵۰۔ اور ان کا لباس قطران (جلانے والا چپکا ہوا بدبودار مادہ) کا ہوگا اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی۔

۵۱۔ تاکہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔

۵۲۔ یہ (قرآن) (سب) لوگوں کے لئے اعلان ہے تاکہ سب کو تہدید ہو جائے اور (سب) جان لیں کہ وہ اکیلا معبود ہے نیز اس لئے کہ صاحبان عقل (اور غور و فکر کرنے والے) نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

ظالموں کمزور سازشیں

گزشتہ آیات میں ظالموں کی کچھ سزاؤں کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ ان آیات میں بھی پہلے ان کے بعض کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر ان کے لئے بعض سخت اور دردناک سزاؤں کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ہے: انہوں نے مکر کیا اور جس قدر ان سے بن پڑتا تھا سازش اور شیطنت کی (وَ قَدۡ مَکَرُوا مَکۡرَهُمۡ)۔

خلاصہ یہ کہ تیرے دشمنوں نے اسلام کو مٹانے اور نابود کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ ڈرانے دھمکانے سے لے کر اذیت و آزار اور قتل کی سازش کی۔ نیز وہ پراپیگنڈہ کرتے رہے اور طرح طرح کی تہمتیں لگاتے رہے۔

لیکن ان سب کے باوجود اللہ ان کی تمام سازشوں سے آگاہ ہے اور ان کے تمام کام اس کے رکارڈ میں ہیں ﴿وَ عِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُ هُمۡ﴾۔

بہر حال پریشان نہ ہو۔ یہ نیرنگیاں، منصوبے اور سازشیں تجھ پر اثر نہیں ڈالیں گی "اگر وہ اپنے مکر سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں" ﴿وَ إِنۡ كانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُولَ مِنۡهُ الۡجِبالُ﴾۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "مکر" ہر قسم کی چارہ جوئی اور چارہ اندیشی کے معنی میں ہے۔ یہ کام کبھی برائی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اس کے بغیر۔ اگرچہ موجودہ فارسی زبان میں یہ لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن عربی ادب کے لحاظ سے اس کا معنی عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی یہ لفظ خدا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَ عِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُ هُمۡ﴾ کے بارے میں دو احتمال ذکر کئے ہیں۔

بعض مفسرین مثلاً علامہ طبا طبائی نے االمیزان میں کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان کے تمام منصوبوں چالبازیوں اور سازشوں پر پورا احاطہ رکھتا ہے۔

بعض دیگر مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے مکر کی سزا خدا کے ہاں ثابت ہے لہذا یہ جملہ "﴿وَ عِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُ هُمۡ﴾" کی تقدی میں ہے اور لفظ "جزاء" جو مضاف ہے محذوف ہے۔

البتہ پہلا معنی بلا شبہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ اور کسی قسم کے حذف و تقدیر کا بھی محتاج نہیں ہے۔

پہلا جملہ کہ جس میں ہے ۔ " اگرچہ ان کا مکر پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے " یہ بھی اسی تفسیر کو تقویت دیتا ہے ۔یعنی اگرچہ وہ منصوبہ بندی اور سازشوں میں جڑے طاق ہوں ، خدا ان سے زیادہ آگاہ اور زیادہ قدرت والا ہے اور ان کی سازشوں کو درہم برہم کر دیتا ہے ۔

دوبارہ روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے اور ظالموں اور بدکاروں کو دھمکی دی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : تم یہ گمان نہ کرنا کہ خدا نے انبیاء سے جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرے گا ﴿فَلا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ﴾۔ کیونکہ وعدہ خلافی تو وہ کرتا ہے جو قادر و توانا نہ ہو یا سزا و انتقام اس کی لغت میں نہ ہو لیکن " خدا تو توانا بھی ہے اور صاحب انتقام بھی ﴿إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقامٍ﴾۔

یہ آیت در حقیقت ایک گزشتہ آیت "ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون" کی تکمیل کرتی ہے ۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ ظالموں کو مہلت ملی ہوئی ہے تو وہ اس لئے نہی ہے کہ پروردگار ان کے اعمال سے غافل ہے اور نہ اس لئے کہ وہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرے گا بلکہ ان کے تمام حساب ایک ہی دن چکا دے گا اور انہی عادلانہ طور پر سزا دے گا ۔

لفظ " انتقام " موجودہ فارسی میں تلافی کرنا ، کینہ نکالنا اور معاف نہ کرنے کا مفہوم بھی لئے ہوئے ہے ۔ در اصل اس کا یہ معنی نہیں ۔ بلکہ " انتقام " کا مفہوم سزا دینا اور عذاب کرنا ہی ہے ۔ ایسی سزا کہ جو خدا استحقاق اور عدالت کی بنا پر دے گا بلکہ انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے ۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتقام نہ ہو تو یہ اس کی حکمت و عدالت کے خلاف ہوگا ۔

مزید فرمایا گیا ہے : یہ سزا ایسے دن دی جائے گی جبکہ یہ زمین دوسری زمین میں تبدی لہو جائے گی اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائے گا ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّماواتُ ﴾ ۔

اس روز ہر چیز تباہی کے بعد پھر سے صورت پذیر ہوگی اور انسان نئے حالات کے ساتھ نئے عالم میں قدم رکھے گا ۔ ایسا عالم کہ جس کی تمام چیزیں اس عالم سے مختلف ہوں گی " اس کی وسعت ، اس کی نعمتیں اور اس کی سزائیں سب مختلف ہوں گی " اور اس روز جو کچھ بھی کسی کے پاس ہے وہ سب پوری طرح واحد و قہار خدا کے سامنے ظاہر ہو جائے گا ﴿وَ بَرَزُوا لِلَّهِ الْواحِدِ الْقَهَّارِ﴾۔

"برزو" اصل میں "براز" (بروزن "فراز") کے مادہ سے فضا اور وسیع جگہ کے معنی میں لیا گیا ہے ۔ "برزو" کا معنی ایسی فضا اور وسیع علاقہ میں ہوتا ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ ظاہر اور آشکار ہونا ہے ۔ اسی وجہ سے "برزو عام طور پر" ظہور "کے معنی میں آتا ہے (غور کیجئے گا) ۔

روز قیامت انسان کے خدا کے سامنے ظاہر ہونے کا کیا معنی ہے ، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں ۔

بہت سوں نے اسے قبروں سے باہر نکالنے کے معنی میں لیا ہے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بروز کا مطلب انسان کے اندر اور باہر کا سب کچھ ظاہر ہوجانا ہو جیسا کہ سورہ مومن کی آیہ ۱۶ ۔ میں فرمایا گیا ہے :یوم ھم بارزون لا یخفی علیٰ اللہ منھم شیء

وہ دن کہ جب ان کا سب کچھ آشکار ہو جائے گا اور ان کی کوئی چیز مخفی نہ رہے گی ۔

نیز سورہ طارق کی آیہ ۹۔ میں ہے :﴿یوم تبلی السرائر﴾

وہ دن کہ جب ہر شخص کے اندرونی اسرار آشکار ہو جائیں گے ۔

بہر حال اس حالت میں خدا کی قہاریت کا ذکر ہر چیز پر اس کے تسلط اور سب کے اندر اور باہر پر اس کے غلبہ کی دلیل ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی چیز خدا پر مخفی ہے کہ جو وہاں آشکار ہو جائے گی ؟۔ کیا خدا قبروں میں مردوں کے وجود سے بے خبر ہے ؟ یا کیا وہ یہاں انسان کے اندرونی اسرار کو نہیں جانتا ؟

ایک نکتے کی طرف توجہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے ۔ وہ یہ کہ اس جہان میں ایک ہمارا ظاہر ہے اور ایک باطن ۔ بعض اوقات ہامرے علم کے محدود ہونے کی بناء پر یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ خدا ہمارے باطن کو نہیں جانتا لیکن دوسرے جہان میں ہر چیز اس طرح آشکار ہو جائے گی کہ ظاہر و باطن کا فرق نہیں ہوگا ۔ سب کچھ آشکار ہوگا ۔ یہاں تک کہ کسی کے دل میں یہ احتمال بھی پیدا نہیں ہوگا کہ ہو سکتا ہے کوئی چیز خدا سے مخفی رہ گئی ہے ۔

دوسرے لفظوں بروز و ظہور ہماری فکر و نظر کے اعتبار سے ہے کہ علم خدا کے اعتبار سے ۔

اگلی آیت میں مجرمین کی حالت ایک اور پہلو سے تصویر کشی کی گئی ہے : اس روز تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ طوق و زنجیر میں جکڑے ہوں گے ۔ ان کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوں گے اور وہ ایک دوسرے سے بھی بندھے ہوں گے ﴿وَ تَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴾۔

"اصفاد" جمع ہے "صفد" (بروزن "نمد") کی اور "صفاد" (بروزن "معاد") طوق کے معنی میں ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ "صفاد" خاص طور پر اس طوق و زنجیر کو کہتے ہیں جو ہاتھ اور گردن کو ایک دوسرے سے باندھ دے ۔

"مقرنین" "قرن" اور "اقتران" کے مادہ سے اسی معنی میں ہے ۔ البتہ جب اسے باب تفعیل میں منتقل کیا جائے تو اس سے "تکثیر" کا مفہوم حاصل ہوتا ہے ۔ لہذا "مقرنین" کا معنی ہے: "وہ لوگ جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں" ۔اس لفظ سے زیر نظر آیت میں کون لوگ مراد ہیں ۔اس سلسلے میں مفسرین نے تین تفسیریں بیان کی ہیں ۔

پہلی :۔ یہ کہ اس روز مجرین کو طوق زنجیر کے ایک لمبے سلسلے میں ایک دوسرے سے باندھا جائے گا وہ لوگ اسی حالت میں میدان حشر میں پیش ہوں گے ۔ طوق و زنجیر کا یہ سلسلہ اب گنہگاروں کے عملی فکری رشتے اور تعلق کا مظہر ہے ۔ اس تعلق کی بناء پر وہ اس جہان میں باہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے ، ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور ظلم و فساد کی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے ۔ ان کا یہ باہمی ربط وہاں طوق و زنجیر کے اس سلسلے میں مجسم ہوگا ۔

دوسری :۔ تفسیر یہ ہے کہ اس روز مجرم زنجیروں کے ذریعے شیطانوں کے ساتھی ہو جائیں گے اور اس دنیا میں ان کا باطنی تعلق اس جہان میں ایک زنجیر کے ذریعے آشکار ہو جائے گا ۔

تیسری :۔ تفسیر یہ ہے کہ زنجیروں کے ذریعے ان کے ہاتھوں کو ان کی گردن کا قرین بنا دیا جائے گا ۔

کوئی مضائقہ نہیں کہ مجرموں کے بارے میں یہ معانی صحیح ہوں اگرچہ آیت ظاہری مفہوم زیادہ تر پہلے معنی کی تائید کرتا ہے ۔

اس کے بعد ان کے لباس کے بارے میں بتایا گیا ہے اور یہ بھی ان کے لئے ایک عذاب عظیم ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : ان کے لباس قطران کے مادہ سے بنے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ کے شعلے ڈھانپ لیں گے ﴿سَرابیلُهُمْ مِنْ قَطِرانٍ وَ تَغْشى وُجُوهَهُمُ النّارُ ﴾۔

"سرابیل" "سربال" (بروزن "مثقال") کی جمع ہے ۔ اس کا معنی ہے "قمیص" چاہے وہ کسی بھی چیز سے بنی ہو۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ یہ ہر قسم کے لباس کے معنی میں ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور ہے ۔

"قطران" لغت میں کبھی قاف پر زبر اور تا پر سکون اور کبھی قاف کے نیچے زیر اور طاء پر سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے ۔ اس کا معنی ہے ایسا مادہ جو ابہل نامی درخت سے لیا جاتا ہے تا کہ اس بیماری کے باعث ہونے والی سوزش کو ختم کیا

جا سکے اور اس کے مادہ کو جڑ سے ختم کیا جا سکے ۔ بہر حال یہ ایک ایسا بدبو دار سیاہ رنگ مادہ ہے جو شعلہ ور ہو سکتا ہے ۔

(۱)(۲)

بہر کیف " سرا بیلھم من قطران " کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے بدن لباس کی بجائے ایک طرح کے سیاہ رنگ بدبودار جل اٹھنے والے مادہ سے ڈھانپے جائیں گے ۔ یہ ایسا لباس ہوگا جو ویسے بھی برا ہوگا اور دیکھنے میں بھی بہت قبیح ہوگا ۔ بدبو بھی دے گا اور خود بخود جل اٹھنے والا بھی ہوگا ۔ جب لباس میں یہ چار عیب ہونگے تو گویا وہ بدترین لباس ہوگا ۔ کیونکہ لباس زینت کے لئے بھی ہوتا ہے اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے بھی جبکہ یہ لباس برا اور قبیح صورت بھی ہوگا اور جلانے والا بھی ۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لباس گناہ پہن کی مجرم اس جہان میں بارگاہ الٰہی میں بھی اپنے تئیں رو سیاہ کرتے ہیں اور ان کے گنا کا تعفن اس معاشرے کو بھی آلودہ کرتا ہے ۔ نیز ان کے اعمال اس معاشرے میں فساد و گناہ کی آگ بھڑکنے کا باعث بنتے ہیں ۔ یہ " قطران " کہ جس کا لباس انہیں اس جہان میں پہنایا جائے گا گویا ان کے اس جہان اعمال کی تجسیم ہے ۔

یہ جو آیت میں ہے کہ آگ کے شعلے ان کے چہروں کو ڈھانپ دیں گے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حصہ پر " قطران " نہیں ہوگا وہ اس کے شعلوں میں جلے گا ۔

یہ اس لئے ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کے کئے کے مطابق سزا دے (لِيَجْزِيَ اللهُ كُلَّ نَفْسٍ ما كَسَبَتْ) ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ " انہیں ان کے اعمال کی سزا دے گا " بلکہ کہتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے ، انہیں جزا کے طور پر دے گا ۔ دوسرے لفظوں میں ان کی جزا ان کے اعمال مجسم ہونا ہے ۔ اس خاص تعبیر کے باعث یہ آیت تجسیم اعمال کی ایک اور دلیل ہے ۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: اللہ سریع الحساب ہے ۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسابِ﴾)۔

بالکل واضح ہے کہ جب انسان کے اعمال ختم نہ ہوں اور چہرہ بدل کر انسان کے پاس آجائیں تو اس سے زیادہ جلدی حساب اور کیا ہوگا اور در اصل انسان کا حساب اس کے ساتھ ساتھ ہی ہے ۔

بعض روایات میں ہے ۔﴿ان اللہ تعالیٰ یحساب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر﴾

اللہ تعالیٰ چشم زدن میں تمام مخلوقات کا حساب کرلے گا ۔

اصولی طور پر پروردگار کی طرف سے محاسبہ مدت کا محتاج نہیں ۔ مذکورہ بالا روایت نے در اصل مختصر ترین زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۴۵۔ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں ۔

یہ سورہ اور تمام قرآن چونکہ لوگوں کو دعوت توحید دیتا ہے، احکام الٰہی کی تبلیغ کرتا ہے اور احکام الٰہی کی خلاف ورزیوں سے ڈراتا ہے لہذا اس سورہ کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: قرآن کا ابلاغ سب لوگوں کے لئے عمومی ہے ﴿هذا بَلاغٌ لِلنَّاسِ﴾۔ اور انہیں ڈرانے والا ہے ﴿وَ لِيُنْذَرُوا بِهِ﴾۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ ان کا معبود بس وہی ایک ہے ﴿وَ لِيَعْلَمُوا أَنَّما هُوَ إِلهٌ واحِدٌ﴾۔ نیز ہدف یہ ہے کہ صاحبان عقل و فکر متوجہ ہوں ﴿وَ لِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبابِ﴾)

۱۔ تفسیر کبیر، فخر الدین رازی جلد ۱۹ ص ۱۴۸۔

۲۔ فرید وجدی دائرۃ المعارف میں قطران کے مادہ میں کہتا ہے:

یہ ایسا مایع ہے کو پتھر کو کوئلہ کی تقطیر کے وقت ہاتھ آتا ہے جبکہ ایک خاص گیس حاصل کرنے کے لئے عمل تقطیر کیا جاتا ہے اور نباتی قطران بعض درختوں سے لیا جاتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے:

زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ قیامت میں یہ زمین کسی دوسری زمین میں اور اسی طرح آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

کیا اس تبدیلی سے مراد ذاتی وجود کی تبدیلی ہے یعنی کیا یہ زمین بالکل نابود ہو جائے گی اور کوئی دوسری زمین خلق کی دی جائے گی اور قیامت اس زمین میں برپا ہوگی یعنی یہ کرہ خاکی اور یہ آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں پر نئے زمین و آسمان پیدا ہوں گے جو اس زمین و آسمان کی نسبت تکامل و ارتقاء میں زیادہ ہوں گے۔؟

قرآن مجید کی بہت سی آیات کا ظاہری مفہوم دوسرے معنی کی تائید کرتا ہے:۔

سورہ فجر کی آیہ ۲۱۔ میں ہے:﴿كلا اذا دكت الارض دكاً دكاً﴾

ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب زمین درہم برہم ہو جائے گی۔

سورہ زلزال میں اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿اذا زلزلت الارض زلزالها و اخرجت الارض اثقالها﴾

جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور وہ اپنے مخفی بوجھ اگل دے گی۔

سورہ حاقہ کی آیہ ۱۴ اور ۱۵ میں ہے:﴿و حملت الارض والجبال فدكتا دكة واحدة فيومئذوقعت الواقعة﴾

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھالئے جائیں گے اور وہ درہم برہم ہو جائیں گے اور اس روز وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا۔

سورہ طٰہٰ کی آیات ۱۰۵ تا ۱۰۸ میں ہے:

۲۔ سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے سورہ ابراہیم قرآن کے ایک حساس موضوع سے شروع ہوتی ہے اور یہ موضوع ہے انسان کو جہالت اور شرک کے اندھیروں سے علم و توحید کی طرف نکال لے جانا ۔ اس سورت کا اختتام تمام لوگوں کو جہالت و شرک کے نتائج سے ڈرانے، تعلیم توحید اور اولوا الباب کو متوجہ کرنے پر ہوتا ہے ۔

اس ابتداء اور انتہاء سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہم چاہتے ہیں وہ اسی قرآن میں موجود ہے ۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :فیہ ربیع القلب و ینابیع العلم

دلوں کی بہار اور علوم و دانش کے سوتے اسی قرآن سے پھوٹتے ہیں (۱)

اسی طرح تمام فکری ، اخلاقی اجتماعی اور سیاسی بیماریوں کا علاج اسی قرآن میں تلاش کرنا چاہئے ۔ بقول امیر المومنین :فاستشفوہ من ادوائکم

اسی قرآن سے اپنی بیماریوں کی دوا حاصل کرو ۔ (۲)

یہ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ آج کے مسلمان جو سمجھتے ہیں کہ قرآن صرف ایک ایسی مقدس کتاب ہے جو پڑھنے اور ثواب حاصل کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے اس کے برعکس یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انسانوں کی ساری زندگی کے دستور العمل کے طور پر نازل ہوئی ہے ۔ یہ آگہی عطا کرنے والی اور بیدار کرنے والی کتاب ہے ۔

خلاصہ یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جو عالم اور دانشور کو متوجہ کرتی ہے اور عامۃ الناس اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں ۔ چاہیے کہ یہ کتاب مسلمانوں کی زندگی میں جگہ پائے اور ان کی زندگی کا آئین بن جائے ۔ نیز ضروری ہے کہ یہ کتاب ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر عمل کرنے کے لئے تحقیق ، مطالعہ اور غور و خوض کا موضوع بنی رہے ۔ مسلمانوں کے زوال اور پس ماندگی کا موثر عامل اور سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس عظیم آسمانی کتاب کو فراموش کردیا اور مشرق و مغرب کے انحرافی مکاتب فکر کی رخ کر لیا ہے ۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیا عمدہ فرمایا ہے :

﴿واعلموا انہ لیس علی احد بعد القرآن من فاقۃ ولا لاحد قبل القرآن من غنی﴾ ۔

یقین جانیے کہ آپ میں سے کوئی شخص بھی حامل قرآن ہو جائے تو اسے ذرہ بھر فقر و احتیاج نہیں رہے گی اور حامل قرآن ہونے سے پہلے بے نیازی اور تونگری ممکن نہیں ۔ (۳)

کس قدر دردناک ہے ۔ قرآن سے ہماری بیگانگی اور بے گانوں کی قرآن سے آشنائی ۔

کس قدر تکلیف دہ ہے ۔ کہ بہترین وسیلہ سعادت ہمارے گھر میں موجود ہے اور ہم اس سعادت کے لئے دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ۔

کس قدر اندوہناک ہے ۔ کہ آب حیات کا چشمہ ہمارے پاس ہو اور ہم تشنہ کام جان دے دیں یا تپتے ہوئے بے آب بیابانوں میں سیراب کے پیچھے بھاگتے رہیں ۔

خداوندا ! ہمیں وہ عقل و ایمان عطا فرما جس کے ذریعے ہم سعادت کا یہ عظیم وسیلہ کھو نہ بیٹھیں جو تیری راہ کے شہداء نے ہم تک پہنچایا ہے ۔

اور ہمیں وہ شعور مرحمت فرما کہ ہم جان لیں کہ ہماری گمشدہ متاعیں اسی عظیم کتاب میں ہیں ۔

تاکہ ہم کبھی اس کے سامنے اور کبھی اس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے پھریں ۔

---

۱ ۔ نہج البلاغہ

۲ ۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶

۳ ۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶ ۔

۳۔ اول و آخر۔ توحید

زیر نظر آیات کا ایک پہلو توحید پر تاکید ہے۔ یہاں آخری ذکر بھی توحید کا ہے اور اسی کی طرف اولوا الباب کو متوجہ کیا گیا ہے۔

جی ہاں۔ توحید اسلام کی عمیق بنیاد ہے۔ عقیدہ توحید اسلام کا وہ شجر ہے جس کی جڑیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلامی تعلیم و تربیت کے سب راستے اسی پر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ اسلام کی ابتداء بھی توحید ہے اور انتہاء بھی توحید۔ اسلام کا تانا بانا توحید ہی سے بنا گیا ہے۔ توحید کا تعلق فقط معبود اور اللہ کے عقیدہ ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہر نظریے، عقیدہ اور پروگرام کا ہدف بھی توحید ہی ہے۔ ہر ایک کی بنیاد توحید پر ہے۔

آج مسلمانوں کی عظیم ابتلا کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے توحید کو عملی طور پر اسلام سے حذف کر دیا ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عرب ممالک کہ جہاں اسلام پروان چڑھا۔ آج شرک آلود نعروں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ آج وہ نسل پرستی، عرب تفاخر، احیاء عربیت اور عظمت عرب کے بھنور میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں سے بھی ہر کسی نے اپنے لئے اسی قسم کا کوئی بت تراش لیا ہے۔ انہوں نے اسلامی توحید کو اپنے سے بالکل الگ کر دیا ہے کہ جس نے کسی وقت مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ سب ممالک اپنے آپ میں ڈوب کر خود اپنے آپ سے بے گانہ ہو گئے ہیں۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کی آپس میں جنگ خون کے پیاسے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ بات کتنی شرمناک ہے کہ ہم سنیں کہ عرب ممالک کی باہمی جنگوں میں مرنے والوں کی تعداد اسرائیلی یہودیوں کے مقابلے میں مرنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت جب کہ ان کا ایک مشترک خطرناک دشمن ہے تو ان کے انتشار کا یہ عالم ہے اگر ایسا دشمن نہ ہوتا تو ان کی کیا حالت ہوتی۔

اس وقت جبکہ ہم تفسیر کا یہ حصہ لکھ رہے ہیں حکومت عراق نے بڑی بے رحمی سے اسلامی جمہوریہ ایران پر حملہ کر دیا ہے اور بہانہ بھی اس کے پاس سرحد کا معمولی سا تنازعہ ہے جو یقینا مذاکرات سے حل ہو سکتا تھا۔ یہ وہی حکومت عراق ہے کہ جس نے اسرائیلی سپاہیوں پر آج تک ایک بھی گولی نہیں چلائی۔ آج اس نے اس سفاکی سے حملہ کیا ہے کہ

جیسے دو قوموں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو ۔ جیسے یہ نہ آپس میں ہمسایہ ہیں ، نہ ان میں تہذیب و ثقافت کا کوئی رشتہ ہے اور نہ گہرا دینی تعلق ہے ۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ مشترک دشمن یہودی خوش ہو کر کہتا ہے :

اس سے بہتر منصوبہ کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ عراق ایران پر حملہ کر دے اور دونوں میں شدید تباہ کن طولانی جنگ شروع ہو جائے اور ہمیں ایک مدت کے لئے آسودگی مل جائے ۔

یہ وہ مقام ہے کہ ایک موحد، متعہد اور صاحب ایمان مسلمان پر لازم ہے کہ ان طاغوتوں کا شر ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو ایسے شرک آلود، نفاق ڈالنے والوں ، تباہیاں پھیلانے والوں اور دشمن کو خوش کرنے والوں کو قعر جہنم میں پہنچائے ۔

ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر

حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

یہ وہ صورت ہے جو قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے اگرچہ ان کے حالات زندگی صرف اسی صورت میں نہیں ہیں بلکہ مختلف مناسبتوں سے دیگر صورتوں میں بھی خدا کے اس عظیم پیغمبر کا ذکر موجود ہے ۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ مکتب توحید کے اس ہیرو کی پر افتخار زندگی کے مختصر حالات زندگی اس سورہ کے آخر میں پیش کر دیں تاکہ اس سلسلہ میں آنے والی مختلف آیات کی تفسیر میں قارئین محترم کے لئے مددگار ثابت ہو سکیں کیونکہ ان میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کی ضرورت پیش آئے گی ۔

زندگی کے تین دور

حضرت ابراہیم کی زندگی کو واضح طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ قبل بعثت کا دور

۲ ۔ دور نبوت اور بابل کے بت پرستوں سے مقابلہ ۔

۳ ۔ بابل سے ہجرت اور مصر، فلسطین اور مکہ میں مساعی کا دور ۔

بت شکن پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر

بچپن

حضرت ابراہیم بابل میں پیدا ہوئے ۔ یہ دنیا کا حیرت انگیز اور عمدہ خطہ تھا ۔ اس پر ایک ظالم و جابر اور طاقتور حکومت مسلط تھی [۱]

حضرت ابراہیم نے آنکھ کھولی تو بابل پر نمرود جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا ۔ وہ اپنے آپ کو بابل کا بڑا خدا سمجھتا تھا ۔

البتہ بابل کے لوگوں کے لئے یہی ایک بت نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مختلف مواد کے بنے ہوئے مختلف شکلوں کے کئی ایک بت تھے ۔ وہ ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کرتے تھے ۔

حکومت وقت سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنانے اور انہیں افیون زدہ رکھنے کے لئے بت پرستی کو ایک موثر ذریعہ سمجھتی تھی لہذا وہ بت پرستی کی سخت حامی تھی ۔ وہ کسی بت کی اہانت کو بہت بڑا نا قابل معافی جرم قرار دیتی تھی ۔

حضرت ابراہیم کی ولادت کے بارے میں مورخین نے عجیب و غریب داستان نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے : بابل کے نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو نمرود کی غیر متنازعہ طاقت سے مقابلہ کرے گا ۔ لہذا اس نے اپنی تمام قوتیں اس بات پر صرف کردیں کہ ایسا بچہ پیدا نہ ہو اس کی کوشش تھی کہ ایسا بچہ پیدا ہو بھی جائے تو اسے قتل کردیا جائے ۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور یہ بچہ آخر کار پیدا ہو گیا ۔

اس بچہ کی جاء ولادت کے قریب ہی ایک غار تھی ۔ اس کی ماں اس کی حفاظت کے لئے اسے اس میں لے گئی اور اس ک ی پرورش ہونے لگی ۔ یہاں تک کہ اس کی عمر کے تیرہ برس وہیں گزر گئے ۔

اب بچہ نمرود کے جاسوسوں سے بچ بچا کر نوجوانی میں قدم رکھ چکا تھا ۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس عالم تنہائی کو چھوڑ دیا جائے اور لوگوں تک وہ درس توحید پہنچائے جو اس نے باطنی الہام اور فکری مطالعہ سے حاصل کیا تھا ۔

ا ۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپ ملک بابل کے شہر آور میں پیدا ہوئے ۔

بت پرستوں سے مقابلہ

بابل کے لوگ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کے علاوہ سورج، چاند اور ستارے جیسے آسمانی موجودات کی پرستش کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے عزم صمیم کر لیا کہ واضح منطق اور استدلال کے ذریعہ ان کے خوابیدہ وجدان کو پیدا کیا جائے اور ان کی پاک فطرت کے چہرے سے غلط تعلیمات کے تاریک پردے ہٹا دئے جائیں تا کہ نور فطرت چمک اٹھے اور وہ توحید پرستی کے راستے پر گامزن ہو سکیں۔

انہوں نے مدتوں آسمان و زمین کی خلقت پر غور کیا تھا، ان پر حکمران قدرت کا مطالعہ کیا تھا اور آسمان و زمین کے شگفت انگیز اور تعجب خیز نظام کے بارے میں فکر کی تھی۔ نور یقین ان کے دل میں چمک رہا تھا (انعام۔ ۷۵)۔

منطق و استدلال کے سہارے

پہلے انہیں ستارہ پرستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ "زہرہ" ستارہ کہ جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق مغرب پر چمک اٹھتا ہے، یہ لوگ اس کی پرستش و تعظیم میں مشغول تھے۔

حضرت ابراہیم نے استفہام انکاری کے طور پر یا ان کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہم آہنگی کے اظہار کے طور پر پہلے کہا: یہ میرا خدا ہے۔

لیکن جس وقت وہ غروب ہو گیا تو کہا: مجھے غروب ہونے والے اچھے نہیں لگتے۔

جس وقت چاند افق کا سینہ چاک کر کے ابھرا اور چاند کی پرستش کرنے والوں نے مراسم عبادت شروع کیے تو ان کے ساتھ ہم صدا ہو کر کہنے لگے: یہ میرا خدا ہے۔

اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرا پروردگار میری راہنمائی کرے تو میں تو گمراہوں میں سے ہو جاوں۔

آفتاب نے شب تیرہ کا پردہ ہٹایا اور کوہ صحرا پر اپنی طلائی شعائیں چھڑکیں تو سورج پرست عبادت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: یہ میرا خدا ہے، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔

مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو گویا ہوئے: اے قوم! میں ان شریکوں سے بیزار ہوں کہ جو تم نے خدا کے لئے بنا رکھے ہیں۔ یہ تو سب غروب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو سب خوبصورت تغیر و تبدل کا شکار اور قوانین آفرینش کے اسیر ہیں۔ ان کے تو اپنے بس میں کوئی ارادہ و اختیار نہیں چہ جائیکہ یہ خود اس جہان کے خالق اور اسے گردش دینے والے ہوں۔ میں تو اپنا

رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس کے لئے میں اپنے ایمان میں خالص اور ثابت قدم ہوں اور میں ہر گز مشرکین میں شامل نہیں ہوں گا (انعام ۔ ۷۵ تا ۷۹) ۔

ابراہیم نے بت پرستوں سے مقابلہ نہایت خوبصورتی سے جیت لیا ۔ کچھ لوگ بیدار ہو گئے اور باقی کم از کم اپنے عقاید کے بارے میں شک و شبہ میں پڑ گئے ۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ علاقہ میں یہ بات دھوم گئی ۔ ہر کوئی سوچتا کہ یہ جوان کون ہے ، اس کی باتیں کتنی منطقی ہیں ، اس کا پیغام کتنا دل نشین ہے ، اس کی آواز تو لوگوں کے دلوں میں اترتی جاتی ہے ۔

آزر سے گفتگو

ایک اور مرحلہ آیا ۔ ابراہیم کی اپنے چچا آزر سے بحث ہونے لگی ۔ کبھی بہت مضبوط انداز سے ، محبت کے سلیقے سے اور کبھی تنبیہ و سرزنش کے لہجے میں ، آپ نے اسے بت پرستی کے بارے میں خبردار کیا اور اس سے کہا : تو ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتا ہے جو نہ سن سکتی ہے ، نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کر سکتی ہے ؟

آپ (علیہ السلام) نے چچا سے کہا : اگر تو میری پیروی کرے تو میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں ۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تو شیطان کی پیروی کرتا ہے تو کہیں تجھے عذاب الہی دامن گیر نہ ہو جائے ۔

یہاں تک کہ ان کا چچا ان نصیحتوں کے جواب میں انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دیتا ۔ آپ (علیہ السلام) " سلام علیک " کہتے ہوئے اسے جواب دیتے ہیں : میں تمہارے لئے استغفار کروں گا ۔

اس طرح آپ کوشش کرتے کہ اس سنگ دل کے دل میں کوئی گنجائش نکل آئے ۔ (مریم ۔ ۴۷)

دور نبوت

حضرت ابراہیم کب مبعوث نبوت ہوئے ، اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے ۔ البتہ سورہ مریم سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے اپنے چچا آزر سے بحث چھڑی تو آپ مقام نبوت پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ سورہ کہتی ہے :

﴿و اذکر فی الکتاب ابراهیم انه کا صدیقاً نبیاً اذ قال لابیه یا ابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئاً﴾ ۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ بت پرستوں کے ساتھ شدید معرکہ آرائی اور آپ کو آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے ۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے وقت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی عمر ۱۶ ۔ سال تھی ۔ ہم اس کے ساتھ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ عظیم کار رسالت آغاز نوجوانی ہی میں آپ کے دوش پر آن پڑا تھا ۔

عملی مقابلے کا آغاز

بہر حال بت پرستوں کے ساتھ حضرت ابراہیم کی معرکہ آرائی روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ ایک روز موقعہ پا کر آپ نے بابل کے بت خانے کے بڑے بت کے علاوہ تمام بت توڑ دئے ۔ یہاں سے زبانی محاذ آرائی عملی مقابلے کی شکل اختیار کر گئی ۔

سلطان جابر کے سامنے

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی مخالفت اور محاذ آرائی کا ماجرا آخر کار نمرود کے کان تک پہنچ گیا ۔ آپ (علیہ السلام) کو دربار میں حاضر کیا گیا تا کہ وہ بزعم خویش پند و نصیحت کے ذریعے، یا ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے یا پھر دھمکی سے کام لے کر انہیں خاموش کر دے ۔

نمرود بہت چالاک تھا ۔ اس نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے پوچھا : اگر تو ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا تو پھر تیرا پروردگار کون ہے ؟

آپ نے کہا : وہی جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے ۔

وہ چلا کر کہنے لگا : اے بے خبر! یہ تو میرے ہاتھ میں ہے ۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ جس مجرم کو قتل کی سزا ملی ہو میں اسے آزاد کر دیتا ہوں اور ایسے قیدی کو جسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ، میں چاہوں تو اسے قتل کر دیتا ہوں ۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دندان شکن جواب میں بہت مشہور تھے ۔ نبوت کی طاقت سے مدد لیتے ہوئے آپ نے اس سے کہا : خدا کے ہاتھ میں صرف موت و حیا ہی نہیں بلکہ تمام عالم ہستی اس کے تابع فرمان ہے ۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ ہر صبح سورج اس کے حکم سے افق مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور وقت شام اس کے حکم سے مغرب میں ڈوب جاتا ہے ۔ اگر تو عالم ہستی کی اس وسعت کا فرماں روا ہے تو کل معاملہ اس کے برعکس کر دے تو کہ سورج مغرب سے نکلے اور مشرق میں ڈوب جائے ۔ نمرود مبہوت ہو گیا ۔ ایسا چکرایا کہ اس کی زبان میں جواب کی سکت نہ رہی (بقرہ ۔ ۲۵۸)

اس میں شک نہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) خوب جانتے تھے کہ موت و حیات پر قدرت کے بارے میں نمرود کا دعویٰ بس چکر بازی اور تیز طراری ہے لیکن استدلال پر آپ کی مہارت اجازت نہ دیتی تھی کہ اس موضوع پر بات کرتے رہیں کہ جسے مکار دشمن نے دیتاویز بنا لیا ہے لہذا اسے چھوڑ کر فوراً ایسے موضوع پر بات شروع کی کہ جس پر وہ ہاتھ پاؤں مارنے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی ھجرت

آخر کار نمرود کی ظالم حکومت کی مشیزی کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ جوان آہستہ آہستہ حکومت کے لئے خطرے کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اس کی زبان گویا، فکر توانا اور منطق رسا کہیں پسے ہوئے محروم عوام کی بیداری اور آگاہی کا باعث نہ بن جائے کہیں لوگ استعمار کی زنجیر توڑ کر ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں لہذا حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ بت پرستوں کے جاہلانہ تعصب کا سہارا لے کر ابراہیم کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ انہیں ایک خاص انداز اور حالات پیدا کر کے لوگوں کے سامنے آگ کے دریا میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ سورہ انبیا میں اس واقعہ کی تفصیل آئیں گی۔ یہ آگ در حقیقت لوگوں کی جہالت اور حکمران نظام کے ظلم کے ایندھن سے جلائی گئی تھی۔ حکومت اس طرح اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے آسودہ فکر کرنا چاہتی تھی۔

لیکن جب آگ حکم خدا سے خاموش ہو گئی اور ابراہیم اس سے صحیح و سالم نکل آئے تو نمرود کے نظام حکومت میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اب ابراہیم ایک اور حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ ایک عام تفرقہ پرواز انسان نہ تھے کہ جسے وہ قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو ایک خدائی رہبر تھے وہ ایک ایسے بہادر ہیرو تھے جو تن تنہا خالی ہاتھ طاقتور ظالم حکمرانوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ لہذا عوام کا خون چوسنے والے نمرود اس کے درباریوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پوری قوت سے ابراہیم کا مقابلہ کریں گے اور جب تک انہیں ختم نہ کر لیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

دوسری طرف ابراہیم یہاں اپنا کردار ادا کر چکے تھے۔ آمادہ دل لوگ ان پر ایمان لا چکے تھے۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ مؤمنین اور اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر بابل سے نکل جائیں اور اپنی دعوت حق کو دور دور تک پھیلانے کے لئے شام، فلسطین اور فرعون کی سرزمین مصر کی طرف روانہ ہوں۔ آپ نے ان علاقوں میں حقیقت توحید کی تبلیغ کی اور بہت سے لوگ خدائے واحد پر ایمان لائے۔

رسالت کا آخری مرحلہ

حضرت ابراہیم نے تمام عمر ہر طرح کی بت پرستی خصوصاً انسان پرستی کے خلاف جہاد کرتے گزاری ۔ آپ نے آمادہ دلوں کو نور توحید سے روشن کیا ۔ آپ نے انسانی جسموں میں نئی روح پھونک دی اور بہت سے لوگوں کو خود غرضوں اور خود سروں کی قید سے رہائی دلائی ۔ اب ضروری تھا کہ آپ بندگی خدا کے آخری مرحلے میں قدم رکھیں اور اپنی متاع حیات کو طبق اخلاص میں رکھ کر بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیں تاکہ خدا کی عظیم آزمائشوں سے گزر کر ایک عظیم روحانی انقلاب کے ذریعے انسانوں کی امامت کے مرحلے میں داخل ہوں ۔

اس کے ساتھ ساتھ اب انہیں خانہ توحید یعنی خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بھی بلند کرنا تھا اور اسی خدا پرستی کے ایک بے نظیر مرکز میں تبدیل کرنا تھا اور تمام آمادہ دل مؤمنین کو اس عظیم مرکز توحید کے پاس ایک عظیم کانفرنس کی دعوت دینا تھا ۔

آپ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو اپنی بیوی بنا لیا تھا ۔ اس سے انہیں اسمٰعیل جیسا بیٹا نصیب ہوا ۔ آپ کی پہلی بیوی سارہ نے ان سے حسد کیا ۔ یہی حسد سبب بنا کہ آپ ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچہ کو حکم خدا سے فلسطین سے لے کر مکہ کی جلتی ہوئی سنگلاخ پہاڑوں کی سرزمین میں لے گئے ۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پانی کی ایک بوند بھی دستیاب نہ تھی آپ حکم خدا سے ایک عظیم امتحان سے گزرتے ہوئے انہیں وہاں چھوڑ کر واپس فلسطین آ گئے ۔

وہاں چشمہ زمزم پیدا ہوا ۔ اس اثناء میں جرہم قبیلہ ادھر سے گزرا ۔ اس نے جناب ہاجرہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی ۔ گویا واقعات کا ایک طولانی سلسلہ ہے کہ جو اس علاقہ کی آبادی کا باعث بنا ۔

حضرت ابراہیم نے خدا سے دعا کی تھی کہ اس جگہ کو آباد اور پر برکت شہر بنا دے اور لوگوں کے دل میری اولاد کی طرف مائل کر دے ۔ ان کی اولاد وہاں پھلنے پھولنے لگی تھی ۔ (۱)

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض مورخین نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم ہاجرہ اور شیر خوار اسمٰعیل کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانا چاہتے تھے تو جناب ہاجرہ نے فریاد کی : اے ابراہیم آپ کو کس نے حکم دیا ہے کہ ہمیں ایسی جگہ پر چھوڑ جائیں کہ جہاں نہ کوئی سبزہ ہے ، نہ دودھ دینے والا کوئی جانور ، یہاں تک کہ جہاں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں ہے ۔ آپ پھر بھی ہمیں بغیر زاد و توشہ اور مونس و مددگار کے چھوڑے جا رہے ہیں ۔

حضرت ابراہیم نے مختصر سا جواب دیا : میرے پروردگار نے مجھے یہی حکم دیا ہے ۔

ہاجرہ نے یہ سنا تو کہنے لگی : اگر ایسا ہے تو پھر خدا ہرگز ہمیں یوں ہی نہیں چھوڑے گا ۔ (۲)

حضرت ابراہیم بارہا فلسطین سے اسماعیل کو ملنے کے لئے مکہ آئے ۔ ایک سفر کے موقعہ پر آپ مراسم حج بجا لائے اور حکم خدا سے اپنے آبرو مند اور نہایت پاکیزہ صاحب ایمان نوجوان بیٹے اسماعیل کو لے کر قربان گاہ میں آئے ۔ اسمعیل آپ کی زندگی کا بہترین ثمر تھے ۔ آپ بالکل تیار تھے کہ انہیں راہ خدا میں قربان کر دیں ۔

اس اہم ترین آزمائش سے جب آپ نہایت عالی طریقہ سے عہدہ برآ ہو چکے اور آخری مرحلے تک اپنی آمادگی کا مظاہرہ کر چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانی کو قبول کر لیا اور اسمعیل کو بچا لیا اور قربانی کے لئے ایک دنبہ کو بھیج دیا ۔ (۳)

حضرت ابراہیم ان سب امتحانات سے کامیابی سے گزر چکے اور آزمائشوں کی اس کٹھالی سے کامیاب نکل آئے تو آپ کو ایک ایسا مقام حاصل ہوا جو وہ بلند ترین مقام ہے جو ایک انسان ترقی کر کے حاصل کر سکتا ہے ۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

اللہ نے کچھ کلمات کے ذریعے ابراہیم کا امتحان لیا ۔ وہ ان سب سے کامیاب گزرے تو اس پر اللہ نے ان سے کہا : میں تجھے لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں ۔ (ابراہیم اس خوش خبری پر وجد میں آئیں گے) کہنے لگے : یہ مقام میرے کچھ اولاد کو بھی عطا کر دے ۔ (ان کی دعا قبول ہو گئی لیکن ایک شرط کے ساتھ) اللہ نے کہا : یہ مقام ہر گز کسی ایسے شخص کو نصیب نہ ہو گا جس سے ظلم و ستم اور انحراف سرزد ہوا ہو ۔ (۴)

---

۱ ۔ کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۱۰۳

۲ ۔ سورہ صٰفٰت ۱۰۴ تا ۱۰۷

۳ ۔ بقرہ ۔ ۱۲۴

۴ ۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ۔ ص ۷۴ ۔

قرآن اور ابراہیم کا مقام بلند

آیات قرآن مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا ۔ ایسا بلند مقام اللہ تعالیٰ نے کسی اور گزشتہ نبی کو عطا نہیں فرمایا تھا ۔

اس پیغمبر خدا کی عظمت ان تعبیرات سے واضح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے :

۱ ۔ خدا نے ابراہیم کی ایک " امت " قرار دیا ہے اور ان کی شخصیت کو ایک امت کی مانند گردانا ہے (نحل ۔ ۱۲۰)

۔

۲ ۔ اللہ نے آپ کو خلیل اللہ کا مرتبہ عطا فرمایا ہے :

﴿واتخذ اللهابراهيم خليلا﴾ (نساء ۔ ۱۲۵) ۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے :

یہ مقام انہیں اس بناء پر حاصل ہوا کہ ابراہیم نے خود کبھی کسی چیز کے لئے کسی کے سامنے دست دراز بلند نہ کیا اور کبھی کسی سائل کو محروم نہیں لوٹایا ۔ (۱)

۳ ۔ قرآن کے مطابق وہ نیک ۱ صالح ۲ قانتین میں سے ، ۳ صدیقین میں سے ،

۴ صابرین میں سے

۵ اور ایفائے عہد کرنے والوں میں سے تھے ۔ (۲)

۱ ۔ ص ۴۷

۲ ۔ نحل ۔ ۱۲۲

۳ ۔ نحل ۱۲۰

۴ ۔ مریم ۔ ۴۱

۵ ۔ توبہ ۱۱۴

۶ ۔ نجم ۔ ۳۷

۷ ۔ ذاریات ۲۴ تا ۲۷

یہاں تک کہ بعض روایات میں انہیں ابو اضیاف (مہمانوں کا باپ یا مہمانوں کا ساتھی) کا لقب دیا گیا ہے ۔ (۳)

۸۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۷۴

جب ہٹ دھرم قوم آپ کو آگ کے سمندر میں پھینک رہی تھی ۔ فرشتوں نے خواہش کی تھی کہ ہم آپ کو بچا لیں ۔ ابراہیم نے ان کے اس تقاضے کو قبول نہ کیا ۔ تاریخ میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے ۔ آپ (علیہ السلام) نے کہا : میں سرتا نیاز و احتیاج ہوں لیکن مخلوق سے نہیں صرف خالق سے ، [۴]

۶۔ شجاعت و بہادری میں بے مثال تھے ۔

بت پرستوں کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنہا کھڑے ہو گئے ، ان کا دل لمحہ بھر کے لئے ان سے وحشت زدہ نہ ہوا ۔ آپ نے ان کے بتوں کا مذاق اڑایا اور ان کے بت کدے کو ڈھا کر پتھروں کا ڈھیر بنا دیا نیز نمرود اور اس کے جلادوں کے بڑی جرأت سے بات کی جو قرآنی آیات میں موجود ہے ۔

۷۔ ابراہیم بڑی منطق سے بات کرتے تھے ۔

آپ نے گمراہوں کو بہت مختصر ، محکم ، دندان شکن استدلال سے جواب دئے اور اپنے مطقی استدلال سے مخالفین کو رسوا کر دیا ۔

آپ کبھی سختی و خشونت سے پیش نہیں آتے تھے بلکہ بڑے اطمینان سے بات کرتے ۔ آپ کا یہ انداز آپ کی عظیم روحانی قوت کا ترجمان تھا ۔ آپ نے گفتار و کردار سے مخالفین کو شکست دی ۔ نمرود کے سامنے آپ کی بات چیت اور اپنے چچا آزر سے آپ کی گفتگو بابل کے قاضیوں سے مناظرہ بڑی وضاحت سے مرقوم ہے ۔ بابل کے قاضی آپ کو خدا پرستی اور بت شکنی کے جرم میں سزا دینا چاہتے تھے آپ نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے مدلل جواب دئے ۔ اس سلسلے میں سورہ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات کو غور سے پڑھنا چاہیے :

قاضیوں نے آپ سے پوچھا : کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے سر پر یہ مصیبت ڈھائی ہے اور ان سب چھوٹے بڑے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے ۔﴿قالو ا أأنت فعلت هٰذا بالٰهتنا یاابراهیم﴾

(کہنے لگے : اے براہیم کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے)؟ ۔

آپ نے انہیں ایسا جواب دیا کہ ان کے لئے بچ نہ نکلنے کی کوئی راہ نہ رہی ۔ قرآن کے الفاظ میں :

﴿قال بل فعله کبیرهم هٰذا فاسئلوهم ان کانوا ینطقون﴾

بولے :ہوسکتا ہے کہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہو اگر یہ بات کرسکتے ہیں تو انہیں سے پوچھو ۔

اس ایک ہی جملہ سے آپ نے اپنے دشمنوں کے لئے تمام راستے بند کردئے ۔ اب اگر وہ کہیں کہ بت گونگے ہیں ، لب پستہ ہیں اور بات کرنے کی سکت نہیں رکھتے ، تو ان کے گونگے اور بے عزت خداؤں کی کتنی رسوائی ہے اور اگر کہیں کہ یہ بات کر سکتے ہیں تو پھر ان کے پوچھنا پڑتا اور انہیں جواب دینا پڑتا ۔

اس پر ان کا کوابیدہ وجدان جاگ اٹھا ۔ ان کے اندر آواز آئی : تم ظالم اور خود پرست ہو ، نہ اپنے اوپر رحم کرتے ہو اور نہ اپنے معاشر پر ۔

قرآن الفاظ میں :﴿فارجعوا الیٰ انفسهم فقالوا انهم انتم الظالمون﴾

بہرحال جواب تو انہیں دینا ہی تھا ۔﴿ثم نکثو ا علی رؤسهم لقد علمت ما هوؤلاءِ ینطقون﴾

بڑی بے دلی سے سر شکستہ ہو کر کہنے لگے : تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے ۔

یہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بات ان کے سر پر بجلی بن کر گری ۔

آپ نے پکار کر کہا :﴿اف لکم و لما تعبدون من دون الله افلا تعقلون﴾

حیف ہے تم پر اور ان پر کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو ۔ کیا گیا ہے تمہاری عقلوں کو؟ ۔

آخر کار جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ابراہیم (علیہ السلام) قوی منطق کے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتے تو انہوں پھر تمام جھوٹے سرکشوں کی طرح طاقت کا سہارا لیا اور کہنے لگے : تمہیں چاہئیے کہ انہیں جلادو:

اس کام کے لئے انہوں بت پرستوں کے جاہلانہ تعصبات سے مدد لی اور پکار کر کہا : اگر تم میں طاقت ہے تو اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کے لئے تیار ہو جاؤ۔

”﴿قالوا حرقوه و انصروا الهتکم ان کنتم فاعلین﴾“ ۱۷

یہ ابراہیم (علیہ السلام) کی رسا ، استدلالی اور قاطع منطق کا ایک نمونہ تھا ۔

۸۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ایک اعزازیہ شمار کرتا ہے کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں (۵)

اور قرآن کہتا ہے کہ ان ہی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے ۔ (۶)

یہاں تک کہ مسلمانوں کو شوق دلانے کے لئے ان کے چند کے احکام پر عمل درآمد کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں ابراہیم اور ان کے انصار کی اقتدا کرنا چاہئیے ۔ (۷)

۹۔ اس عظمت و شکوہ سے مراسم حج کی بنیاد حکم الٰہی سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے رکھی ۔یہی وجہ ہے کہ تمام مراسم حج میں ابراہیم کا نام ، ان کے کی یاد اور ان کا ذکر موجود ہے ۔ (۸)

۱۰۔ ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت اس قدر بلند ہے کہ ہر گروہ کی کوشش تھی کہ انہیں اپنے میں سے قرار دیں ۔ یہودی اور عیسائی ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ اپنے تعلق پر بہت زور دیتے تھے یہاں تک کہ قرآن ان کے جواب میں یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ وہ ایک مسلمان اور سچے موحد تھے یعنی وہ ہر امر میں حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم تھے ، اس کے علاوہ انہیں کوئی سوچ نہ تھی اور بس اسی کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے ۔ (۹)

۱۔ ابراہیم بہت مہمان نواز تھے ۔ ۱۳

۲ ۔ ان کا توکل بے مثال تھا یہاں تک کہ کسی کام اور کسی مشکل میں خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہیں رکھتے تھے ۔ جو کچھ بھی مانگتے خدا ہی سے مانگتے اور اس کے علاوہ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے تھے ۱۵

۳۔ شعراء ۷۸ تا ۸۲

۴ ۔ کامل بن اثیر جلد ۱ ۔ ص ۹۹ ۔

۵۔ انبیاء ۶۳ ۔تا ۔ ۶۷۔

۶ ۔ ملۃ ابیکم ابراھیم حج ۷۸۔

۷۔ ملۃ ابیکم ابراھیم حج ۷۸۔

۸۔ ممتحنۃ ۔ ۴۔

۹ ۔ سورہ حج ۲۷۔

فہرست

سورہ یوسف ۴
آیات ۵۴،۵۵،۵۶،۵۷ .... ۴
یوسف علیہ السلام مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے ۴
چند اہم نکات ۷
۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے طاغوت وقت کی دعوت کیونکر قبول کی ؟ ۷
۲۔ اقتصادی مسائل اور انتظامی صلاحیت کی اہمیت : ۹
۳۔ مصارف کی نگرانی : ۱۰
۴۔ اپنی تعریف یا اپنا تعارف : ۱۱
۵۔ روحانی اجر بہتر ہے : ۱۲
۶۔قیدیوں کے حقوق کی حمایت : ۱۲
آیات ۵۸،۵۹،۶۰،۶۱،۶۲ .... ۱۴
یوسف علیہ السلام کی بھائیوں کو نئی تجویز ۱۴
چند اہم نکات ۱۸
۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں نے اپنا تعارف کیوں نہیں کروایا : ۱۸
۲۔غلہ کی قیمت کیوں واپس کردی : ۱۹
۳۔حضرت یوسف علیہ السلام نے بیت المال کا مال کیوں بلا معاوضہ دے دیا؟ : ۱۹
آیات ۶۳،۶۴،۶۵،۶۶ .... ۲۱
آخر کار باپ راضی ہو گئے ۲۱

چند اہم نکات ۲۴
۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کیسے راضی ہو گئے: ۲۴
۲۔ کیا صرف ایک قسم کافی تھی؟ ۲۵
آیات ۶۷،۶۸ .... ۲۶
تفسیر ۲۶
آیات ۷۶،۷۵،۷۴،۷۳،۷۲،۷۱،۷۰،۶۹ .... ۳۰
بھائی کو روکنے کی کوشش ۳۱
چند اہم نکات ۳۵
۱۔ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا؟ ۳۵
۲۔ بے گناہ پر چوری کا الزام؟: ۳۵
۳۔ چوری کی طرف سب کی نسبت کیوں دی گئی؟: ۳۶
۴۔ اس زمانے میں چوری کی سزا؟ ۳۷
۵۔ "سقایا" یا "صوامع": ۳۷
آیات ۷۹،۷۸،۷۷ .... ۳۹
برادران یوسف علیہ السلام کی فداکاری کیوں قبول نہیں ہوئی؟ ۳۹
آیات ۸۲،۸۱،۸۰، ۴۲
بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے ۴۲
چند اہم نکات ۴۵
۱۔ سب سے بڑا بھائی کون تھا؟ ۴۵
۲۔ موجود قرائن کی بنیاد پر فیصلہ: ۴۵

۳۔ برادران یوسف (علیہ السلام) میں فرق : ۴۵
آیات ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳ .... ۴۷
میں وہ الطاف الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے.......... ۴۷
آیات ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷ .... ۵۱
کوشش کرو اور مایوس نہ ہو ۵۲
چند اہم نکات.......... ۵۸
۱۔یوسف (علیہ السلام) کی قمیص کون لے کر گیا ؟.......... ۵۸
۲۔یوسف (علیہ السلام) کی عظمت : ۵۸
۳۔ کامیابی کا شکرانہ :.......... ۵۹
آیات ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴ .... ۶۱
آخرکار لطف الٰہی اپنا کام کرے گا ۶۱
چند اہم نکات.......... ۶۴
۱۔ یعقوب (علیہ السلام) نے پیراہن یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو کیسے محسوس کی ؟ ۶۴
۲۔ انبیاء کے حالات میں فرق:.......... ۶۵
۳۔ بینائی کیسے لوٹ آئی ؟.......... ۶۶
۴۔ استغفار کا وعدہ :.......... ۶۷
۵۔ توسل جائز ہے :.......... ۶۷
۶۔ سیاہ رات چھٹ گئی: ۶۷
آیات ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۶۹
تفسیر ۶۹

یوسف (علیہ السلام)، یعقوب (علیہ السلام) اور بھائیوں کی سر گزشت کا اختتام ۶۹
چند اہم نکات.. ۷۲
۱۔ کیا غیر خدا کے لئے سجدہ جائز ہے ؟.. ۷۲
۲۔ شیطانی وسوسے:.. ۷۳
۳۔ امن و امان خدا کی عظیم نعمت :.. ۷۳
۵۔ اختتام خیر:... ۷۵
۶۔ کیا یوسف (علیہ السلام) کی والدہ مصر آئی تھیں ؟................................ ۷۶
۷۔ باپ کو سر گزشت نہ سنانا: ۷۶
آیات ۱۰۷،۱۰۶،۱۰۵،۱۰۴،۱۰۳،۱۰۲ .... ۷۸
یہ دعویدار عام طور پر مشرک ہیں.. ۷۸
آیات ۱۱۱، ۱۱۰،۱۰۹،۱۰۸ .... ۸۳
عبرت کے زندہ درس ۸۵
سورہ یوسف (علیہ السلام)کا اختتام... ۹۰
سورہ رعد ۹۲
آسمان و زمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیاں ہیں ۹۲
آیات ۴،۳،۲،۱، ۱۰۱
چند اہم نکات.. ۱۰۲
۱۔ توحید اور قیامت میں تعلق:.. ۱۰۲
۲۔ قرآن کی سائنسی معجزات :... ۱۰۲
۳۔ سورج اور چاند کی تسخیر:.. ۱۰۳

آیات ۵،۶ .... ۱۰۵

قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب ۱۰۶

چند اہم نکات ۱۰۸

آیت ۷ .... ۱۱۰

پھر بہانہ سازی ۱۱۰

دو سوال اور ان کے جواب ۱۱۱

۱۔ کافروں کا جواب کیسے ہوا ؟ ۱۱۱

۲۔ ”لکل قوم ھاد“ سے کیا مراد ہے ؟ ۱۱۱

آیات ۸،۹،۱۰ .... ۱۱۴

خدا کا بے پایاں علم ۱۱۴

چند اہم نکات ۱۱۶

۱۔ قرآن اور جنین شناسی : ۱۱۶

۳۔ خدا کے لئے غیب و شہود برابر ہیں : ۱۱۸

۴۔ علم خدا کی طرف کے تربیتی آثار: ۱۱۹

آیت ۱۱ .... ۱۲۱

غیبی محافظ ۱۲۱

چند اہم نکات ۱۲۲

۱۔ ”معقبات“ کیا ہیں ؟ ۱۲۲

۲۔ تبدیلی ہمیشہ خود ہمارے ہاتھو سے آتی ہے : ۱۲۳

آیات ۱۲،۱۳،۱۴،۱۵ .... ۱۲۷

عظمت الٰہی کی کچھ نشانیاں ۱۲۷
رعد و برق کی برکتیں.. ۱۲۸
۱۔ آبیاری : ۱۲۹
۲۔ جراثم پر سم پاشی : ۱۲۹
۳۔ تغذیہ اور کھاد رسائی : ۱۲۹
چند اہم نکات.. ۱۳۵
۱۔ موجودات کے سجدہ کرنے سے کیا مرد ہے : ۱۳۵
۲۔ طوعاً و کرھاً سے کیا مراد : ۱۳۵
۳۔ "ظلال "کا مفہوم :"ظلال "جمع "ظل "کی، جو "سایہ " کے معنی میں ہے.. ۱۳۵
۴۔ "آصال "اور" غدو"کا مطلب : ۱۳۶
آیت ۱۶ .... ۱۳۷
بت پرستی کیوں ؟.. ۱۳۷
چند اہم نکات.. ۱۳۸
۱۔ خالقیت و ربوبیت معبودیت سے مربوط ہے : ۱۳۹
۲۔ خود ہی سوال اور خود ہی جواب : ۱۳۹
۳۔چشم بینا اور روشنی لازم و ملزوم ہیں : ۱۴۰
۴۔ کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے ؟ ۱۴۰
آیت ۱۷ .... ۱۴۲
حق و باطل کی منظر کشی ۱۴۲
چند اہم نکات.. ۱۴۴

۱ـ حق و باطل کی شناخت کے لئے علامتیں : ۱۴۴
۳ـ فائدہ ہمیشہ اہلیت کے اعتبار سے ہوتا ہے : ۱۴۵
۴ـ باطل سرگرداں ہے : ۱۴۶
۵ـ باطل صرف ایک لبادہ میں نہیں ہوتا : ۱۴۶
۶ـ ہر موجود کی بقا اس کے فائدے سے وابستہ ہے : ۱۴۶
۷ـ حق باطل کو کس طرح باہر نکال پھینکتا ہے : ۱۴۷
۸ـ باطل اپنی بقا میں حق کا مقروض ہے : ۱۴۷
۹ـ حق اور باطل میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے : ۱۴۷
۱۰ـ زندگی جہاد و جستجو کے سائے میں : ۱۴۸
قرآنی مثالیں ۱۵۰
۱ـ مثال مسائل کو حسّی بنا دیتی ہے : ۱۵۰
۲ـ مثال راستے کو مختصر کردیتی ہے : ۱۵۰
۳ـ مثال مسائل کو سب کے لئے یکساں بنا دیتی ہے : ۱۵۰
۴ـ مثال مسائل کو زیادہ قابل اطمینان بنا دیتی ہے : ۱۵۰
۵ـ مثال ہٹ دھرموں کو خاموش کردیتی ہے : ۱۵۱
آیت ۱۸ .... ۱۵۴
جنہوں نے دعوت ِحق کو قبول کر لیا ۱۵۴
ایک نکتہ ۱۵۷
آیات ۲۴،۲۳،۲۲،۲۱،۲۰،۱۹، ۱۵۹
اہل شعور کا طرز عمل جنت کے آٹھ دروازے ۱۵۹

چند اہم نکات ۱۶۹

۱۔ صرف "صبر" کا ذکر کیوں ہوا ہے؟ ۱۶۹

۲۔جنت کے دروازے: ۱۶۹

۳۔اہل جنت سے وابستگی رکھنے والے ان سے جاملیں گے: ۱۷۰

۴۔ گناہ کے آثار دھلنا: ۱۷۱

آیات ۲۵،۲۶ .... ۱۷۳

دنیا پرست تباہ کار ۱۷۳

چند اہم نکات ۱۷۵

۱۔ مفسد فی الارض "کون ہے؟ ۱۷۵

۲۔ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن: ۱۷۸

آیات ۲۷،۲۸،۲۹ .... ۱۸۱

یاد الٰہی باعثِ تسکین دل ہے ۱۸۱

چند اہم نکات ۱۸۳

۱۔ یاد الٰہی سے دل کو کیسے سکون ملتا ہے؟ ۱۸۳

پریشانی اور اضطراب کے عوامل ۱۸۴

۲۔ کیا خوفِ خدا اور اطمینان باہم مطابقت رکھتے ہیں؟ ۱۸۷

۳۔ "ذکر خدا" کیا ہے اور کس طرح ہے؟ ۱۸۷

آیات ۳۰،۳۱،۳۲ .... ۱۹۰

شان نزول ۱۹۰

ہٹ دھرم ہر گز ایمان نہیں لائیں گے ۱۹۲

چند اہم نکات ۱۹۴
۱۔ لفظ "رحمن" کیوں استعمال کیا گیا ہے ؟ ۱۹۴
۲۔ پیغمبر اکرم نے معجزات کا تقاضا کیوں پورا نہ کیا ۱۹۵
۳۔ "قارعة" کیا ہے ؟ ۱۹۶
آیات ۳۴،۳۳ .... ۱۹۷
کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟ ۱۹۷
آیت ۳۵ .... ۲۰۰
تفسیر ۲۰۰
آیت ۳۶ .... ۲۰۲
خدا پرست اور دیگر گروہ ۲۰۲
ایک اہم نکتہ ۲۰۴
آیات ۳۷،۳۸،۳۹،۴۰ .... ۲۰۵
قطعی اور قابلِ تغیر حوادث ۲۰۵
دو اہم نکات ۲۱۰
۱۔ لوح محو و اثبات اور ام الکتاب : ۲۱۰
آیات ۴۱،۴۲،۴۳ .... ۲۱۷
انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں ، خدا باقی رہتا ہے ۲۱۷
سورہ ابراھیم ۲۲۲
آیات ۱،۲،۳، ۲۲۲
تفسیر ۲۲۲

ظلمتوں سے نور کی طرف ۲۲۲
چند اہم نکات ۲۲۵
۱۔ ایمان اور راہِ خدا کو نور سے تشبیہ دینا ۲۲۵
۲۔ "لتخرج" کا مفہوم: ۲۲۶
۳۔ سورۃ کے آغاز و اختتام پر ایک نظر: ۲۲۶
آیات ۷،۶،۵،۴ .... ۲۲۷
تفسیر ۲۲۷
زندگی کے حساس دن ۲۲۷
چند اہم نکات ۲۳۳
۱۔ ایام اللہ کی یاد آوری ۲۳۳
۲۔ جابروں کے طور طریقے ۲۳۴
۳۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے: ۲۳۴
۴۔ شکر نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ ۲۳۵
شکر نعمت کے بارے میں چند اہم نکات ۲۳۹
آیات ۱۰،۹،۸ .... ۲۴۱
تفسیر ۲۴۱
کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟ ۲۴۱
آیات ۱۲،۱۱ .... ۲۴۷
صرف اللہ پر توکل کرو ۲۴۷
چند اہم نکات ۲۴۹

۱۔ مومنین اور متوکلین ۲۴۹
۲۔ انبیاء اور معجزات ۲۴۹
۳۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ ۲۴۹
آیات ۱۷،۱۶،۱۵،۱۴،۱۳ .... ۲۵۳
تفسیر ۲۵۳
منحرف جابروں کا طرز عمل اور ان کا انجام ۲۵۳
چند اہم نکات ۲۵۸
۱۔ مقامِ پروردگار سے کیا مراد ہے ؟ ۲۵۸
۲۔ ”استفتحوا“ کا مفہوم ۲۵۸
۳۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت ۲۵۹
آیت ۱۸ .... ۲۶۰
تیز آندھی اور خاکستر ۲۶۰
چند اہم نکات ۲۶۰
۱۔ بکھر جانے والی راکھ : ۲۶۰
۲۔ کافروں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں : ۲۶۱
۳۔ ایک طوفانی دن اور آندھی : ۲۶۱
۴۔ پتوں اور راکھ کے بکھر جانے میں فرق ہے : ۲۶۱
۵۔ تیز آندھی کے اثرات : ۲۶۱
۲۔ ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں ؟ ۲۶۲
۳۔ مسئلہ احباط ۲۶۳

۴۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لئے بھی جزاء ہے؟ ۲۶۴
آیات ۱۹،۲۰ .... ۲۷۰
تفسیر ۲۷۰
خلقت حق کی اساس پر ہے ۲۷۰
آیات ۲۱،۲۲،۲۳ .... ۲۷۳
تفسیر ۲۷۴
شیطان اور اس کے پیرو کاروں کی صریح گفتگو ۲۷۴
چند اہم نکات ۲۷۴
۱۔ ایک اشکال کی وضاحت: ۲۷۴
۲۔ "﴿لو ھدانا اللہ لھدیناکم﴾" کا مفہوم ۲۷۵
۳۔ اندھی تقلید کی مذمت ۲۷۶
۴۔ "برزو" اور محیص" کا مفہوم ۲۷۶
چند اہم نکات ۲۷۷
۱۰۔ شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب ۲۷۷
۲۔ روز حشر شیطان کا اپنے پیرو کاروں سے رابطہ ۲۷۸
۳۔ گمراہی کے دیگر پیشواون کا طرز عمل ۲۷۸
۴۔ "مصرخ" کا مطلب ۲۷۸
۵۔ شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد ۲۷۹
۶۔ "ان الظالمین لھم عذاب الیم" کس کا جملہ ہے: ۲۷۹
آیات ۲۴،۲۵،۲۶،۲۷ .... ۲۸۱

تفسیر ۲۸۱
”شجرہ طیبہ“اور”شجرہ خبیثہ“ ۲۸۱
چند اہم نکات........................ ۲۸۸
۱۔ کیا آخرت سے مراد قبر ہے ؟........................ ۲۸۸
۲۔ ثبات و استقامت کا اثر........................ ۲۸۸
۳۔ روایات اسلامی میں شجرہ طیبہ اور شجرہ خبیثہ ۲۸۹
آیات ۲۸،۲۹،۳۰........................ ۲۹۱
تفسیر ۲۹۱
کفرانِ نعمت کا انجام........................ ۲۹۱
چند اہم نکات........................ ۲۹۳
۱۔ نعمت کو کفر میں بدل دیا : ۲۹۳
۲۔ نعمت سے سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے : ۲۹۳
۳۔ ” انداد“ کا مفہوم : ۲۹۴
آیات ۳۱،۳۲،۳۳،۳۴ .... ۲۹۶
تفسیر ۲۹۶
قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت........................ ۲۹۶
چند اہم نکات........................ ۲۹۹
۱۔ خالق اور مخلوق سے رشتہ........................ ۲۹۹
۲۔انفاق، پنہان اور آشکار کیوں ؟ ۲۹۹
۳۔اس دن ”بیع “ اور خلال “ نہیں ہے ۳۰۰

۴۔ اے انسان ! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں ۳۰۲

۵۔ دائبین ۳۰۴

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے ؟ ۳۰۵

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں ۳۰۵

۸۔ افسوس کہ انسان "مظلوم" اور "کفار" ہے ۳۰۶

آیات ۳۵،۳۶،۳۷،۳۸،۳۹،۴۰،۴۱ .... ۳۰۷

تفسیر ۳۰۸

ابراہیم (علیہ السلام)بت شکن کی اصلاحی دعائیں ۳۰۸

چند اہم نکات ۳۱۱

۱۔ کیا مکہ اس وقت شہر تھا ؟ ۳۱۱

۲۔ مکہ سرزمین امن ۳۱۱

۳۔ ابراہیم (علیہ السلام) بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں ؟ ۳۱۳

۴۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے تابع کون ہیں ؟ ۳۱۳

۵۔ وادی ۔"غیر ذی زرع " اور خدا کا پر امن حرم ۳۱۵

۶۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں ۳۱۷

۷۔ کیا ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ کے لئے دعاء کررہے ہیں ؟ ۳۱۷

آیات ۴۲،۴۳،۴۴،۴۵ .... ۳۱۹

تفسیر ۳۱۹

جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی ۳۱۹

چند اہم نکات ۳۲۲

۱۔ پیغمبر اکرم سے خطاب کیوں ہے ؟ ۳۲۲
۲۔ "یوم یاتیھم العذاب" سے کون سا دن مراد ہے ؟ ۳۲۳
۳۔ مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا ؟ ۳۲۵
آیات ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶ .... ۳۲۶
تفسیر ۳۲۷
ظالموں کمزور سازشیں ۳۲۷
چند اہم نکات ۳۳۳
۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے : ۳۳۳
۲۔ سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام ۳۳۴
۳۔ اول و آخر۔ توحید ۳۳۶
ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر ۳۳۸
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ۳۳۸
زندگی کے تین دور ۳۳۸
بت شکن پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر ۳۳۸
بچپن ۳۳۸
بت پرستوں سے مقابلہ ۳۴۰
منطق و استدلال کے سہارے ۳۴۰
آزر سے گفتگو ۳۴۱
دور نبوت ۳۴۱
عملی مقابلے کا آغاز ۳۴۲

سلطان جابر کے سامنے ۳۴۲
حضرت ابراھیم علیہ السلام کی ھجرت ۳۴۳
رسالت کا آخری مرحلہ ۳۴۳
قرآن اور ابراہیم کا مقام بلند ۳۴۶
۶۔ شجاعت و بہادری میں بے مثال تھے ۔ ۳۴۷
۷۔ ابراہیم بڑی منطق سے بات کرتے تھے ۔ ۳۴۷